ماہنامہ

کرن

اگست 2020

Pakistanipoint
Learning Point

حمد، تنویر پھول 9
نعت، تنویر پھول 9

انٹرویو

یمان خان سے ملاقات، شاہین رشید 10
میری بھی سنیے، محمد علی جوش 15
مقابل ہے آئینہ، اقرا سرور 19

ناول

میرے ہم نفس، میرے ہم نوا، آسیہ مرزا 22
ہوائیں رخ بدل گئیں، نکہت عبداللہ 194

مکمل ناول

کنارِ خواب جو، فرح بخاری 74
باکوشے، منعم ملک 138

ناولٹ

پریت بدلے ریت، گل ارباب 44
کانچ سے سائیاں، مصباح علی سید 110
تیری راہ ہے میری منزل، مسکان احزم 212

افسانے

مٹی، عطیہ خالد 134
عہدِ رفتہ، شمائلہ دلعباد 69
چابی کی گڑیا، عمارہ جہاں 41
تیری دید میری عید، زارا ہنجرا 189
ڈگڈگی کا بندر، فہمیدہ فرید خان 208
اُف یہ موسم، عنبرین ابدال 105
زندگی کے رنگ، حوریہ بتول 232

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ——— 840/- روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ …… 7000/- روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. 8000/- روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

0317 2266944

کرن کتاب

فیشن اور اسٹائل ادارہ 4
پیارا گھر ادارہ 5
سماعت ادارہ 12
اس ماہ کا پھل ادارہ 7
معاشرتی اور نفسیاتی مسائل ادارہ 8
کچن اور آپ ساجدہ جاوید سندیلو 9
کرن کا دستر خوان خالدہ جیلانی 10

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو شعاع عمیر 237
یادوں کے دریچے سے بشریٰ محمود 240
موتی چنتے ہیں ادارہ 242
نامے میرے نام مدیرہ کرن 243

اگست 2020
جلد 42 شمارہ 5
قیمت 70 روپے

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W نارتھ ناظم آباد کراچی
Phone: 32721777, 32726617; 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مُدیرہ

آزادی

ایک شاعر نے خواب دیکھا...... آزادی کا خواب۔ برصغیر کے مسلمان کے لیے علیحدہ وطن کا خواب......اور اس خواب کو تعبیر چودہ اگست 1947ء کو ملی۔

پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ نظریہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں ہیں، جن کا مذہب، عقائد، رہن سہن اور ثقافت ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔

مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطہ زمین ہونا چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ جہاں نفرت اور تعصب کا راج نہ ہو۔ ایک طرف انگریزوں کی غلامی تھی۔ دوسری طرف ہندوؤں کا مسلمانوں سے نفرت اور تعصب۔ مسلمانوں پر نوکری کے دروازے تو بند تھے۔ انہیں کاروبار کرنے کی بھی آزادی نہ تھی۔ یہی حالات تھے جو پاکستان کے قیام کا سبب بنے۔

اس نظریہ کی صداقت کے گواہ آج بھارت کے حالات ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ ایک مسلمان کو صرف اس شبہ کی بنا پر شہید کر دیا جاتا ہے کہ اس نے گائے کی قربانی کی ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے اور قتل عام کروانے والے کو بھارت کا وزیراعظم منتخب کر لیا جاتا ہے۔

پاکستان پر اللہ کا خصوصی کرم تھا، یہاں ہر طرح کے وسائل کی فراوانی تھی۔ یہاں رہنے والے اور ہجرت کر کے یہاں آنے والے سب ہی ان نعمتوں سے فیض یاب ہوئے، لیکن افسوس کہ جس اتحاد کی بنا پر ہمیں آزادی کا تحفہ ملا تھا ہم اسی اتحاد کو قائم نہ رکھ سکے اور پاکستان دولخت ہو گیا۔

ہمیں آج اسی جذبہ، یقین اور اتحاد کی ضرورت ہے جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک۔

اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اس ماہ ہم نے کرن میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں، ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا کہ آپ کو یہ تبدیلیاں کیسی لگیں۔ آپ کے خطوط کے منتظر رہیں گے۔

محمود خاور کی برسی

محمود خاور کو ہم سے بچھڑے کتنے سال گزر گئے لیکن ان کی یادوں کے نقش آج تک دھندلائے نہیں۔ ان کی محبت، ان کی باتیں، ان کی یادیں آج بھی ہمارے دل میں زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

20 اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

☆ پروڈیوسر، رائٹر "جمان خان" سے شاہین رشید کی ملاقات۔
☆ اداکار "محمد علی جوش" کہتے ہیں "میری بھی سنیے۔"
☆ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول۔
☆ "کنار خواب جو" فرح بخاری کا مکمل ناول۔
☆ "کانچ سے سائبان" مصباح علی سید کا ناولٹ۔
☆ اس ماہ "اقرا سرور" کے "مقابل ہے آئینہ"
☆ نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول "ہوائیں رخ بدل گئیں"
☆ منعم ملک کا مکمل ناول "بالوشے"
☆ گل ارباب کا ناولٹ "پریت بدلے ریت"
☆ "تیری راہ ہے منزل میری" مسکان احزم کا ناولٹ۔

عطیہ خالد، شمائلہ دالعباد، عمارہ جہاں، عنبرین ابدال، زارا انجم، فہمید فریدہ خان، حوریہ بتول کے افسانے اور مستقل سلسلے۔ "کرن کتاب" معلوماتی، دلچسپ مضامین اور مزید ار ریسیپیز کے ساتھ۔

حمد باری تعالیٰ

خدا تعالیٰ کی معرفت ہے بالیقیں قرآن کا حاصل
کہا "لاتقنطو" یہ رحمتِ رحمٰن کا حاصل

بڑا فیاض ہے وہ، فیض پہنچاتا ہے بندوں کو
وجودِ رحمۃ للعالمینؐ فیضان کا حاصل

نہ وہ بیٹا کسی کا ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا ہے
احد ہے وہ، صمد ہے وہ، یہی ایمان کا حاصل

نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے، نہ اُس کا کوئی ثانی ہے
یقیناً سورۂ اخلاص ہے ایقان کا حاصل

رحیم اللہ، وہ رحمٰن، یہ آغازِ قرآں کا
یہی نکتہ ہے پیہم دل کے اطمینان کا حاصل

شبِ تارِ الست انسان! وہ تیرا "بلیٰ" کہنا
سمجھ عرفانِ خالق ہے اُسی پیمان کا حاصل

کہا باغِ سخن میں پھُول نے اس کو نہ بھولو تم
خداؑ کی حمد اور نعتِ نبیؐ دیوان کا حاصل

تنویر پھُول

نعت رسول مقبولؐ

انسان وہ بے مثال ہیں، اُن کی مثال کیا
پیشِ جمالِ شاہؐ، کسی کا جمال کیا

موسیٰؑ کی قوم اُن سے گریزاں رہی سدا
لائے کوئی نمونۂ اصحابؓ و آلؓ کیا

دونوں جہاں میں اپنا سہارا ہے ان کی ذات
والی ہوں جب حضورؐ تو بیکا ہو بال کیا

دل میں ہے کنزِ اُلفتِ سلطانِؐ انبیا!
حبِّ نبیؐ کے سامنے مال و منال کیا

اے زائرِ دیارِ نبیؐ! دل سے تُو بتا
رحم و کرم کی واں ہے نہیں برشگال کیا

آقاؐ! نظر کرم کی ہو، روضے پہ ہے غلام
اک اُمتی کا اس کے سوا ہو سوال کیا!

اُن کی ثنا میں خوب ہوئیں گُل فشانیاں
باغِ سخن میں پھُول ہوا ہے نہال کیا

تنویر پھُول

صوفیاء اکرام کی دستاویزی فلموں کے رائٹر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر......

جمان خان سے ملاقات

شاہین رشید

ایک وقت تھا جب دستاویزی فلموں کا بہت رواج تھا۔ اور ہمیں یاد ہے کہ سینما ہاؤسز میں بھی فلم شروع ہونے سے پہلے ایک پانچ سات منٹ کی دستاویزی فلم ضرور دکھائی جاتی تھی۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اب پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ کہنے کو تو چینلز کی بھرمار ہے مگر ہر چینل میں ایک جیسے ہی پروگرام ہوتے ہیں..... مگر جو لوگ کریئیٹو کام کرنے کے عادی ہیں وہ اپنا راستہ نکال ہی لیتے ہیں اور ”جمان خان“ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے اور یہ اپنی کاوشوں کے لیے یوٹیوب کا سہارا لیتے ہیں۔ جمان خان ”عروج ریکارڈ فلمز“ کے نام سے دستاویزی فلمیں بناتے ہیں اور یہ اپنی فلموں کے خود ہی ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور ریسرچر اور جرنلسٹ ہیں۔

❀ ”کیسے ہیں جمان خان (JAMAN KHAN) صاحب؟“

☆ ”اللہ کا شکر ہے۔“

❀ ”آپ کا نام ”جمان خان“ ہے مطلب کیا ہے اس کا؟“

☆ ”یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ”قیمتی موتی“ کے ہیں۔“

❀ ”ہوں..... اچھا..... کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

☆ ”میرا پیدائشی نام وسیم احمد ہے لیکن 2009ء میں ایک روحانی شخصیت نے میرا نام تبدیل کرتے ہوئے ”جمان خان“ رکھ دیا۔ چنانچہ میں اس نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ میری پروڈکشن اور ڈائریکشن بھی اسی نام سے ہے..... میں 26 دسمبر کو ملتان میں پیدا ہوا۔ میرا ستارہ کیپری کورن ہے اور ہم چار بہن بھائی ہیں دو بہنیں اور ہم دو بھائی۔ میرا نمبر پہلا ہے یعنی گھر کا بڑا ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی ”ندیم احمد خان“ ایک پرائیویٹ فرم میں سیلز منیجر کی جاب کر رہا ہے۔ میری تعلیم ماسٹرز ان ماس کمیونکیشن

ہے...... 2012ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے لندن چلا گیا۔ بھائی بھی وہیں پہ زیر تعلیم تھا۔ ہم دونوں بھائی چاہتے تو وہاں مستقل سکونت اختیار کر سکتے تھے۔ مگر والد صاحب جو کہ ملتان میں رہائش پذیر ہیں ان کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے ہم دونوں بھائیوں نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کرلیا اور میرے والد کے بارے میں تو آپ کو پتا ہی ہوگا۔“

✧ ”شادی کب ہوئی؟...... اپنے والد کے بارے میں آپ بتائیں قارئین کے لیے؟“

☆ ”2013ء میں میری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے میری چار سال کی بیٹی ہے جس کا نام ”ریپا خان“ ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ ہم مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے ہیں۔ والدین کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ماشاء اللہ سے ہمارا گھر کافی بڑا ہے۔ جہاں سب ہی بہت پیار و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرے والد کا نام عزیز احمد خان ہے اور وہ ایڈوکیٹ ہیں اور ریڈیو ملتان ایف ایم ۱۰۱ سے بھی وابستہ ہیں بہ حیثیت ”آر جے کے۔“

✧ ”آپ کی صحافت سے وابستگی کب سے ہے؟“

☆ ”صحافت سے وابستگی 2003ء سے ہے۔ میں ہفت روزہ عزیز نگر ملتان کا چیف ایڈیٹر ہوں...... یہ جنوبی پنجاب کا وہ معیاری جریدہ ہے جس کا رنگین لیگل ایڈیشن وکلاء کی سرگرمیوں انٹرویوز اور عدلیہ سے متعلق خبروں پر مشتمل ہوتا ہے جو ڈسٹرکٹ کورٹس، ہائی کورٹس اور عدالتوں میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ ایڈیشن انٹرنیٹ پہ بھی دستیاب ہے اور اس فیلڈ سے ملحقہ لوگوں میں کافی پاپولر ہے۔“

✧ ”دستاویزی فلموں سے وابستگی کب سے ہے اور اب تک کیا کیا کر چکے ہیں؟“

☆ ”دستاویزی فلموں سے وابستگی 2013ء سے ہے۔ ہم نے اپنی ریکارڈنگ کمپنی کا نام ”عروج ریکارڈز فلمز“ رکھا ہے۔ آپ کو یہ جان کر اچھا لگے گا کہ ہماری ”عروج ریکارڈز“ کمپنی کو خطے میں بننے والی دستاویزی فلموں کا اولین ادارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ کو بتایا کہ میں ہی ان فلموں کا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہوں۔“

✧ ”پہلی دستاویزی فلم کا موضوع کیا تھا؟ اور آپ کی دستاویزی فلموں کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟“

☆ ”پہلی دستاویزی فلم ”ملتان میں آنے والے پہلے ولی“ حضرت شاہ یوسف گردیز کی زندگی اور تعلیمات پر مبنی ہے۔ 2009ء میں بننے والی اس فلم کا نام ”فاؤنڈر آف ماڈرن ملتان“ ہے دوسری دستاویزی فلم کا نام ”سدا بہار ملتان“ ہے۔

”ایور لیونگ ملتان“ یہ ملتان کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ میری اس فلم میں ملتان کا تاریخی قلعہ، قاسم باغ اور دمدمہ اصلی حالت میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ اب قاسم باغ قلعہ کو ایک تفریحی پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ والئی ملتان نواب مظفر خان کی رنجیت سنگھ کی فوجوں سے جنگ کے شاہد ”دمدمہ“ کو ”ہوٹل“ کی شکل دے دی گئی ہے...... ان تاریخی مقامات کا آخری عکس میری فلم ایور لیونگ ملتان (Ever Living Multan) میں موجود ہے اور آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ صوفیاء کی حیات و تعلیمات اور تاریخ و ثقافت میری دستاویزی فلموں کے خاص موضوعات ہیں۔ پانچ ہزار سال قدیم ملتان کو ”مدینۃ الاولیاء“ کا نام دیا گیا ہے

بلاشبہ ملتان برصغیر پاک و ہند کا وہ واحد خطہ ہے جہاں نفاذ اسلام کے بعد سینکڑوں کی تعداد میں خدا کے برگزیدہ ولی خیمہ زن ہوئے، عرب، ایران اور افغانستان سے آنے والے سادات اور قریشی خاندانوں پر مشتمل ان گنت صوفیاء کے مقبرے آج بھی ملتان میں ہیں۔ اور میں وسائل کی کمیابی اور سرکاری سرپرستی کی عدم دستیابی کے باوجود کام کر رہا ہوں۔"

⚜ "آپ کی یہ دستاویزی فلمیں کہاں دیکھی جا سکتی ہیں؟"

☆ "میری یہ فلمیں "یوٹیوب" پر The oroj Record Films Jamal Khan کے نام سے سرچ کریں۔ آپ یہ فلمیں باآسانی دیکھ لیں گے۔"

⚜ "کوئی ایسی دستاویزی فلم جس کا ذکر آپ خاص طور پر کرنا چاہتے ہوں؟"

☆ "میری دستاویزی فلم "سر کی گونج" راگوں کی تقسیم، موسیقی کے اوزاں اور قوالی کی تاریخ سے متعلق ہے۔ جس میں صوفیاء اکرام کے مزارات اور مقابر کی یادگار عکاسی کی گئی ہے۔ اس فلم میں مرکزی کردار میں نے خود ادا کیا ہے۔ کہانی ایک ایسے نوجوان کی ہے جو دائمی سکھ کی خاطر یا حصول کے لیے جنگلوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور بالآخر ایک روحانی بشارت کے بعد ملتان آتا ہے۔ فلم کی ابتداء حضرت خواجہ غلام فرید کے مزار سے کی گئی ہے جبکہ کلائمکس حضرت شاہ رکن عالم ملتانی کے مزار پر ہوتا ہے۔ اس فلم میں کئی دانشوروں کی گفتگو کو بھی شامل کیا گیا ہے جبکہ پرائیڈ آف پرفارمنس پانے والی مصروف گلوکارہ ثریا ملتانیکر، غلام عباس، راحت بانو اور صدارتی ایوارڈ یافتہ طبلہ نواز محمد اجمل خان مرحوم بھی آپ کو ہم کلام نظر آئیں گے۔ یہ فلم تخلیقی اعتبار سے میری محنت کا نچوڑ ہے۔ میری بنائی ہوئی ساری فلموں کا ریسرچ ورک میرے والد عزیز احمد خان کرتے ہیں...... میرے لیے یہ بات بھی باعث اعزاز ہے کہ میں نے آج سات سال قبل بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی کے سرائیکی شعبہ کے لیے

ایک بڑی فلم "دی رول آف ارلی صوفیزان ملتان"

The Role of early sophies in Multan

بنائی تھی۔ میں نے کئی شہرہ آفاق گیتوں، غزلوں اور مقبول گیتوں کو شاہکار تصاویر سے مزین کر کے بصری شکل دی ہے جنہیں میرے یوٹیوب چینلز پر دیکھا جا سکتا ہے..... مزید براں میں نے کئی شارٹ اسٹوریز بھی بنائی ہیں جن میں پرندوں کی زندگی کو محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے ہیں۔ اس فلم کا نام "شکار" ہے پانی کی اہمیت پر فلم "پیاس" بنائی ہے۔ صحرائی راستوں میں ہونے والے جرائم پر فلم "اجنبی راستے" بنائی ہے۔ اور منشیات کے خاتمے پر "آخری راستہ" بنائی ہے، جس کی کہانی اور اسکرپٹ بھی میرا تحریر کردہ ہے۔"

⚜ "اور زیر تکمیل یا انڈر پروڈکشن کیا کیا ہے؟"

☆ "میری زیر تکمیل فلموں میں "حضرت موج دریا" حضرت مخدوم رشید حقانی"، "حضرت شادانہ شہید" ہیں جو تقریباً مکمل ہو چکی ہیں۔"

⚜ "آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا...... میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بتائیں؟"

☆ "میرا تعلق چشتی صوفیاء کے گھرانے سے ہے میرے دادا مولانا کریم بخش زخمی ایک خوش الحان خطیب، معروف عالم دین اور نعت گو شاعر تھے۔ تقسیم پاک و ہند سے قبل ان کا کلام ایک ہندو ناشر لالہ مول چند کی جانب سے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔

میرے دادا کے والد ''مولوی یار محمد خان'' اور پردادا ''عبدالقادر خان'' ایک تاجر اور زمیندار تھے۔ قناعت پسندی، درویشی اور انسان دوستی کی دولت ہمارا خاندانی ورثہ ہے۔ میرے دادا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے جبکہ ان کے دو بیٹے تھے۔ میرے چچا کی جوانی میں ہی وفات ہوگئی تو اس طرح میرے والد عزیز احمد خان تنہا رہ گئے۔''

❁ ''آپ کا رجحان اس طرف کیسے ہوا؟''

☆ ''میرے والد نوجوانی سے ہی ترقی پسند نظریات کے حامل تھے کتابوں سے دوستی بچپن سے ہی تھی۔ چنانچہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں کتاب، کہانی اور فلم کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ جبکہ صوفیانہ روایت خاندانی طور پر میرے خون میں شامل تھی۔ چنانچہ لاشعوری طور پر میرا رشتہ تاریخ و ثقافت سے جڑتا چلا گیا...... میں نے اپنے والد کی نظریوں سے الگ راستہ بنانے کا فیصلہ کیا، جس کی تکمیل کے لیے میں نے دستاویزی فلمیں بنانا شروع کیں اور یہ سفر آج بھی جاری ہے اور جاری رہے گا۔''

❁ ''سب کچھ آسانی سے ملتا رہا یا کبھی کرائسس سے بھی گزرے؟''

☆ ''نہیں سب کچھ آسانی سے نہیں ملا۔ اگرچہ مختلف ادوار میں خاندان کو معاشی دشواریوں سے گزرنا پڑا تاہم مشکلات کے باوجود میں نے زندگی کو ہمیشہ خوشی سے گزارا ہے۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنی خواہشات کے دائرے کو محدود رکھا ہے۔ 1992ء سے 1995ء تک کا زمانہ ہمارے گھرانے کے لیے ایک آزمائش کا زمانہ تھا۔ میرے والد اس زمانے میں ایک بڑے مالیاتی ادارے کے آفیسرز فیڈریشن کے مرکزی صدر تھے، جنہیں نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا...... والد کی ملازمت سے سبکدوشی کے دنوں میں معاشی تنگ دستی بھی دیکھی اور ایک محدود عرصے تک ہم بہن بھائیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع رہا...... تاہم اس پورے عرصے میں میرا اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھی پختہ ہو گیا جس کی مہربانی سے ہمیں ہمیشہ کامیابی نصیب ہوئی ...... قناعت اور صبر کا درس ہمیشہ والدہ سے ملا۔''

❁ ''آپ نے صوفیاء اکرام پہ اتنا کام کیا۔ کبھی حکومت کی طرف سے پذیرائی ملی؟''

☆ ''جی نہیں...... آج تک سرکاری سطح پر کوئی مالی معاونت یا سرپرستی کا موقع فراہم نہیں کیا گیا 2000ء میں ایک بار ملتان کے ایک ادبی حلقے کے اصرار پر اسلام آباد گیا تھا مگر مجھے اس وقت کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا گیا حالانکہ میں نے گیلانی خاندان کے آبائی شہر ''اوچ گیلانی'' اور ملتان میں ان کے صورت اعلیٰ ''سید موسیٰ پاک شہید'' پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا ابتدائی کام مکمل کر رکھا تھا...... تاہم دارالحکومت میں سرکاری وسائل پر قابض ایک گروہ کی جانب سے مجھے دستاویزی فلمیں بنانے کی اس شرط پر ترغیب دی گئی کہ بعد ازاں میری یہ فلمیں ''لوک ورثہ'' کی جانب سے منسوب کی جائیں گی اور مجھے محدود معاوضہ دیا جائے گا۔ میں نے اس آفر کو رد کر دیا اور دل برداشتہ ہو کے ملتان واپس آ گیا۔''

❁ ''صحافت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟''

☆ ''صحافت کو سچائی پر مبنی ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشرے کا قیام ہے۔ میرے اخبار ''عزیز نگر'' کی پیشانی پر لکھا ہوا جملہ میرے نظریات کا آئینہ دار ہے اور وہ جملہ ہے

”جنوبی پنجاب کے عوام کا ترجمان۔“

☆”سرائیکی خطہ کے عوام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو بنیادی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ کیا ایسا ہے؟“

☆”ہر عہد حکومت میں عوام دوستی اور خدمت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں تاہم سرائیکی خطے کے عوام آج بھی زندگی کی بنیادی آسائشوں اور حقوق سے محروم ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہاں پائے جانے والا جاگیرداری نظام ہے جو انگریز سامراج کی آمد کے بعد مزید مستحکم ہوا۔ یہاں کی مقامی سیاست پر بھی چند مخصوص خاندانوں کا قبضہ ہے جب تک اس خطے میں تعلیم کو فروغ نہیں دی جاتا جاہلانہ رسوم و رواج اور وسائل پر قابض گروپوں کا تسلط ختم نہیں کیا جاتا۔ یہاں کے عوام کو بہتر زندگی گزارنے کے مواقع نہیں مل سکتے۔“

”فیلڈ کے متعلق کافی باتیں ہوگئیں...... کچھ نجی باتیں بھی ہو جائیں۔“

○”مزاجاً کیسے ہیں؟“

☆”میں انتہائی کم گو انسان ہوں اور مزاج کا بھی بہت سادہ ہوں؟“

○”کس قسم کے لوگ پسند ہیں اور کس سے نفرت آتی ہے۔“

☆”مجھے سادہ مزاج سلجھے ہوئے، سچے اور دھیمے لہجے کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں اور نفرت ہے مجھے جھوٹے، منافقت والے اور لالچی لوگوں سے۔“

☆”دوستی پہ یقین ہے؟“

○”جی بالکل...... دوستی تو ایک لازوال رشتہ ہے۔ میرے بچپن کے چند دوست آج بھی میرے دکھ سکھ میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ بے غرض دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ البتہ مفادات پر بننے والے نمائشی رشتے ناپائیدار ہوتے ہیں۔“

☆”والدین کی کیا بات گرہ سے باندھی؟“

○”جدوجہد اور ظلم کے خلاف مزاحمت، قناعت و صبر یہ باتیں گرہ سے باندھ لی ہیں۔“

☆”حقیقی خوشی کب ملی؟“

○”جب میری بیٹی ”ریبا خان“ پیدا ہوئی۔ جیسے زندگی میں بہار آگئی ہو۔“

☆”پسندیدہ موسیقی اور پسندیدہ رنگ؟“

○”معیاری شاعری پر مبنی گیت و غزل اور پرانے گانے مجھے بہت پسند ہیں۔ جبکہ ملتانی ٹائلوں اور محرابوں کا نیلا رنگ مجھے بہت پسند ہے۔“

☆”اور اپنے قارئین سے کچھ کہنا چاہیں گے؟“

○”یہی کہ پاکستان سے محبت کو اپنا شعار بنائیں۔ غریبوں کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ دوسروں کی عزت کریں اور اپنی تاریخ و ثقافت کی حفاظت کریں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے جمان خان صاحب سے اجازت چاہی۔

میری بھی سنیئے

محمد علی جوش

شاہین رشید

1۔ ''پورا نام؟''

''محمد علی جوش''

2۔ ''پیار سے کون کیا پکارتا ہے؟''

''امی پیار سے **Aluu** کہتی ہیں۔ یہ انضمام الحق والا آلو نہیں ہے...... اور دوست یار احباب مجھے اے جے (AJ) کہہ کر بلاتے ہیں۔''

3۔ ''جنم لیا؟''

''23، جولائی 1991ء میں اور میں اپنے خوب صورت شہر لاہور میں پیدا ہوا۔''

4۔ ''ڈگری؟''

''مارکیٹنگ ان میڈیا۔''

5۔ ''بہن بھائی؟''

''مجھ سے بڑی ایک بہن ہیں اور ایک بڑا بھائی ہے اور میں آخری ہوں، تیسرا نمبر۔''

6۔ ''میڈیا میں پاپڑ بیل کر آئے؟''

''نہیں نہیں...... ایسا کچھ نہیں کرنا پڑا...... میڈیا کی ڈگری تھی اس لیے مشکل انہیں ہوئی...... مذاق کر رہا ہوں...... اس فیلڈ میں بہت محنت کے بعد پہچان اور مقام ملا...... اور سچ پوچھیں تو مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ یہ مقام ملے گا۔''

7۔ ''گھر میں کس نے سپورٹ کیا؟''

''میری ماما'' نے انہی کی وجہ سے اس فیلڈ میں ہوں۔ ورنہ بابا کی خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ بزنس کروں اور بزنس کی طرف میرا بالکل رجحان نہیں تھا۔''

8۔ ''اپنے آپ سے باتیں کب کرتا ہوں؟''

’’عموماً نہیں۔ مگر جب کبھی آئینہ دیکھتا ہوں تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہوں۔ ’’میاں کبھی اپنے آپ سے بھی باتیں کرلیا کرو۔ کبھی اپنے آپ کو بھی ٹائم دے دیا کرو۔‘‘

9۔ ’’عموماً سادہ کاغذ پر کیا لکھتا ہوں؟‘‘

’’زیادہ تر اپنے سائن کرتا ہوں، یا پھر ڈائیلاگ لکھ لیتا ہوں۔‘‘

10۔ ’’پشیمان ہو جاتا ہوں؟‘‘

’’جب جانے انجانے میں کسی کا دل دکھا دیتا ہوں تو بہت پشیمانی ہوتی ہے۔‘‘

11۔ ’’اکثر خیالوں میں سوچتا ہوں؟‘‘

’’کہ میں آج سے چند سال بعد کسی بہت بڑے اسٹیج پہ کسی بہت بڑی شخصیت سے اعلا کارکردگی پر بہترین اداکار کا ایوارڈ لے رہا ہوں۔‘‘

12۔ ’’جب بور ہو جاتا ہوں؟‘‘

’’بوریت دور کرتا ہوں۔ بہت اچھی مووی دیکھ کر، بہترین کھانا کھا کر اور دوستوں کے ساتھ گھوم گھام کر۔‘‘

13۔ ’’ٹینشن میں آجاتا ہوں؟‘‘

’’جب جیب خالی ہو، چیک نہ آرہے ہوں۔ کچھ خریدنے کو دل چاہ رہا ہو اور کسی کی مدد کرنے کو دل چاہ رہا ہو۔ تب بہت ٹینشن میں آجاتا ہوں۔‘‘

14۔ ’’کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں؟‘‘

’’جب بہت غصے میں ہوتا ہوں۔ چھوٹے موٹے غصے کی پروا نہیں کرتا، کیونکہ کھانے پینے کا شوقین ہوں۔‘‘

15۔ ’’کیا شوق سے کھاتا ہوں؟‘‘

’’مجھے ناشتے میں میٹھا پراٹھا، کھانے میں دالیں پسند ہیں۔ مٹن کا سالن، دیسی کھانے اور دیسی مرغی بہت پسند ہیں۔‘‘

16۔ ’’خود کیا پکا لیتا ہوں؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں...... ایک بار انڈا فرائی کیا تھا اور اتنی احتیاط سے کہ زردی نہیں ٹوٹی، محنت کرے انسان تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔‘‘

17۔ ’’جیب خالی ہو جاتا ہے جب؟‘‘

’’جب دوستوں کے ساتھ کھانے پینے جاتا ہوں۔ جب اپنے لیے شاپنگ کرنے جاتا ہوں۔ یا کہیں گھومنے پھرنے جاتا ہوں۔‘‘

18۔ ’’مجھے ڈر لگتا ہے؟‘‘

’’اپنے ابو کے غصے سے۔‘‘

19۔ ’’شادی کی رسمیں کیسی لگتی ہیں؟‘‘

’’اچھی لگتی ہیں اس لیے شادی کی تقریبات میں شوق سے جاتا ہوں...... اور مہندی کی رسم بہت پسند ہے۔ مگر کورونا نے بہت دوریاں پیدا کردی ہیں۔‘‘

20۔ ’’بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جو چیزیں لازمی رکھتا ہوں؟‘‘

’’اپنا والٹ، پانی کی بوتل، گھڑی اور موبائل وغیرہ۔‘‘

21۔ ’’وہ خواتین بری لگتی ہیں؟‘‘

’’جو بہت زیادہ سوال کرتی ہیں اور نگیٹو سوچ رکھتی ہیں اور بلاوجہ شک کرتی ہیں۔‘‘

22۔ ’’گھر والے پسند نہیں کرتے؟‘‘

’’میرا ہر وقت گھر سے باہر رہنا، دیر سے گھر آنا۔‘‘

23۔ ’’میری خواہش ہے کہ؟‘‘

’’کہ ایک شام ’’سنجے دت‘‘ کے ساتھ گزاروں۔‘‘

24۔ ''ایک کام جو میرے لیے بہت مشکل ہے؟''

''وقت کی پابندی کرنا۔ باوجود کوشش کے وقت کی پابندی نہیں کر پاتا۔''

25۔ ''کس کو دیکھ کر بے اختیار سبحان اللہ پڑھتا ہوں؟''

''سمندر کو دیکھ کر اور خوب صورت چاندنی رات کو دیکھ کر۔''

26۔ ''دکھ ہوتا ہے؟''

''جب لوگ گرنے والوں پر ہنس رہے ہوتے ہیں شاید وہ خود گرے نہیں ہوتے۔''

27۔ ''اللہ کی بہترین تخلیق؟''

''چاند......''

28۔ ''کھانے میں مزا آتا ہے؟''

''تنہائی پر، پھر اپنا بیڈ، اور بہت مجبوری تو پھر ڈائننگ ٹیبل۔''

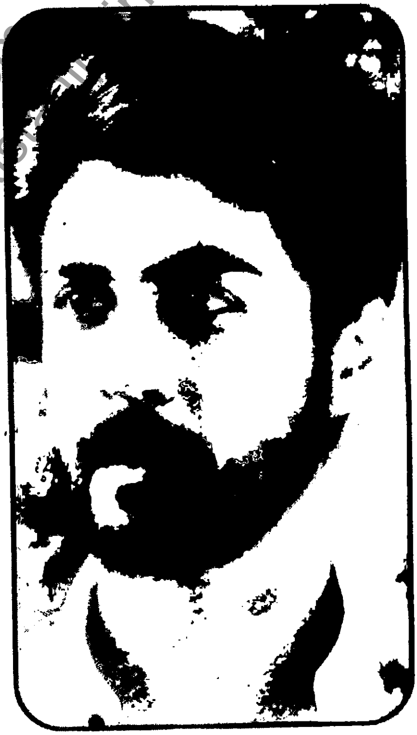

29۔ ''نیند آسانی سے آجاتی ہے؟''

''اگر تھکا ہوا ہوتا ہوں تو پھر بڑے آرام سے نیند آجاتی ہے۔ ورنہ پھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔''

30۔ ''پیسہ جمع کرتا ہوں؟''

''کیش کی شکل میں۔ کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

31۔ ''اپنا ڈرامہ جو پسند ہے؟''

''کم بخت تنو' بہت مقبول ہوا تھا۔''

32۔ ''اخبار کا پسندیدہ صفحہ؟''

''میڈیا والا......جس میں ٹی وی فلم کے بارے میں نیوز ہوں۔ میگزین میں بھی اپنے ہی مطلب کی خبریں تلاش کرتا ہوں۔''

33۔ ''ناانصافی پر ردعمل؟''

''اظہار کرتا ہوں، بولتا ہوں، اسٹینڈ لیتا ہوں۔ اور حق کے لیے آواز اٹھاتا ہوں ناانصافی برداشت نہیں۔''

34۔ ''مجھے برا لگتا ہے؟''

''جب کوئی خواہ مخواہ نصیحت کرے کہ زیادہ دوستیاں نہ کیا کرو...... دوستوں میں وقت ضائع نہ کرو...... فلاں کام کرلو...... یہ نہ کرو...... وغیرہ وغیرہ۔''

35۔ ''سفر کرنا پسند ہے؟''

''سفر کرنا بہت پسند ہے۔ اور لوکل سفر کے لیے جب اپنی گاڑی کو کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو پھر مجھے بس رکشا اور بائیک پہ سفر کرنے میں مزا آتا ہے۔''

36۔ ''میرا خواب ہے کہ؟''

''کہ میں پوری دنیا گھوموں اور میں فلمیں بناؤں اور ڈائریکٹ کروں۔''

37۔ ''موڈ آف ہو جاتا ہے؟''

''جب رات کو دیر سے گھر آنے پر گھر والے ناراض ہوتے ہیں۔ پابندیاں مجھے پسند نہیں۔''

38۔ ''پسندیدہ ملک؟''

''سوئیڈن۔''

39۔ ''ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟''

''اگر چیز کی بات کریں گی تو سچ میں ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے لیکن ہمارا سسٹم بہت خراب ہے۔ لاء اینڈ آرڈر کی بہت کمی ہے، عدالتوں کا نظام، صحت کا نظام، ٹریفک کا نظام، تعلیمی نظام بہت خراب ہے یہ ٹھیک ہو جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

40۔ ''میری بری عادت؟''

''لاپروا بہت ہوں۔ نیکیاں کرتا ہوں جو گلے پڑ جاتی ہیں۔''

41۔ ''شوبز میں ایک بات جو خاص طور پر نوٹ کی؟''

''آپ کے منہ پر آپ کے ہوں گے۔ آپ کے پیچھے آپ کے دشمن ہوں گے۔ کاٹ کریں گے برائیاں کریں گے۔''

42۔ ''تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟''

''میں تو کیش (Cash) دینے کا قائل ہوں۔''

43۔ ''قیمتی چیزیں خریدتا ہوں؟''

''نہیں...... ابھی تک تو نہیں خریدیں...... اور اگر خریدی بھی تو کپڑے لوں گا اور اچھی سی گھڑی لوں گا۔''

بڑا آدمی
نسیم سحر قریشی
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی
فون نمبر:
32735021

44۔ ''میری اچھی عادت؟''

''میری اچھی عادتیں تو دوسروں کو بتانی چاہئیں۔ مگر پھر بھی...... میں ایمانداری سے کہوں گا کہ مجھ سے لالچ بالکل نہیں ہے...... حسد اور جلن بھی نہیں ہے۔ اب پتہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔''

45۔ ''قسمت یا محنت؟''

''مجھے تو قسمت پر پختہ یقین ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنا نوازا ہے اتنی میں نے محنت نہیں کی ہے۔''

46۔ ''کبھی الہام ہوا؟''

''بہت بار الہام ہوا۔ اور یہ میری چھٹی حس ہی تو تھی کہ جو مجھے بتاتی تھی کہ میں اس فیلڈ میں کامیاب ہو جاؤں گا اور دیکھ لیں۔ اللہ نے اپنا کرم کر دیا۔''

47۔ ''میرا پسندیدہ مہینہ؟''

''جولائی...... کیونکہ اس ماہ میرا برتھ ڈے ہوتا ہے۔''

48۔ ''چھٹی کا دن کیسے گزارتا ہوں؟''

''بہت مزے کا۔ آرام کرتا ہوں، مساج کرواتا ہوں۔ پارک جا کر تازہ ہوا کھاتا ہوں۔ بہت پلاننگ کے ساتھ چھٹی کا دن گزرتا ہوں۔''

49۔ ''کیا برداشت نہیں ہوتا؟''

''مجھے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ بھوک کے وقت بکرا بھی نظر آ جائے۔ تو دل چاہتا ہے کہ اسے کچا کھا جاؤں۔''

50۔ ''پہلی کمائی کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''

''میری پہلی کمائی دس ہزار تھی اور وہ امی کے ہاتھ میں رکھی کیونکہ انہوں نے مجھے زندگی میں بہت سپورٹ کیا ہے۔''

☆☆

مقابل ہے آئینہ

اقرا سرور

ادارہ

س: ''اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج: ''اصلی نام ''اقرا سرور راجہ'' ہے قلمی نام، ''اقرا بنت سرور'' اور پیار کا نام بتانے لائق نہیں، ہاہاہا''

س: ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

''ج: اپنا خیال رکھا کرو اقرا''

س: ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج: بہت سے خیال آتے ہیں جیسے میں بھی ان کی طرح حسین ہوتی، ماشاء اللہ، واللہ اس کو نظر بد سے بچائے'' اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔'' ان کا نصیب بھی اتنا حسین ہو۔''

س: ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے گی؟''

ج: ''تو آپ کو رومال ''پین''، ''پرچیاں'' اور پیسے ملیں گے۔ ویسے آپ تلاشی کیوں لینا چاہتی ہیں۔ وہ بھی پوچھ کے (ہاہاہا)''

س: ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج: ''نہیں میں دہل جاتی ہوں اور اگلے لمحے: ''آیۃ الکرسی'' پڑھ کر ان کو دہلا دیتی ہوں یعنی کہ نہلے پہ دہلا...... ہاہا۔''

س: ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج: ''یعنی کہ اب مہمانوں کی ورائٹیاں آنا شروع ہو گئی ہیں؟ مہمان نئے نئے اچھے لگتے ہیں۔''

س: ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج: ''بریانی، سٹے، مچھلی اور ہر چٹ پٹی چیز مجھے کھانے میں بہت پسند ہے۔''

س: ''پسندیدہ شاعر؟''

ج: ''علامہ اقبال، ناصر کاظمی، پروین شاکر، مرزا غالب۔''

س: ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج: ''نہیں جی نہیں، ہاں کبھی کبھار غصہ آ جاتا ہے۔''

س: ''کس مزاج کے لوگ پسند ہے؟''

ج: ''اپنے جیسے مزاج کے مثلاً شرارتی ہنسنے ہنسانے والے ہر دم ہلا گلا کرنے والے لیکن اندر سے معصوم لوگ۔''

س: ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو......؟''

ج: ''اس بارے میں ابھی سوچا نہیں۔ ویسے لوڈشیڈنگ کے بہت سارے فائدے ہوتے ہیں ہم پاکستانیوں کو لائٹ آنے کی صورت میں دن میں دو بار تو چہرے پر مسکراہٹ آ ہی جاتی ہے۔''

س: ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟''

ج: ''میں عمران خان کی طرح حکومت کروں گی۔ اور سب سے پہلا کام مودی کا ٹیٹوا دباؤں گی۔''

س: ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج: ''جب آپ اداس اور تنہا ہوں یا پھر رات کا وقت۔''

س: ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج: ''فضول خرچ ''پچاس پرسینٹ''۔

س: ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج: ''نہیں۔''

س: ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج: ''چند گنے چنے نام...... شخصیت کا پرتو ہوتے ہیں سارے نہیں۔ میرا نام میری شخصیت کا عکس ہے۔''

س: ''سنسان راستہ ہو اور کتا آپ کے پیچھے

لگ جائے؟“

ج: ”ہم دیہاتی ہیں دن رات کتوں سے واسطہ پڑتا ہے کبھی کبھار پیچھے لگ جائے تو ڈرتے ڈرتے آیت کا ورد کرنا شروع کر دیتے ہیں کتے خود بخود رک جاتے ہیں اور مڑ کر چلے جاتے ہیں۔“

س: ”آپ کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“

ج: ”اپنے والدین، بہن بھائیوں اور اپنے بہترین استادوں مس شاہدہ، سر طارق اور سر مجاہد کی۔“

س: ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

ج: ”جی بہت شوق سے، وہ بھی سلیکٹ (منتخب) کر کے جیسے داستان، یقین کا سفر، گل رعنا، انا، من مائل، چپ رہو۔“

س: ”پچھلے سال کی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا؟“

ج: ”کرن میں خط شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نہیں ملی۔ ہاں، ماشاء اللہ 2019 میرے لیے کامیابیاں لا رہا ہے تسلسل سے، الحمدللہ۔“

س: ”حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟“

ج: ”ایسی خوشی جس سے گھر کے ہر فرد کا چہرہ مسرور ہو۔ جب میری وجہ سے کسی کو خوشی ملے جب میرے والدین خوش ہوں۔ جب ڈائجسٹ میں میرا نام آئے۔“

س: ”اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟“

ج: ”ہمارے ہاں ”ناراض دوست“ کو منانے کا رواج نہیں، تجربہ کر کے بتاؤں گی، ہاہا۔“

س: ”آپ کی بہت قیمتی ملکیت؟“

ج: ”میرے والدین اور ان کی دعائیں، میری اور میرے گھر والوں کی عزت اور میرے ”خواب“۔

س: ”اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“

ج: ”میری زندگی کے دشوار لمحات بیان کرنے سے باہر ہیں۔“

س: ”کون سا کام کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟“

ج: ”مجھے تو دنیا کا خیال ہی نہیں آتا۔ دنیا کی باتوں کا کیا ڈر، ہاہا۔“

س: ”آپ کی نظر میں محبت؟“

ج: ”ہر ایک کی زندگی کا لازمی جزو، ایک پاکیزگی جسے ہر انسان کو اوڑھ کر زندگی گزارنی چاہیے۔“

س: ”اپنی تعریف سن کے خوش ہوتی ہے؟“

ج: ”کچھ زیادہ نہیں۔“

س: ”مستقبل کی منصوبہ بندی؟“

ج: ”ابھی ایف اے کیا ہے۔ بی ایس اردو میں داخلہ لیا ہے۔ بی ایس کے بعد ایم فل اور پھر اردو میں پی ایچ ڈی یعنی بڑے لمبے منصوبے ہیں اس کے علاوہ ”مصنفہ“ بننے کی بھرپور پلاننگ ہے۔“

س: ”کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے۔“

ج: ”موت......قیامت......قبر......“

س: ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“

”ملتا وہی ہے جو قسمت میں ہوتا ہے اور کبھی کبھی معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔“

س: ”کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟“

ج: ”ڈاکٹر بننا، علامہ اقبال سے ملاقات، عمران خان سے ملاقات کی خواہش ہے۔

س: ”کوئی آخری بات؟“

ج: ”مایوس نہ ہوں، کبھی بھی نہ ہو، اللہ، پر توکل رکھیں۔“

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ یہ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم 70/- روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر **03172266944** میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840/- روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر **0010000015680030**، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے **PK44ABPA0010000015680030**"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہوا تو 500/ روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500/ روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 7000/ روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 8000/ روپے۔

کسی بھی معلومات اور آرڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر وشاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی۔ نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بےزار ہے۔ نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بےعزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ ارسلہ کو اپنی دوست رومی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔

ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

آٹھویں قسط

اس دھچکے نے اریبہ کو کتنی دیر کسی بھی ردعمل کے اظہار سے باز رکھا۔ جبکہ سکندر نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر اضطراری انداز میں چلتا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا، گویا اپنے منتشر ذہن کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی جس کے ساتھ ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھ کر پیش آتا رہا ہے۔ وہ آج اسے اپنے وجود کا احساس دلانے کھڑی ہو جائے گی۔ ایسے جذبات پالنے لگے گی جس کا کم از کم وہ ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے اپنے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے ذرا سا گردن موڑ کر اریبہ کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا وہ شرمندگی محسوس کر کے اپنی کہی بات پر نادم ہو کر اس سے سوری ضرور کرے گی اور اپنی بات کو محض مذاق گردانے گی۔ مگر وہاں تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی۔ جیسے کوئی نو آموز وکیل اپنا مقدمہ لڑتے ہوئے پوری جرات کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ دل معمول سے تیز دھڑک رہا ہو۔ بدن لرز رہا ہو مگر یہ دکھانا کہ وہ بالکل خوف زدہ نہیں ہے۔ بلکہ پرامید ہے۔

”افسوس ہوا مجھے کہ تم اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہو۔“ سکندر کے لہجے میں ملامت تھی۔

”اس طرح سے کیا مطلب۔“ وہ مغموم سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ اس کی انگلیاں اضطراری انداز میں ایک دوسرے میں پیوست ہو رہی تھیں۔

سکندر جھٹکے سے پلٹ کر اس کی طرف آیا۔ خالہ کا بڑا سا جامنی دوپٹا اوڑھے بالوں کی لمبی سی چٹیا سینے پر ڈالے وہ بڑی ضرور دکھائی دے رہی تھی مگر سمجھ دار نہیں۔ وہ ایک عجیب سی افسردگی سے بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ سکندر کے تھپڑ نے اسے شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ بھی دکھی سی تھی۔

”دیکھو بیا۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے سو بار سوچا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مرد اور شیطان کے بیچ صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ ہوتا ہے اور جو یہ فاصلہ کچے پل کی طرح ٹوٹ گیا تو سمجھتی ہو کتنی بڑی تباہی مچ سکتی ہے۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔ اس کے رخسار کسی احساس سے تمتمانے لگے تھے۔ تھپڑ کا احساس گویا پھر سے جاگ کر ٹیسیں دینے لگا تھا۔

”تم لڑکیاں سمجھتی ہو محبت مرد کی طرف سے پیش کیے جانے والا پھول ہو گا جسے تھام کر اپنی زندگی کو حسین اور خوب صورت بنا لو گی۔ اپنے دل میں ابھرنے والے جذبے کو عیاں کر کے سب کچھ پا لو گی، منزل پا لو گی زندگی میں سکھ ہی سکھ مل جائیں گے۔“

”یہ سوچا تو کیا برائی ہے اس میں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پگلی۔ نامحرم مردوں سے فرشتوں کی سی امید رکھنا، محبت طلب کرنا سراسر نادانی ہے۔ محبت یوں راہ چلتے لوگوں سے نہیں ملتی۔ یہ بہت شفاف پاکیزہ جذبہ ہے اسے کسی نامحرم کی آنکھ میں تلاش نہیں کرتے۔ یہ قدرت کی طرف سے تمہیں خود ہی تحفے کی طرح وقت پر ملے گی۔“

”آپ کوئی راہ چلتے آدمی تو نہیں ہیں۔“ وہ بے اختیار کہہ گئی پھر چپ ہو کر اضطراری انداز میں انگلیاں مسلنے لگی۔ سکندر کی نظریں ملامت آمیز انداز میں اس پر جم گئیں۔

”نامحرم تو ہوں نا۔“ سکندر نے ترش نظروں سے اسے گھورا۔ اس کا انداز ڈپٹنے والا تھا مگر وہاں تو جیسے مطلق اثر نہ تھا۔ بلکہ جو خوف اس پر طاری تھا وہ بھی سکندر کے سامنے بات کھل جانے پر زائل ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں کو مزید حوصلہ ملا تھا جیسے اندر کا کوئی بوجھ کم ہوا تو آگے راستہ عبور کرنا آسان دکھائی دینے لگے۔

”نامحرم سے محرم بننے میں دیر تو نہیں لگتی۔ اگر آپ چاہیں تو......“ وہ اس کے لہجے کی ترشی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ مگر سکندر کی اٹھنے والی نگاہوں سے جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

کوئی بڑا پتھر تھا جو سکندر کو اپنے سر پر گرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اعصاب شکن احساس کے ساتھ اپنی جگہ ساکت

وصامت رہ گیا ہو۔ غیر محسوس طور پر اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر انگلیوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہونے لگی۔

وہ تو یہ کہرام مچا کر قریبی کمرے میں جا گھسی تھی۔ سکندر نے خالی نظروں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور اپنی رگوں میں دوڑتے خون کے ابال کو دبایا مگر لگ رہا تھا خون شریانوں سے دماغ پر آ کر ٹھوکریں مارنے لگا ہو۔ یک دم وہ پلٹا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا داخلی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اماں کچن سے نکلتے ہوئے اسے گیٹ سے باہر جاتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

''ارے، یہ سکندر کہاں جا رہا ہے۔ کہا بھی تھا کھانا کھا کر جانا۔ یوں بھاگ لیا۔''

اریبہ نے کمرے کے اندر دروازے کی اوٹ سے اسے جاتا دیکھ لیا تھا۔ وہ اندر آ کر بھی دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر اپنی دھڑکنوں کا شور سننے لگی تھی۔ اور سوچ جا رہی تھی کہ کیسے اس نے سکندر کے سامنے اپنا آپ عیاں کر دیا۔ یہ اتنی ہمت حوصلہ کہاں سے آ گیا اس کے پاس۔

''ارے کچھ کہا سکندر نے تم سے۔'' اماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ جلدی سے دروازے سے باہر نکلی۔

''فون آیا تھا ان کا، شاید اسی لیے چلے گئے۔'' وہ پہلی بار اماں سے جھوٹ بول رہی تھی اس لیے اماں کی طرف دیکھنے کے بجائے چھت کا زینہ پھلانگ گئی۔

اپنی دھڑکنوں کو معمول پر لانا تھا، اس سارے واقعہ پر بیٹھ کر سوچنا تھا۔ شرمندگی الگ ہو رہی تھی۔ چند سیڑھیاں پھلانگنے پر یوں ہانپ گئی جیسے کتنی لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ وہیں دیوار کی سطح پر ہاتھ ٹکا کر مرغیوں کے پنجرے کے پاس ہی بیٹھ گئی اور وسیع خوش نما نکھرے نکھرے آسمان کو تکنے لگی۔

وہ خود پر حیران اور متاسف تھی کہ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی کہ سکندر اس کے ذہن و دل پر چھاتا چلا جا رہا ہے، وہ مرغی کے پنجرے پر ہاتھ پھیرنے لگی جہاں سفید سفید مرغیاں اپنے آپ میں مگن دکھائی دے رہی تھیں۔

''شاید اسے ہی محبت کہتے ہوں گے کہ کوئی یکدم سے آپ کو بہت اچھا لگنے لگے۔ اس کے بارے میں رات جاگ جاگ کر سوچنا اچھا لگے۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہوں مگر آنکھوں کو میٹھی اذیت دے کر نیند سے دور رکھ کر بس اسی کے تصور میں جاگتے رہنا، صبح کر دینا۔ ایک بے سکونی دل و روح میں سما جائے اور دل پگھل کر اس کے پیروں میں بکھرنا چاہے۔''

اس نے جیسے مرغیوں سے تائید چاہی پھر ہنس دی۔ یک دم ہوا میں نغمگی کا احساس ہونے لگا۔ اسے اپنے تپتے رخساروں پر جھونکے خنک محسوس ہونے لگے۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور مسرور سے انداز میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

تب اچانک اسے اماں کی پکار سنائی دینے لگی جو وقفے وقفے سے کئی بار آ چکی تھی۔ اس نے زینے کے پاس جا کر جھانکا تو نیچے ہلچل کا احساس ہوا۔ نیلوفر کی آواز سنائی دی۔

''ارے۔ یہ اپنی بیا چھت پر کیا کر رہی ہے۔''

''واؤ! آپی آئی ہیں۔'' وہ خوشی سے دو دو سیڑھیاں اترنے لگی۔

☆☆☆

مہوش کے لیے ارسلہ ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی ایسا مسئلہ جو حل نہ ہو پا رہا ہو۔ مہوش چاہتی تھی وہ آبص کا دل اپنی توجہ اور محبت سے جیت لے۔ اس کی پسند میں ڈھل کر اسے اپنی پسند میں ڈھال لے۔ اس طرح کہ وہ

نادیہ شاہ کو بھول کر ایک نارمل زندگی گزارنے لگے۔

عورت کو بس تھوڑی سی محنت کرنا ہوتی ہے۔ تھوڑا سا صبر، استقامت اور تحمل سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر عورت مرد کی راہ کے کانٹے چن لے تو مرد اس کے لیے ایسی گھنی چھاؤں بن جاتا ہے جسے کوئی دھوپ نہیں کاٹ سکتی۔ مگر یہ باتیں ارسلہ نہیں سمجھ رہی تھی یا سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس کی خواہشات تو اڑان بھر رہی تھیں۔ اسے دولت کے نشے میں بدمست رہنے کا چسکا چڑھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ اپنی تمام تر محرومیاں، تشنگی بس ایک ہی سانس میں ختم کر دینا چاہتی ہو۔

"سب کچھ تمہارا ہی ہے ارسلہ۔ آبص میرا اکلوتا بیٹا ہے اس کا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہی تو ہے۔"

"صرف کہہ دینے سے میرا نہیں ہو جائے گا۔ یہ تو طفل تسلیاں ہیں۔ میرا مطلب ہے...... مجھے کیا مل رہا ہے اس گھر سے۔ آبص کی بے رخی اور بے اعتنائی کے علاوہ۔" وہ پورے اعتماد کے ساتھ مہوش سے بحث کرنے کے موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لہجے میں دبی دبی تپش تھی۔

"آبص سے تم خود دور ہو رہی ہو بجائے اس کو خود سے قریب کرنے کے۔" مہوش کے لہجے اور چہرے سے حقیقی فکر مندی جھلک رہی تھی۔

"آپ کا مطلب ہے میں آبص کا غم دور کرنے کے، اس کا دل بہلانے اور اسے ماضی کے غم سے نکالنے کے لیے لائی گئی ہوں مہرے کے طور پر۔" وہ تڑخ گئی۔ "مجھے یہاں بہو بنا کر لانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ آبص کو اس کے ماضی کے غم سے نکالا جائے۔"

"ارے ایسا نہیں ہے......" مہوش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے تھپکا۔ "تم بیوی ہو اس کی، اس گھر کی بہو ہو، عزت ہو ہماری۔ میرے کہنے کا مقصد بس یہ تھا کہ جتنا جلدی آبص ماضی کے چنگل سے نکلے گا اتنا ہی تمہارے قریب ہو جائے گا۔ تمہارا ہو جائے گا۔" مہوش نے تحمل سے اسے سمجھانا چاہا۔ مگر وہ اور اکڑ میں آ گئی مہوش کو جھکتے دیکھ کر اس کی ہمت بڑھ سی گئی۔

"مجھے آبص کے ماضی سے دلچسپی ہے نا اس کے اس غم سے۔ میں نے اس طرح کی زندگی کے خواب ہرگز نہیں دیکھے تھے۔ میرے تو سارے خواب ہی ٹوٹ گئے۔ حد ہو گئی شادی نہ ہوئی کشتی لڑنا ہو گئی جو جیت لے تو ٹرافی اسے مل جائے گی۔" وہ طنزیہ ہنسی۔ کھانا تو وہ پہلے ہی پیٹ بھر کر کھا چکی تھی مگر پلیٹ یوں پرے دھکیلی جیسے کھانے سے دل اچاٹ ہو گیا ہو اور بھوک اٹھ رہی ہو۔

"دیکھو ارسلہ۔ تمہارا یہ بی ہیویئر خود تمہارے لیے نقصان دہ ہو گا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" مہوش پر بوکھلاہٹ سوار تھی۔ عجیب بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا مگر سہہ رہی تھیں۔ نصیر کاکا وہاں سے ہٹ کر ڈائننگ ہال سے باہر نکل گئے۔

ارسلہ ساس کا لحاظ کیے بنا بولے رہی تھی۔ اس کوٹھی میں آج تک انہوں نے کسی کو اس طرح اس لہجے میں بات کرتے نہ دیکھا تھا حتی کہ آبص نے بھی کبھی بدکلامی نہ کی تھی مہوش یا اکبر جیلانی سے۔

"جو کچھ بھی آبص کا ہے وہ تمہارا ہے ارسلہ۔ تم غیر تو نہیں ہو۔"

"آبص کا کیا ہے۔ مجھے کیا پتا۔" وہ بول تو گئی مگر دوسرے پل مہوش کی حیرت سے اٹھنے والی نظروں سے خفیف سی ہو کر بولی۔

"میرا مطلب ہے کہ آبص کی جتنی بھی جائیداد ہو مجھے کیا فائدہ۔ میرا تو اپنا کوئی اکاؤنٹ ہے نہ ہاتھ میں رقم اور رقم بھی کس کام کی۔ میں نے تو کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ ہنی مون پر جاؤں گی۔ دنیا دیکھوں گی۔ ہنہ...... دنیا تو کیا ایک دبئی تک وہ جانے کو تیار نہیں ہیں میرے ساتھ۔" وہ ایک لمبا ٹھنڈا سانس کھینچ کر دیوار گیر صوفے پر جا کر بیٹھ گئی اور افسردگی کا اشتہار نظر آنے لگی۔ پھر لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے بولی۔ "رومی کی شادی ہو گی

تو آپ چاہیں گی کہ رومی دنیا گھومے، انجوائے کرے لائف کو۔ میں نے تو بس دبئی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بھی پوری نہیں ہوسکتی تو آگے کیا امید رکھوں۔ بس دھوکا کھانا قسمت میں لکھا تھا۔ خواب رہے ایک طرف۔

''ارے تم ایسے کیوں سوچنے لگیں۔'' مہوش اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کوئی دھوکا نہیں ہوا تمہارے ساتھ۔ تم بہو ہو اس گھر کی۔ گھومنا پھرنا تمہارا حق ہے اور ہنی مون پر تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ میں آبص سے کہوں گی وہ فوراً تمہیں لے جائے۔'' مہوش کے اس تسلی بھرے انداز پر اسے مزید حوصلہ ہوا۔

''بس رہنے دیں آنٹی۔ وہ تو جانے پر راضی نہیں ہیں۔ صاف منع کر دیا ہے۔ پھر اپنے پیر کی وجہ سے تو بالکل بھی جانا پسند نہیں کریں گے شاید۔''

''ارے ایسا نہیں ہے۔ پیر کا کوئی ایشو نہیں ہے۔''

''خیر......!'' ارسلہ نے ان کی بات پر بے دلی سے سر جھٹکا اور اٹھنے لگی۔ مہوش نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھنے سے روکا۔

''دبئی جانا چاہتی ہو۔''

مہوش کے اس سوال پر ارسلہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دبئی جانے کا مسحور کن تصور اس کے سر پر دو روز سے سوار تھا۔ جب رومی نے اسے دبئی کے قصے سنائے تھے تب سے اس کے اندر بھی دبئی جانے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور پھر میکے میں بھی تو اسے رعب ڈالنا تھا۔ اریبہ نے یونہی پوچھا تھا کہ 'ہنی مون'' پر کب اور کہاں جائیں گی۔ تب اس نے بھرم میں کہہ دیا تھا کہ سب سے پہلے دبئی اور اب تو دبئی دماغ پر ایسا سوار تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کل ہی ٹکٹ لے اور نکل جائے۔

''تم آبص کی فکر نہ کرو۔ وہ تو یوں بھی گھومنے پھرنے کا شوقین نہیں ہے اور دبئی وہ اتنی بار جا تا رہا ہے بزنس کے سلسلے میں کہ اسے ہنی مون کے لیے دبئی بالکل بھی پسند نہیں۔ دبئی تم میرے ساتھ چلنا۔'' مہوش نے اس کا دل رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اور رومی بھی اکثر چلے جایا کرتے ہیں، اکبر بھی آبص کی طرح ہی ہیں بلکہ یوں سمجھو آبص بھی اکبر کی طرح ہے، گھومنے پھرنے کے نام سے کترانے والا۔''

''مگر آپ کے ہمراہ...... میرا مطلب ہے ہم دونوں اکیلے...... کوئی پرابلم تو نہ ہوگی۔'' ارسلہ کے لیے اکیلے جانا تعجب خیز بات تھی۔ اس نے تو سنا تھا سفر مردوں کے ہمراہ ہی کیا جاتا ہے۔

اماں کے منہ سے بھی یہی جملہ سنا تھا۔ ''محرم کے ہمراہ سفر کیا جاتا ہے۔''

''میرے ساتھ جاؤ گی تو زیادہ انجوائے کرو گی۔'' مہوش مسکرائیں۔ ارسلہ جو خوش گوار حیرت سے انہیں تکے جا رہی تھی یک دم پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ آپ کے ساتھ میں زیادہ انجوائے کروں گی۔ آبص کو رہنے دیں۔'' پھر بے تابی سے بولی۔ ''تو پھر کب جائیں گے۔''

''اسی ویک۔''

''ارے رئیلی۔'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گوری رنگت کچھ اور دمکنے لگی۔ خوشی کا گویا کوئی دورہ سا اٹھا تھا بس نہیں چلا مہوش سے ہی لپٹ جاتی۔ مزید مہوش نے یہ کہہ کر اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی۔

''تمہارا اکاؤنٹ بن جاتا ہے تو میں کچھ اماؤنٹ ڈال دوں گی۔ تمہیں آبص سے یا مجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ خوب شاپنگ کرنا وہاں۔'' وہ اس کے گال پیار سے تھپتھپا کر اٹھ گئیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"خوش رہو اور بالکل مت سمجھنا کہ دھوکا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ آبص کے مزاج کو تم آہستہ آہستہ سمجھنے لگو گی پھر شکایت نہیں ہوگی۔"

"جی...... جی...... جی بالکل۔" اس نے کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح سر ہلا دیا اور اتھل پتھل دل کو سنبھالنے لگی۔ پیر یوں بھاری ہو رہے تھے مارے خوشی کے کہ وہاں سے اٹھا بھی نہ جا رہا تھا۔ ایسی آرزو پوری ہوئی تھی جس کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آبص آفس سے لوٹا تو وہ اسے دبئی جانے کا بتانے لگی۔ ایک طرح سے خوش خبری دے رہی تھی۔

وہ بیسن کا نلکا بند کر کے ذرا سا چونکا پھر اسٹینڈ سے تولیا اٹھا کر منہ پونچھتے ہوئے باتھ روم سے باہر آ گیا۔

"اجازت مانگ رہی ہو یا اطلاع دے رہی ہو مجھے۔"

"اطلاع ہی سمجھ لیجیے۔" وہ کلائیوں میں پڑی درجن بھر سنہری چوڑیوں کو کھنکھناتے ہوئے بولی۔ وہ دبئی کے خوش کن تصور میں گم دکھائی دے رہی تھی۔

آبص کو یہ حسین دوشیزہ اس پل اس مصنوعی بلب کی مانند لگی جس کی تیز مصنوعی روشنی آنکھوں کو چبھنے لگی ہو۔

"ہوں۔" اس نے ہلکے سے ہنکارا بھرتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہو۔" اسٹک ایک طرف رکھ کر بیڈ پر دراز ہو گیا اور کلائی میں بندھی گھڑی اتارتے ہوئے غیر دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"یہ تو آنٹی کو ہی معلوم ہوگا۔ ویسے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں جتنے دن رہنا چاہوں۔ میری بات تو وہ مانیں گی ہی۔" اس کے لہجے میں جتانے والا تاثر تھا۔

"گڈ۔" وہ موبائل اٹھا کر مصروف ہو گیا۔

ارسلہ نے تعجب سے اسے دیکھا اس کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"آپ کو کوئی اعتراض نہیں میرے جانے پر۔"

"اعتراض...... وہ کیوں؟" اس نے نظریں اٹھائیں اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں، یہ بھی ہے اعتراض کیوں ہوگا آپ کو۔" وہ اپنی ہی بات کو جیسے رد کرتے ہوئے مسکرائی۔ "یہ تو میرا حق ہے گھومنا پھرنا۔ میری لائف ہے اسے جس طرح گزاروں اور آپ تو یوں بھی اپنی دنیا میں گم ہیں اور رہنا بھی چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر بالوں سے کلپ نکال کر برش اٹھا کر پھیرنے لگی۔

"خیر، حق اپنی جگہ۔ پرمیشن لیتیں تو شاید مجھے اچھا لگتا۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اجازت تو وہاں لی جاتی ہے جہاں کوئی تعلق ہو۔ یا تعلقات میں رواداری رکھی گئی ہو۔" وہ متنفر دکھائی دینے لگی۔

آبص یک دم چپ سا رہ گیا۔ بات غلط نہیں تھی بس جتانے کا انداز نامناسب تھا۔ اس نے اس کے بکھرے ریشم کے تھان کی طرح کھلے بالوں پر نظر ڈالی۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ جتنے دن رہنا چاہو رہ لو۔ تمہارے اکاؤنٹ میں اماؤنٹ بھی ڈیپازٹ کر دوں گا۔" وہ یہ کہہ کر موبائل رکھ کر سونے کے لیے کروٹ بدل گیا۔

"ہاں۔ میں شاپنگ بھی کروں گی، سنا ہے دبئی میں بہت اچھی اچھی چیزیں ہوتی ہیں، بڑے بڑے برانڈز ہوتے ہیں۔ وہاں کے مالز بھی بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ مجھے تو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ دبئی جا کر شاپنگ

Waqar Azeem www.pakistanpoint.com

لرنا تو میرا خواب ہے۔" وہ بال لپیٹتے ہوئے کھنکتے لہجے میں بول رہی تھی۔ آبص نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ ادھر وہ اپنی ہی خوشی میں مگن تھی۔

"سکندر تو بے چارہ جل جل کر راکھ ہو جائے گا اور نیلو...... اف...... اس کا شوہر احمر، وہ تو پہلے ہی حسد میں مر رہا تھا۔ اب تو بے چارہ احساس کمتری میں خاکستر ہی ہو جائے گا۔ ہائے......! کتنا مزا آئے گا جب میں اپنے دبئی جانے کی خبر دوں گی انہیں اور جب دبئی پہنچ کر اپنی پکس اور وڈیوز سینڈ کروں گی۔ خاص کر نیلو کو۔" وہ یہ کہہ کر جیسے لطف اٹھاتے ہوئے زور سے ہنسی۔

آبص عجیب افسردگی سے مسکرا کر رہ گیا۔ جانے وہ کس کس کے نام لے رہی تھی وہ تو کسی سے بھی واقف نہ تھا کروٹ بدلے سنتا رہا۔

"نیلو سے تو کہوں گی اس کی ساس کے سامنے مجھے وڈیو کال کرے۔ وہ خرانٹ لالچی بڑھیا تو مارے جلن ے مر ہی جائے گی۔ ہر وقت نیلو سے کہتی ہے تمہاری بہن کو تو لنگڑا شوہر ملا ہے۔ زبان ان کی ایسی کتر کتر چلتی ہے نا اب بولتی نہ بند کی نا تو میرا نام بھی ارسلہ نہیں۔"

آبص کو اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اس طرح کی گفتگو سننے کا عادی نہ تھا۔ اسے عجیب وحشت ہونے لگی۔

"اور ذرا سکندر کو بھی پتا لگے نا کہ میں کتنے عیش کر رہی ہوں۔" وہ درواز بند کر کے بیڈ کی طرف آئی۔

"یہ سکندر کون ہے۔" اس نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا۔ یہ نام وہ پہلے بھی اس کے منہ سے سن چکا تھا۔

"عقیلہ خالہ کا بیٹا، یعنی میرا کزن۔ بے چارہ مجھ سے شادی کے خواب دیکھتا تھا۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔ اس کی ہنسی میں مذاق اڑانے والا تاثر نمایاں تھا۔ پھر بیڈ پر تکیہ اونچا کر کے بیٹھ گئی۔

آبص کی نیند تو پہلے ہی اس کے دبئی جانے کی خبر اڑا دی تھی۔ وہ اس کے بنا جانے پر تیار تھی بلکہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اس بات سے قطعی غرض نہ تھی کہ اس کا شوہر اس کے ہمراہ نہیں جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب سنبھال رہا تھا۔ اس پر اس فضول گوئی نے اسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ سکندر کے ذکر پر فطری تجسس جاگا۔

"شادی۔" اس نے اس کی جانب لیٹے لیٹے کروٹ لی۔

"تو تم نے شادی کیوں نہیں کی اس سے......؟ محبت کرتا تھا پھر بھی......"

"دعوے تو کرتا تھا۔" وہ فخریہ انداز میں بولی پھر بیڈ کراؤن سے لگ کر نیم والیٹی۔ "خالہ بچپن سے مجھے بہو بنانے کی باتیں کرتی تھیں، بہت دل تھا ان کا مجھ پر اور سکندر بھی یہی چاہتا تھا۔"

"تمہیں وہاں شادی کر لینی چاہیے تھی۔ محبت تو بہت قیمتی چیز ہے ہر ایک کو کہاں ملتی ہے۔" وہ حیران تھا کہ اس نے محبت ٹھکرا دی تھی۔

"ارے شادی وہ بھی سکندر سے۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔ "آپ جانتے نہیں ہیں نا۔"

"کیا؟"

"تھا کیا اس کے پاس۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ...... ایک پھٹیچر سی بائیک اور ادنیٰ سی نوکری۔ جس پر بے چارہ خود کو سمجھتا تھا مکمل ہوں۔ فخر کرتا تھا۔ لو بھلا کس بات پر فخر۔ پھٹیچر بائیک پر یا چھوٹے سے فلیٹ یا اس عزت پر جو لس میں مل جاتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا بائیک پر بٹھا کر مجھے دنیا گھما دے گا، کمال ہے۔" وہ پھر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ سکندر کے لیے اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

آبص اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس میں سے سگریٹ نکال کر لبوں کے درمیان پھنسائی۔

اس کے لبوں سے نکلنے والی تضحیک آمیز ہنسی اور یہ جملے اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔

اس نے سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھایا اور ایک ہلکا سا کش لیتے ہوئے گھائل نظروں سے اس حسینہ کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ کاش۔ یہ چپ ہی رہ جاتی۔ تھوڑا بہت بھرم ہی رہ جاتا۔" وہ تو دبئی کے حوالے سے ہی دل گرفتہ تھا اب تو شدید ڈپریشن میں دکھائی دینے لگا۔ تیز تیز کش لگاتے ہوئے اپنے اعصاب کو درحقیقت کنٹرول کر رہا تھا۔ وہ سکندر پر ہنس رہی تھی اس کی محبت کا مذاق اڑا رہی تھی۔

کتنی کھل کر سامنے آ گئی تھی، کتنی حقیر بے توقیری عورت دکھائی دے رہی تھی اس وقت۔

وہ محبت کو کھو دینے کے غم میں مبتلا تھا وہ محبت کو کھو کر خوشی منا رہی تھی۔ وہ بنا محبت کے جینا عذاب سمجھ رہا تھا اور وہ آسودہ اور مطمئن تھی محبت سے پیچھا چھڑانے پر۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور مضمحل اعصاب کے ساتھ لیٹ گیا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر مہوش نے آبص کو اپنا دبئی جانے کا پروگرام دیا۔ ساتھ ہی افسردگی سے بولیں۔

"تم بھی ساتھ چلتے بلکہ تم دونوں ہی جاتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

"بس رہنے دیں آنٹی ان کو تو غم جاناں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ یہ کہاں لے جائیں گے۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ارسلہ بظاہر ہنس کر بولی مگر اس کے لہجے اور جملے کی کڑواہٹ جیسے میز پر موجود سب کے حلق تک میں اتر گئی تھی۔

اکبر جیلانی جز بز ہو کر رہ گئے۔

"یوں بھی میں آپ کی کمپنی میں زیادہ انجوائے کروں گی۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" مہوش زبردستی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولیں۔

"میرا تو خیال ہے رومی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ ایک عرصہ ہوا اسے بھی دبئی گئے کیا خیال ہے۔" اکبر جیلانی ماحول میں چھائے تناؤ کو کم کرنے کی غرض سے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "دبئی بھی رومی کو یاد کر رہا ہوگا۔"

"اونو پاپا...... میرا تو بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔" رومی کا لہجہ قطعی تھا۔ "یوں بھی میری فرینڈ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے مجھے تو ابھی اسے انجوائے کرنا ہے۔"

"کس کی شزاء کی۔" مہوش چونکیں پھر خوش گوار لہجے میں بولیں۔

"یہ تو گڈ نیوز ہے۔"

"او کے پھر میں چلتا ہوں۔" آبص کرسی دھکیل کر اٹھ گیا اکبر جیلانی بھی چائے کا مگ رکھ کر اٹھ گئے۔ وہ دونوں آفس جانے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ نصیر کا کا ان کے بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"آبص ہوٹل بک کرا دے گا۔" اکبر جیلانی میز سے موبائل اٹھاتے ہوئے مہوش کی طرف دیکھتے ہوئے بولے اور یونہی آبص کو تائیدی نظروں سے دیکھا۔ "کیا خیال ہے۔"

"او کے۔" اس نے فقط سر ہلا دیا اور اسٹک کے سہارے کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔ ارسلہ کی خوشی دیدنی تھی اس کا چہرہ ہوٹل کے نام پر دمکنے لگا۔

"وہاں کے ہوٹلز بھی بہت لگژری اور ایکسپینسو (مہنگے) ہوں گے ناں۔"

"ہاں، یہاں سے تو بہت ہی زیادہ۔" وہ ارسلہ کی اس معصومانہ بات پر بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکی تھیں۔

"آر یو ہیپی؟" (تم خوش ہو؟)

"بہت زیادہ۔ دل چاہتا ہے ابھی اڑ کر پہنچ جاؤں۔" وہ ایک گہری سانس کھینچ کر زور سے ہنسی، کھنک دار بادِ صبا جیسی ہنسی تھی۔

مہوش بے اختیار اسے دیکھے گئیں۔ ان کے دل میں شدت سے یہ تمنا کسی لہر کی طرح اٹھی کہ کاش یہ ہنسی آبص کا مقدر بدل دے۔ اس کے اندر کے حبس اور گھٹن کو ختم کر دے۔ ایسے ہی تازہ جھونکے کی ضرورت تھی اسے بھی۔ مگر وہ دیوانہ کھڑکی بھی تو کھولے۔ ضد کے دریچوں سے یہ کالے دبیز پردے بھی تو ہٹائے۔"

ایک دل گرفتگی ان کو اندر سے کاٹنے لگی۔

☆☆☆

وہ دبئی جانے کے لیے پیکنگ میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کپڑے لے جائے۔ کیا کیا چیزیں سامان میں ڈالے۔ وہ آبص سے الجھنے لگی کہ وہ پیکنگ میں اس کی مدد کرے۔

"کوئی مہینوں کے لیے نہیں جا رہی ہو کہ اتنا کچھ بھر کے جانا ہے۔" وہ اس کی پیکنگ دیکھ کر کچھ حیرت سے بولا۔ "وارڈروب میں گھسی مزید کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر رکھے جا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم دبئی جا رہی ہو جنت میں نہیں۔" وہ تولیہ ایک طرف ڈال کر رائٹنگ ٹیبل کی چیئر پر بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جس نے جھٹکے سے وارڈروب بند کی تھی۔

"آپ تو رہنے دیجیے۔ پتا نہیں آپ کے لیے جنت کی تعریف کیا ہے، کسے کہتے ہیں۔" وہ میک اپ اٹھا کر سفری بیگ کے اوپری حصے میں رکھتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

"شاید نادیہ ہی جنت تھی آپ کی۔ اب تو سب دوزخ ہی لگ رہا ہے آپ کو۔"

"شٹ اپ۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے جیسے اس جملے پر خود بھی سلگ کر رہ گیا۔ "ہر وقت تمہارے دماغ میں نادیہ شاہ ہی سمائی رہتی ہے، اسی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہو۔" وہ اپنے اندر غصے کے ابال کو بمشکل دبا رہا تھا۔ ایک ضرب سی پڑی تھی۔

"میرے نہیں آپ کے دماغ میں سمائی ہوئی ہے۔" وہ جلانے والے انداز میں ہنسی۔ "دیکھا جائے تو یہ گھر بھی کسی جنت سے کم نہیں ہے۔ ہر شے ہے آپ کے پاس...... ہر نعمت کتنی فراوانی ہے یہاں چیزوں کی، وہ دل کھول کر خوش رہ سکتا ہی مگر آپ ناشکرے ہیں، فضول خیالات میں پڑ کر اس جنت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ بندہ ہنسے بولے، انجوائے کرے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے جی بھر کر مزے کر لے پھر مر ہی جانا ہے۔ کم از کم یہی تو اس جنت سے منہ نہ موڑ لے۔ محبت کا کیا ہے۔ دولت ہو تو محبت پیار، دوست احباب بہت۔"

وہ جواباً سگریٹ کے کش لگانے لگا اس کی بات اس کے نادر خیالات سے اسے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اعصابی کشیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

وہ اسے کیا بتاتا محبت تو ہوتی ہی روح کا آزار ہے اس میں انسان غیر محسوس طور پر فنا ہو جاتا ہے۔ خود کو مٹا ڈالتا ہے یا محبت مٹا ڈالتی ہے اور فانی ہو جانے والے دل کو دنیا کی کیا رغبت۔ محبت کو روح سمجھنے والے کے لیے دنیا بے معنی ہی تو ہو جاتی ہے۔

"تم خوش رہو، لائف انجوائے کرو۔ میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے ہر جگہ جانے کی گھومنے پھرنے کی اجازت ہے۔" اس نے سگریٹ ایش میں دبا کر بجھا دی اور لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کرنے لگا۔ اس کا دل یک دم اچاٹ ہو گیا تھا۔

"ہاں بھئی۔ میں تو کر ہی رہی ہوں انجوائے۔ آپ کی طرح منہ لپیٹ کر تو نہیں پڑی رہوں گی۔ میرے

لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اسے بھرپور طریقے سے گزارنا چاہتی ہوں۔" وہ چمک کر بولی۔

"ہر انسان کے لیے اس کی پسند اور خوشی کا مفہوم الگ ہوتا ہے...... ضروری نہیں جو چیز یا جو بات ہمیں اٹریکٹ کر رہی ہو وہ دوسرے کو بھی کر رہی ہو۔" وہ اسٹک پر دباؤ ڈال کر کرسی سے اٹھ گیا۔ "تم زندگی کو بہت سادہ سی نظر سے دیکھتی ہو اچھی بات ہے۔" آبص نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور کرسی سے اٹھ گیا۔

"اب جا کہاں رہے ہیں۔ میری ہیلپ ہی کر دیں پیکنگ میں۔"

وہ اسے اٹھتے دیکھ کر جان گئی وہ اب اپنے اسٹڈی روم میں جائے گا یا گیلری میں جا کر سگریٹ پھونکے گا یا موبائل میں گم ہو جائے گا۔ اس آدمی کے دو ہی شوق ہیں سگریٹ پھونکنا یا موبائل میں گم ہو جانا۔

"سوری۔ مجھے تجربہ نہیں میں دبئی میں ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہا۔ مجھے پتا نہیں کیا کیا لے جانا ہوتا ہے۔ تم زیادہ بہتر سمجھ سکو گی۔ مجھے آئیڈیا نہیں ہے۔" وہ گیلری کی طرف بڑھ گیا پھر رک کر بولا۔ روحی یا مام سے لے لو ہیلپ۔"

"بس رہنے دیں۔ یہ کہیے جان چھڑانی ہے۔" وہ برا مان گئی اور پھولے پھولے بیگ میں مزید چیزیں ٹھونسنے گی۔

آبص پلٹ کر گیلری میں چلا گیا۔

"عجیب آدمی ہے۔" اس نے گیلری کے گلاس ڈور کو گھورا۔ خوش ہی نہیں ہوتا یہ شخص۔ دنیا کی نعمتیں بھری پڑی ہیں مگر اس بندے کو ان نعمتوں سے بہلتے نہیں دیکھا۔ توبہ کتنا ناشکرا ہے ہر چیز ہے اس کے پاس اور دولت اتنی جس چیز پر ہاتھ رکھ دے خرید سکتا ہے پھر بھی خوش نہیں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ خواب کی طرح ہے۔ ڈر رہی ہوں آنکھ کھلے تو سب چھن نہ جائے، خدا نہ کرے۔ وہ اپنے ہی خیال سے ڈر گئی اور سر جھٹکا اور کام نمٹانے لگی۔

کل رات اس کی فلائٹ تھی اس نے سوچا صبح وہ اماں سے مل آئے گی۔ فون پر تو اماں کو اس نے خوش خبری سنا دی تھی دبئی جانے کی۔ اماں نے بتایا تھا نیلو رکی ہوئی ہے کل ہی جائے گی۔

اس نے سوچا لگے ہاتھوں نیلو اور اس کے غریب مسکین شوہر کو بھی اطلاع خود بنفس نفیس دے گی اور ان کا بگڑتا چہرہ بھی دیکھے گی۔

اوف......! کیسے جلے ہوئے اڑے اڑے رنگ ہوں گے۔ وہ آبص کے دھیان سے نکل کر اماں اور پھر نیلو اور اس کے شوہر کے بارے میں سوچتے سوچتے کام نمٹاتی گئی۔

☆☆☆

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہو۔ عقیلہ بیگم نے اندر جھانکا مگر سکندر صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ اریبہ کے رویے پر غور کر رہا تھا، اس واقعہ نے اس کو ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔

نفسیاتی خواہشات جب سر اٹھاتی ہیں تو آدمی کو تنکے کی طرح بہا کر لے جاتی ہیں وہ بھی اریبہ کو اسی تنکے کی طرح محسوس کر رہا تھا، کمزور سا جو اپنے جذبوں کے آگے بے بس دکھائی دے رہی تھی۔ اس بچے کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو من پسند شے کو پانے کے لیے مچل رہا ہو۔ مگر اسے کیا پتا کہ اس کی من پسند شے اس کی دسترس سے بہت دور ہے وہ چھین نہیں سکتی تھی۔ چھو نہیں سکتی تھی اسے اریبہ کے رویے پر اس کے دل میں پلنے والے ان جذبات سے خوف آنے لگا تھا۔

عقیلہ بیگم کو روبرو دیکھ کر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''چائے لائی ہوں تمہارے لیے۔'' انہوں نے اسے دیکھا اور پیار سے مسکرا کر چائے کا مگ اس کے سامنے دھری تپائی پر رکھ دیا۔

''ہاں طلب ہو رہی تھی چائے کی۔'' اس نے پیر سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو کر ان کے بیٹھنے کو جگہ بنائی۔

''سوچ رہی تھی راحیلہ کی طرف ہو آؤں۔ تم چھوڑ آؤ گے مجھے۔'' وہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''اتوار بھی ہے تم فارغ بھی ہو۔''

ان کی بات پر سکندر کو اپنی کنپٹیوں پر سلگن محسوس ہونے لگی۔ اریبہ کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

''میرا تو مشکل ہے آپ کو ٹیکسی کروا دیتا ہوں۔'' وہ چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''نا بھئی۔ یہ ٹیکسی ویکسی میں مجھے نہیں جانا۔ پتا تو ہے تمہیں اکیلے رکشے میں جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ پھر کل دیکھ لیں گے۔'' وہ کچھ بجھ سی گئیں۔ ''آج اتوار تھا اس لیے سوچا کہ بھائی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ان کی خیر خیریت بھی پوچھ لوں گی۔ اور بیا کو دیکھے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔''

سکندر غیر محسوس طور پر چونک سا گیا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اریبہ کے ذکر پر اس کے چہرے پر کچھ کھوجنا چاہ رہی ہوں۔ اس نے نظریں چائے کے مگ سے اڑتی بھاپ پر جما دیں۔

''بہت یاد آ رہی ہے بیا۔ فون کرتی رہتی ہے بار بار اصرار کرتی رہتی ہے آنے پر۔'' عقیلہ بیگم بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ''کل تو کہہ رہی تھی کہ خالہ لگتا ہے آپ دونوں ماں بیٹے کو بس ارسلہ اور نیلو آپا سے ہی دلچسپی ہے مجھ سے تو بالکل نہیں ہے، میری تو کوئی ویلیو ہی نہیں ہے کہ کوئی میرے لیے بھی آئے۔ لو دیکھو ذرا۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرنا آ گئی ہیں اسے۔'' عقیلہ بیگم یہ کہتے ہوئے ہنس پڑیں ''پگلی ہے پوری''۔

سکندر کے چہرے پر پھیلنے والی سنجیدگی میں کچھ ترشی کا رنگ بھی شامل ہو گیا۔ کپ سے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کچھ سوچ کر بولا۔

''کبھی ڈانٹ دیا کریں اسے۔ چھوٹی ہے اتنی بڑی بڑی باتیں نہ کیا کرے۔ نہ سوچا کرے۔''

''خیر اتنی چھوٹی بھی نہیں رہی اب۔ سمجھ دار ہو گئی ہے خیر سے بارھویں جماعت میں آ گئی ہے۔'' عقیلہ بیگم کے لہجے میں جتانے والا تاثر تھا۔

سکندر نے نظریں چراتے ہوئے کپ تپائی پر رکھا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو خالہ کی طرف جانا ہے تو چلیں۔ تیار ہو جائیے آپ کو وہاں ڈراپ کر کے میں نکل جاؤں گا۔ ایک کام ہے وہ نمٹا لوں گا۔''

''ارے کیوں اندر نہیں آؤ گے۔''

''مطلب......'' سکندر نے ذرا سا رخ موڑا۔ اس کے انداز میں خفگی تھی۔

''باہر سے چلے جاؤ گے تو تمہارے خالو برا مان جائیں گے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ اور دونوں خالی مگ ٹرے میں رکھنے لگیں۔

''واپسی پر مل لوں گا۔'' اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔ ''میں شاور لیتا ہوں۔ اتنی دیر میں آپ تیار ہو جایئے۔'' وہ وارڈ روب کی طرف بڑھا۔

''بات سنو......!'' عقیلہ بیگم اس کے ٹالنے والے انداز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے تئیں کچھ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تم راحیلہ کی طرف جانے سے اب کترانے لگے ہو۔ وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' انہوں نے لمحہ توقف کیا پھر کہنے لگیں۔ ''ایک وجہ بس سمجھ میں آ رہی ہے۔ بتاؤں برا تو نہیں مناؤ گے۔''

وہ وارڈروب کھولتے ہوئے یک دم ہنس دیا۔

"ارے آپ اتنا سوچتی ہیں۔ خیر بتائیے کیا وجہ ہے آپ کے خیال میں۔"

"ارسلہ کو دیکھ کر تمہیں احساس کمتری تو نہیں ہونے لگا ہے۔ بہت پیسہ ہے اس کے پاس۔ دکھاوا بھی کرتی رہتی ہے وہ۔ راحیلہ بتا رہی تھی نوے ہزار کا تو موبائل لے کر گھومتی ہے ہاتھ میں، کم بخت ہمیں بھی احساس کمتری میں مبتلا کر کے چلی جاتی ہے اور یہ بھی کہہ رہی تھی ڈرتی ہوں کہیں اریبہ کے خیالات بھی نہ بدل جائیں۔ اس کا رنگ اس پر بھی نہ چڑھ جائے۔ اس کی الٹی سیدھی باتوں سے خوف آنے لگا ہے راحیلہ کو۔" خالہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

"آپ خواتین کے پاس لگتا ہے سوچنے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔ ہم مردوں کے پاس نہیں شاید۔" اس نے وارڈروب کا دروازہ کھولتے ہوئے ماں کا چہرہ دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔ رہی اریبہ کی بات تو میرا نہیں خیال وہ ارسلہ کی طرح سوچتی ہوگی۔ وہ بے ساختگی میں کہہ گیا۔

عقیلہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا پھر صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف آئیں۔

"مطلب تمہیں کیسے خبر کہ وہ ارسلہ کی طرح نہیں سوچتی ہوگی۔" وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگیں۔

سکندر کا ہاتھ ایک پل ہینگر پر ٹھہر سا گیا۔ دوسرے پل وہ شلوار سوٹ ہینگر سے نکالتے ہوئے بے پروائی سے شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

"نیلو بھی تو اس کی بہن تھی مگر خیالات بالکل مختلف۔ ہوسکتا ہے وہ بھی نیلو کی طرح سوچتی ہو۔ چلیں، یہ بے کار کی بحث ہے ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ وارڈروب بند کر کے باتھ روم کی طرف پلٹ گیا۔

"اگر ایسا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ میرے دل کو سکون ہو جائے گا۔" عقیلہ بیگم کے خیال کی سوئی تو جیسے اریبہ پر اٹک کر رہ گئی تھی۔ پھر ٹرے اٹھاتے ہوئے خود کلامی والے انداز میں بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"آج کل کی لڑکیاں تو دولت کی چمک دمک کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ رشتوں کی اہمیت ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ خدا رحم کرے اس نسل پر۔" وہ کمرے سے نکل گئیں۔

ان کی اس سکون آمیز ٹھنڈی سانس کا مطلب سکندر خوب جانتا تھا۔

☆☆☆

میکے آ کر اس نے دبئی کا بتایا۔ ابا نے خوش ہو کر دعا دی۔ اماں کی حسب عادت تان آبص پر ٹوٹی۔

"وہ کیوں نہیں جا رہا ہے ہمراہ۔ لو یہ کیا بات ہوئی ساس کے ساتھ ہنی مون مناؤ گی۔"

"انہیں سفر کرنے کا ڈاکٹر نے منع کیا ہے ابھی چند ہفتوں تک۔"

"تو چند ہفتوں بعد چلی جانا۔"

اماں مصر تھیں وہ آبص کے ہمراہ ہی جائے دبئی۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں مہوش سے کوئی پرخاش تھی بلکہ وہ ارسلہ سے نالاں تھیں کہ وہ کیسی غیر ذمہ دار لڑکی ثابت ہو رہی تھی کہ شوہر کو سفر کی اجازت نہیں اور وہ اس حال میں شوہر کو چھوڑ کر دبئی جانے کو بے چین تھی۔

"اماں بس کریں خدا کے لیے۔" ارسلہ نے جیسے ہاتھ جوڑ لیے۔ "آبص اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ ان کا مزاج لیے دیے والا ہے۔ جب میرے جانے پر انہیں اعتراض نہیں ہے تو آپ کو کیا فکر ہے خواہ مخواہ کی۔" وہ برافروختہ ہوگئی اور جھٹکے سے کرسی کھسکا کر اٹھ گئی۔

"آپ کو تو لگتا ہے میں ہر جگہ ہر وقت غلط ہی ہوتی ہوں۔ اب میری خوشی میں بجائے خوش ہونے کے

آ بس کی فکر پڑ گئی آپ بھی نا بس۔“

”اچھا چلو خیر غصہ کیوں کر رہی ہو۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی۔“ نیلو سے مل لو۔ وہ کچن میں تمہارے لیے کھانا گرم کر رہی ہے تمہارے آنے کا سن کر۔ بہت خوش ہے۔“

”مگر مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ وہ کچن میں گھسی کیا کر رہی ہے۔“ وہ ابا کے روم سے نکل کر باہر آ گئی۔

نیلو اس کے دبئی جانے کا سن کر بہت خوش تھی۔ اس نے ابا اور اماں کے لیے دستر پر کھانا لگا کر اسے بھی دو نوالے کھانے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اسے اب کہاں یہ سبزیاں دالیں حلق سے اترتی تھیں۔ وہ منہ بنا کر بولی۔

”میں اس وقت نہیں کھاتی۔ اکثر بھوک لگتی ہے تو پزا آرڈر کر لیتی ہوں۔“ وہ کرسی کھینچ کر دستر کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

”ہاں بھئی اب دال سبزی کہاں آپ کی خاطر میں لائیں گی۔“ اریبہ اسے چھیڑنے لگی۔ امی نے جلدی سے آنکھیں دکھائیں مبادا وہ خفا نہ ہو جائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر نیلو اپنی وارڈ روب سے پرانے کپڑے نکال کر اریبہ کو دے رہی تھی جب وہ اس کے پاس چلی آئی۔

”اور سناؤ نیلو، تمہارے احمر صاحب کا کیا حال ہے۔ ٹھیک ہے وہ۔“

”بہت ٹھیک ہوں میں بھی اور احمر بھی۔“

”کھانا وانا مل رہا ہے، نا تین وقت کی روٹی اور ساتھ میں محبت کی چٹنی۔“ وہ چھیڑنے لگی مگر اس کی چھیڑ میں اہانت کا انداز تھا۔ ”یا صرف روٹی رہ گئی ہے چٹنی چٹنی ہو گئی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی ہی بات سے محظوظ ہو کر قہقہہ لگانے لگی۔ اس کے خوش نما ہونٹوں سے پھوٹنے والی ہنسی سراسر استہزائیہ تھی۔

نیلوفر کے چہرے پر ایک پل تاریکی سی چھائی تھی۔ وہ اس کی کم مائیگی کا مذاق اڑا رہی تھی۔

”یہ کیا واہیات بکواس لگا رہی ہے ارسلہ۔“ امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کا جملہ سن کر خفگی سے ڈپٹا۔ ”شرم کرو۔“

”کہنے دیں امی۔ اڑانے دیں مذاق اسے ہماری کم مائیگی کا، مجھے اپنے مڈل کلاس ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔“ نیلوفر آزردگی سے مسکرائی۔ ”میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اپنی زندگی سے، اس لیے کہ تین وقت کی روٹی ہی نہیں عزت، محبت مجھے روٹی سے زیادہ سکون اور طاقت بخشتی ہے۔ احمر میرے لیے ایک گھنی چھاؤں کی مانند ہیں جس کے نیچے میں بہت آسودہ ہوں۔“ وہ تہ کیے کپڑے مسہری پر ہی ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

”ارے اسے کیا ہو گیا۔“ وہ کندھے اچکا کر ہنسی۔ ”ایسا تو کچھ نہیں کہہ دیا میں نے، لگتا ہے اسے بھی میرے دبئی جانے کا سن کر تپ چڑھ گئی ہے۔“

”بکواس بند کرو تم۔“ امی یکدم طیش میں آ گئیں۔ وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شرم کرو تم تو بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئی ہو، نہ لحاظ نہ مروت۔“

”ارے بھئی، میں نے ایسا کیا کہہ دیا آپ تو چڑھ دوڑیں مجھ پر۔“ وہ جھٹکے سے مسہری سے اٹھی۔

”چپ۔“ امی نے غصے میں آنکھیں نکالیں۔ ”چار پیسوں کا غرور دماغ میں بھر کر آئی ہو۔ یہ تمہارا میکا ہے، یہاں ماں باپ رہتے ہیں تمہارے۔ عزت اور وقار سے آیا کرو اور عزت لے کر جایا کرو۔ دولت مل جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رشتوں ناتوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ عزت سے جینا سیکھو ارسلہ...... وقار سے رہنا سیکھو۔“

”بس رہنے دیں اماں۔ ہاں نہیں تو۔ اتنا رکھ کر سنا رہی ہیں۔“ وہ تذلیل کے احساس سے تپ گئی۔ ”آپ کو

ابھی کچھ پتا نہیں ہے اماں معاشرے میں مقام پیسے سے ملتا ہے۔ پیسہ ہوگا تو عزت محبت سب مل جاتی ہے۔ میری مانیں تو بیا کی شادی بھی کسی اونچے گھرانے میں کیجیے گا۔ معاشی چکی میں پستے احمر جیسے سے نہیں۔" وہ پھر احمر پر طنز کر گئی۔ اریبہ تو خفت محسوس کر کے اماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"تم فکر مت کرو۔ بیا کی شادی کہاں کرنی ہے کہاں نہیں، مجھے زیادہ پتا ہے۔" اماں تپے تپے انداز میں کہہ کر مزید اس کے منہ لگنے کے بجائے کمرے کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں۔

"جاؤ بیا۔ کچن سمیٹ لو۔" انہوں نے اریبہ کو بھی کمرے سے باہر کر دیا۔

اریبہ پہلے ہی موقع ڈھونڈ رہی تھی فوراً سے بیشتر کمرے سے بھاگ نکلی مگر دروازے سے قدم نکالتے ہی ٹھٹک گئی۔ اماں ارسلہ سے کہہ رہی تھیں۔

"یوں بھی عقیلہ نے دبے دبے لفظوں میں بیا کو مانگا ہے سکندر کے لیے۔"

"کیا کیا کہا۔" ارسلہ بل کھا کر جیسے اماں کی طرف مڑی۔

"سکندر کے لیے بیا کو۔" وہ تحیر آمیز بے یقینی سے اماں کو تکنے لگی۔

"ہاں۔" اماں نے اس کی حیرت پر قطعاً ردعمل ظاہر نہ کیا سر ہلا کر اپنے کام میں لگ گئیں۔

ادھر اریبہ اس انکشاف کی زد میں تھی، اس کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی لپک جھپک باہر آ گرے گا پھر اماں کے باہر آ جانے کے ڈر سے جلدی سے وہاں سے ہٹ کر صحن میں رکھے موڑھے پر جا بیٹھی۔

"اماں۔ عقیلہ خالہ کو ٹکا سا جواب دے دیں تو اچھا ہے۔" وہ امی کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر حیرت کے جھٹکے سے نکلی اور ان کے پیچھے لپکی۔

"کیوں، کیوں ٹکا سا جواب دے دوں۔" اماں نے رک کر تنے اعصاب کے ساتھ رخ موڑا۔

"اریبہ اور سکندر کا کوئی جوڑ نہیں ہے بیا ابھی بہت چھوٹی ہے اور میں نے کہا نا میں کوشش کروں گی میرے سسرال میں کہیں اچھا رشتہ مل جائے بس آپ سکندر کے لیے بالکل بھی مت سوچیے گا۔" وہ ناگواری سے بولی۔ بلکہ حد سے زیادہ اس کو ناگوار گزرا تھا۔

اماں نے سر یوں جھٹکا جیسے اس کی باتوں کی اہمیت نہ ہو۔

"جب باقاعدہ پیام لے کر آئے گی عقیلہ تب سوچوں گی۔ بظاہر کوئی برائی نہیں ہے اور تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ ضرورت ہوگی تو مانگ لوں گی۔" اماں پہلے ہی نیلوفر والے واقعہ پر خفا تھیں۔ اس کی مزید یہ باتیں انہیں تپا کر رکھ گئیں۔ وہ کمرے سے نکل گئیں۔

ارسلہ نے برہمی سے دانت کچکچا کر دروازے کی طرف دیکھا پھر مسہری پر بیٹھ گئی۔

"حد ہوگئی۔ سکندر کی محبت کے سوتے اب اریبہ کی جانب بہنے لگے۔ واہ بھئی۔ شرم تو آتی نہیں ہے اسے۔ اپنے سے دس سال چھوٹی لڑکی پر نظریں ٹکائے بیٹھا ہے۔" جھنجلاہٹ اور چڑچڑے پن کا گویا اسے دورہ سا پڑ گیا تھا۔ اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ جانے سے پہلے وہ اماں سے نظریں بچا کر اریبہ کے پاس چلی آئی وہ مسہری کی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔ نیلوفر احمر کے ہمراہ جا چکی تھی۔

"سنو۔" وہ یکدم اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

اریبہ جو سکندر کے خوش کن خیال میں گم تھی اس کی آواز پر ذرا اچھل پڑی۔

"مجھے اماں کے ارادے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں بیا۔"

"کک...... کیسے ارادے۔" اریبہ نے حیرت سے سر اٹھایا۔ پھر دوسرے پل ارسلہ کی نظروں سے نظریں چرا گئی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

''سمجھائی ہوں۔ مگر ذرا پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سکندر اعظم دن میں کتنی دفعہ آتا ہے یہاں۔ بیسیوں چکر لگتے ہوں گے؟'' اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کھوجتی نظروں سے اریبہ کو گھورا۔

''نہیں وہ تو نہیں آئے یہاں۔'' وہ سٹپٹا سی گئی۔

''آپ کی شادی کے بعد وہ ایک دو بار ہی آئے ہیں۔ خالہ کو باہر سے ہی ڈراپ کر کے چلے جاتے ہیں۔'' ارسلہ نے بغور جانچتی نظروں سے اسے گھورا۔

''وہ، وہ کیا سیدھے سکندر بھائی کہو۔'' اس نے جیسے لتاڑا۔

''ج...... جی سکندر بھائی۔'' اریبہ اس کے یوں سر پر دھم سے آجانے اور انکوائری کرنے پر گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''ہوں۔ آئے گا کہاں سے۔ میں جو نہیں ہوں یہاں۔ یوں بھی میرے لیے ہی دوڑا دوڑا آتا تھا۔'' اس نے جتانے والے انداز میں ایک ہنکارا بھر کر اسے دیکھا۔ اریبہ چپ رہی۔ تاہم اسے ارسلہ کا یہ پوچھ گچھ کا انداز سخت برا لگ رہا تھا۔

''اچھا سنو۔ میں چاہتی ہوں تمہاری شادی بھی میری طرح کسی رئیس گھرانے میں ہو، ایک امیر کبیر آدمی سے۔ نیلو کی طرح کنگلا نہ ملے۔ یا سکندر کی طرح خوددار، چار پیسوں پر قناعت کرنے والا چھٹپٹی پر عمر بھر گھومنے والا نہ ملے۔''

''اب ایسے الفاظ تو استعمال نہ کریں سکندر بھائی کے لیے۔'' اریبہ سے رہا نہ گیا ان کا انداز مسلسل تذلیل کرنے والا تھا۔ جواباً ارسلہ نے ترش نظروں سے گھورا۔

''واہ، چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔ خیر میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ اماں کی کسی بات پر سوچے سمجھے بغیر سر نہ ہلا دیا کرو۔ یہ عقیلہ خالہ بھی پوری میسنی ہیں۔ انہیں اب گھر کے لیے بہو کے روپ میں ملازمہ چاہیے۔''

''اوہو آپی۔ یہ ساری باتیں آپ مجھ سے کیوں کر رہی ہیں امی سے کہیے۔ کیا مقصد ہے ان باتوں کا۔'' اریبہ جھنجلا کر رہ گئی تھی تاہم انجان بننے سے بولی۔ ''مجھے تو آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے...... عقیلہ خالہ کو بہو چاہیے...... ملازمہ چاہیے نہیں۔''

''ارے ہاں۔'' ارسلہ یک دم جیسے سر پر ہاتھ مار کر ہنس دی۔

''چلو۔ خیر ابھی میں چلتی ہوں دبئی سے آکر بات کروں گی اماں سے اور اس عاشق نامراد کو بھی ذرا ٹٹولتی ہوں۔'' وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

اریبہ نے جیسے رکا ہوا سانس کھینچا اور وہیں مسہری پر بیٹھ گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ارسلہ کو اتنا غصہ کیوں آگیا تھا۔ ابھی کون سا رشتہ ہونے جا رہا تھا اور ہو بھی جاتا تو ارسلہ کا کیا نقصان تھا۔ اور اریبہ کا فائدہ آج تک تو اس نے سوچا نہ تھا بلکہ وہ کسی کے لیے فکرمند ہونے والی شخصیت تھی نہیں۔

''خیر۔ آپی بھی اپنے طرز کا ایک ڈرامہ ہیں۔'' وہ سر جھٹک کر جلدی جلدی کام سمیٹنے لگی۔ ابھی تو کچن بھی سمیٹنا تھا اور ارسلہ والا کمرہ بھی جس کی حالت ارسلہ فقط ایک گھنٹے میں ہی بگاڑ کر رکھ جایا کرتی تھی۔

''یا خدا یہ آپا کو اس کے سسرال والے کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔'' وہ ارسلہ کے کمرے میں آکر سر پیٹ کر رہ گئی۔

☆☆☆

مہوش مارے بندھے اس کو لیے دبئی پہنچی تھیں۔ جسمانی تھکن سے کہیں زیادہ ذہنی تھکن نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ وہ تو ہوٹل پہنچتے ہی بیڈ پر پڑتے سو گئیں۔ ارسلہ حد سے زیادہ پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ گویا دبئی میں نہیں جنت میں آگئی ہو۔ ویڈیو بنا کر سب کو بھیج رہی تھی اور خصوصاً سکندر کو۔

"ہائے۔ جل کر راکھ ہو جائے گا۔ سوچا بھی نہ ہوگا کسی نے کہ ارسلہ دبئی پہنچ جائے گی۔"

وہ بیڈ کے گداز گدے پر چت لیٹ گئی۔ پھر کروٹ لے کر گہری نیند میں گم مہوش پر نظر ڈالی اور استحقاق بھرے انداز میں مسکرانے لگی۔

"اس دھوکے کا احساب سود کے ساتھ لوں گی آنٹی بیگم۔ اپاہج بیٹے کو بیاہا ہے، خراج تو دینا پڑے گا۔"

وہ اٹھ کر وارڈ روب سیٹ کرنے لگی۔

"میں نے تو ساری جگہیں گوگل پر سرچ کر لی ہیں، ہم سب دیکھیں گے۔" دوسری صبح مہوش کے ہمراہ ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے جاتے ہوئے وہ اپنے پلان بتا رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔" مہوش خوش دلی سے سر ہلا گئیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر کچھ ریسٹ کر کے مہوش کے ہمراہ نکل گئی۔ بڑے اور خوش نما مالز دیکھ کر ارسلہ کی تو آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ہر شے اپنے لیے خرید لے کئی جگہوں پر تو مہوش نے اسے کہا بھی کہ وہ آبص کے لیے بھی کچھ خرید لے۔

"آبص کے لیے کیوں؟" اس کے لہجے میں چھپی حیرت مہوش کو بہت کھلی۔

ٹیسٹر سے لپ اسٹک اٹھا کر اپنی ہتھیلی کی پشت پر چیک کرتے ہوئے اس نے یوں مہوش کو دیکھا جیسے مہوش نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔

"لو بھلا۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی ہے۔"

"کمی کی بات نہیں ہے...... وہ خوش ہوگا کہ تم نے اس کو اپنے سفر میں یاد رکھا۔ اس کے لیے گفٹ لیا۔"

"بس رہنے دیں آنٹی۔ وہ کوئی خوش وش نہیں ہوتے۔ خیر یوں بھی مجھے مردوں کی شاپنگ کا تجربہ نہیں ہے۔"

"وہ مرد نہیں شوہر ہے تمہارا۔" وہ چیخ کر بولیں۔ "یہ باتیں تمہیں سوچنا چاہئیں ہر لمحہ تمہیں اپنے شوہر کا خیال ہونا چاہیے۔"

"آنٹی پلیز۔ اب بور تو نہ کریں۔ ہم یہاں گھومنے آئے ہیں آبص کے ٹاپک کو ڈسکس کرنے تو نہیں نا۔"

اس کا لہجہ قطعی تھا۔

مہوش مزید کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہ رہیں اور چپ ہو کر اس کے ہمراہ چلنے لگیں۔ تاہم ان کا دل سخت کبیدہ ہو رہا تھا۔ یہ رونقیں انہیں ایک آنکھ نہ بھا رہی تھیں بلکہ جیسے آنکھوں میں یہ روشنیاں چبھ رہی تھیں۔ انہیں اپنے یہاں آنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔

وہ بے نیاز اپنی شاپنگ میں مست تھی۔ لگتا تھا ایک ایک لمحے سے خوشی کشید کر رہی ہو۔ تشنگی تو اس بار بھی آبص کے حصے میں آئی۔

ان کا دل کرب کے احساس سے سلگنے لگا۔ اس ٹور میں ارسلہ کی خود غرضانہ اور لالچی فطرت بھی کھل کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔ اس کے پیش نظر فقط اپنی ذات ہی تھی۔ اتنا پیسہ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔ نہ وہ آبص کے لیے کچھ خریدنے کے موڈ میں تھی نہ اپنے گھر والوں کے لیے۔

مہوش نے اسے کئی بار یاد دہانی کرائی کہ وہ اپنے والدین کے لیے بھی کچھ خرید لے۔ سفر سے آ کر خالی ہاتھ میکے جانا اچھا نہیں لگے گا۔

"چھوڑیں نا آنٹی!" اس نے لاپروائی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ مگر مہوش کی سرزنش پر ٹالنے والے انداز میں کہنے لگی۔

"اوکے میں کراچی سے کچھ خریداری کر لوں گی ان لوگوں کے لیے۔ یوں بھی انہیں کیا پتا لگے گا کہ دبئی سے لی ہے یا کراچی سے یہاں تو ہر چیز بہت مہنگی ہے۔ بلاوجہ پیسے ضائع کرنے کا فائدہ۔" وہ اپنی ہی بات پر محظوظ

ہو کر ہنس دی۔

مہوش کے اعصاب پر اس کے جملے کسی ہتھوڑے کی طرح لگے تھے اور اس کی ضرب پورا وقت ان کے دماغ میں گونجتی رہی۔ جس لڑکی کی نظر میں اس کے ماں باپ کی اہمیت عزت نہ تھی ان کا وجود کوئی معنی نہ رکھتا ہو وہ بھلا آبص کے لیے کیا مخلص ہو سکتی تھی انہوں نے اپنے میں مگن ارسلہ کو دیکھا۔ خوب صورت سراپا۔ شاندار چہرہ۔ مگر دل کس قدر بے رونق بدصورت۔

ان کا دل یک دم مکدر ہو گیا۔ کیفے ٹیریا میں بیٹھے بیٹھے وہ مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار رہیں۔ ان سے کافی بھی نہیں پی جا رہی تھی اس لیے کافی سے بھرا مگ پرچ پر رکھ دیا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھنے لگیں۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔“

”ایں۔ اتنی جلدی...... ! میرا مطلب ہے یہ جو ابھی اتنا سارا کچھ بچا پڑا ہے اسے تو پورا کریں گے نا۔“ اس نے سینڈوچ کا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے تعجب سے مہوش کو دیکھا۔

”بس جی بھر گیا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ مگر ارسلہ نہایت اطمینان سے کھانے سے انصاف کرتی رہی۔

”جی کو گولی ماریے، پیٹ بھر لیں۔ یہ ضائع جائے گا اور اتنا لمبا بل آئے گا جو آپ نے ہی دینا ہے۔“

”تم کھاؤ۔ ڈونٹ وری۔“ وہ مسکرائیں۔

”ہاں ویسے یہ پیٹ بھی عجیب شے ہے جب تک بھر نہ جائے۔ دل کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ خالی پیٹ ہو تو نہ دل لگی اچھی لگتی ہے نہ دوستی۔“ وہ کسی فلاسفر کی طرح بولی۔

”بھوک کی بھی کوئی لمٹ تو ہوتی ہوگی۔“ مہوش اسے بڑے بڑے نوالے حلق سے اتارتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

”ارے میں نے ابھی تھوڑا ہی کھایا ہے۔ یہ دیکھیں سنڈوچ بھی پورا نہیں ہوا۔“ وہ مہوش کے کہے جملے کی گہرائی نہ ناپ سکی تھی۔

”ارے۔ نہیں نہیں میں تمہیں نہیں کہہ رہی۔“ مہوش جیسے خود ہی شرمندہ سی ہو گئیں۔ بے خیالی میں جملہ پھسل گیا تھا زبان سے۔ ”تم کھاؤ آرام سے میں دو منٹ میں آئی۔“ وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔

اپنے ہاتھوں سے لائی مصیبت گلے پڑتی ہے تو سانس لینا بھی مشکل لگنے لگتا ہے۔ مہوش یونہی ٹہلنے لگیں۔

☆☆☆

ارسلہ اپنی ساری شاپنگ ایک ایک کر کے آبص کو دکھا دکھا کر اسے تھکا چکی تھی۔ وہ فقط اس کا دل رکھنے کی غرض سے دیکھتا اور سر ہلاتا جا رہا تھا۔ اسے تو یوں بھی لیڈیز شاپنگ اور ان کی خریداری سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ وہ تو اپنی شاپنگ بھی کم ہی کرتا تھا بس ضرورتاً ہی کرتا تھا۔ ارسلہ کی ڈھیر ساری یہ شاپنگ بھی اسے قطعی غیر ضروری ہی دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے کسی ایک آدھ چیز کی کھل کر تعریف کر دی۔

اس کے جہازی سائز بیڈ پر اس کا سارا سامان بکھرا پڑا تھا دونوں سفری بیگ کھلے پڑے تھے اور وہ مکمل ان چیزوں میں گھسی ہوئی تھی ایک ایک چیز کو بار بار اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

”اپنے میکے والوں کے لیے بھی کچھ خریدا یا نہیں۔“ وہ خیال آنے پر بولا۔

”نہیں۔ انہیں کیا ضرورت ہے ان چیزوں کی۔“ وہ جیولری باکس میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”تحفہ ضرورتاً نہیں دیا جاتا، محبت سے اور بھی اخلاق سے دیا جاتا ہے۔“ وہ بیڈ سے اتر گیا۔ اور پھیلاوا دیکھتے ہوئے بولا۔

”پلیز۔ یہ جلد از جلد سمیٹو میں باہر بیٹھا ہوں۔“ وہ اسٹک سنبھال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

لابی کے صوفے پر مہوش آنکھیں موندے بیٹھی تھیں آبص کو دیکھا تو سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”جاگ رہے ہو اب تک۔“ انہوں نے پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”شاپنگ دکھا رہی ہو گی نا۔“ وہ ارسلہ کی بابت کہہ رہی تھیں۔

وہ ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بہت خوش ہے وہ۔“

”ہوں۔“ اس نے ہلکے سے ہنکارا بھرا۔ ”اسے خوش کرتے کرتے لگتا ہے بہت تھک گئی ہیں آپ۔“ اس کے لبوں کی تراش میں تمسخرانہ مسکراہٹ جھلکی تھی دوسرے پل خود آزاری سے ہلکا سا سانس کھینچا۔

”چوٹ کر رہے ہو ناں۔“ مہوش نے برا مان کر اسے دیکھا۔

”نہیں، چوٹ نہیں کر رہا ہوں آپ کی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ اب کے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ سچ کہتے ہیں بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں جوڑتے جوڑتے انسان خود ٹوٹ جاتا ہے۔“

”ارے نہیں۔ وہ بہت اچھی ہے بس ابھی نیا نیا نشہ ہے۔ یہ سب اس کا خواب تھا اور خواب پورا ہوتا ہے تو کچھ عرصہ ایسی دیوانگی رہتی ہے۔ دل بھر جائے گا...... ٹھہراؤ آ جائے گا تو تمہیں سمجھنے لگے گی۔“ مہوش جلدی سے ارسلہ کا دفاع کرنے لگیں۔

”پلیز۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بولنے سے روک دیا۔ ”کیا ضروری ہے ہم جب بیٹھیں اسی ٹاپک پر بات کریں اور بھی کرنے کو باتیں ہیں ارسلہ کے علاوہ۔“

مہوش نے خاموشی سے ایک اس پر ڈالی ان کا دل افسردہ سا ہو گیا جیسے دل میں کوئی درد کا پھوڑا پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کتنا مرجھا کر رہ گیا تھا، اتنا آزردہ اور خالی تو وہ کبھی نہ لگا تھا۔ جب نادیہ شاہ سے بچھڑا تھا شاید تب بھی نہیں تب ایک امید تھی جینے کی...... اب تو آنکھوں میں گویا صحرا اتر آیا تھا۔

”اس کی باتیں بھی کرنا نہیں چاہتے زندگی اسی کے ہمراہ گزارنی ہے تمہیں۔ کیسے گزارو گے۔“ وہ چند لمحے توقف کے بعد دھیرے سے بولیں۔

”گزر جائے گی۔ اچھے دن بھی گزر ہی گئے ہیں۔ برے دن بھی گزر جائیں گے۔“ وہ مسکرایا۔

”آبص تم۔“ مہوش جیسے تڑپ سی گئیں۔

”مام پلیز۔“ اس نے انہیں کچھ کہنے سے باز رکھتے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔ ”جائیے اور ریسٹ کیجیے اور اپنی تھکن اتاریے۔ میری تھکن کی فکر نہ کریں۔ مجھے اپنی تھکن اتارنے کے لیے کسی کندھے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا انداز شگفتہ سا تھا۔

مہوش افسردگی سے ہنس دیں۔ عجیب خود آزار قسم کی ہنسی۔

”جانتی ہوں۔ تم اب مجھ سے بہت دور ہو چکے ہو۔ اپنی خوشی غم تھکن کچھ بھی مجھ سے شیئر نہیں کرو گے۔“ وہ اٹھیں اور جھک کر آبص کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”گڈ نائٹ، خوش رہو بس میری تو یہی تمنا ہے۔“ وہ پلٹ کر لابی سے نکل گئیں۔

ماؤں کی یہ محبت کی انتہا ہی تو انہیں کبھی کبھی خود غرض بنا ڈالتی ہے۔ اپنے فیصلوں کی تلوار سے کاٹ کر پھر دعائیں دیتی ہیں خوش رہنے کی۔ اس کی انگلیاں بے اختیار اپنی پیشانی کو سہلانے لگیں۔ بڑا سچا لمس تھا محبت کا مگر جانے کیوں یہ لمس اس کے دل میں سکون نہ اتار سکا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

عمارہ جہان

چابی کی گڑیا

”گڑیا، بیٹا ایک کب چائے بنا کر دو۔“

میں جو کمرے میں اندھیرا کیے آرام سے لیٹی ہوئی تھی کہ باہر سے حسن کی آواز آئی۔ میں کلس کر رہ گئی۔ حسن کو کئی بار سمجھایا تھا کہ گڑیا کو کسی کام کے لیے نہیں کہنا ہے لیکن وہ میرے سنتے ہی کب ہیں۔

جب میں باہر آئی تو وہ آرام سے صوفے پر لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میرے گھورنے پر پیچھے مڑے۔

”کیا ہوا بیگم! ایسے کیوں گھور رہی ہیں آپ؟“ ان کے لہجے میں شرارت تھی۔ میں نے بمشکل غصے کو قابو کیا۔

”آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ گڑیا سے اب کوئی کام نہ کرائیں، دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اس کے یہاں۔ آٹھ دن بعد تو وہ اس گھر سے جانے والی ہے۔“

”پھر آپ کی بہو بھی تو آ رہی۔“

وہ مجھے چھیڑنے کے لیے اس موضوع کی طرف آئے جس پر میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میری بہو۔“ میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ”آج کل کی لڑکیاں......“

”بابا! چائے۔“

گڑیا کی آواز سن کر میں خاموش ہو گئی۔

گڑیا چائے کا کپ لے کر مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ میں نے محبت سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت تھی۔

”ارے بیگم یہی دن تو ہیں جب میں اپنی شہزادی کے ہاتھ کی چائے پی سکتا ہوں، اس کے بعد کہاں اس کی ساس روز روز آنے دے گی۔“ وہ برجستگی سے بولے۔

میں ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے پھر تنگ کر رہے ہیں۔

گڑیا کی ساس میری بڑی آپا ہیں اور میں ان کے سامنے کہتی تھی۔

”دیکھنا میری بہن میری بیٹی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گی۔“

حسن ہمیشہ اس حوالے سے مجھے چھیڑا کرتے۔

www.paksitanipoint.com
Aleem

اور بلا شک وشبہ کہ آپا واقعی گڑیا کے صدقے واری جاتیں اور میرے سسرالی میری آپا کی گڑیا سے محبت دیکھ کر اکثر طعنے مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔

”شادی سے پہلے سب کے سسرالی اتنے اچھے ہوتے ہیں، جیسے تربوز کا پہلے پتا نہیں چلتا کہ پھیکا ہے یا میٹھا۔“

گڑیا کی پھوپھو ایک زوردار قہقہہ لگا کر اکثر یہ بات کہہ دیتیں اور جواباً میں ہمیشہ کہتی۔

”صحیح کہہ رہی ہیں آپ، یہ تو میرا بھی تجربہ ہے۔“

میری مسکراہٹ دیکھ کر ان کے چہرے کے زاویے بگڑ جاتے تھے۔

میں سوچوں کے محور سے باہر نکلی تو حسن کمرے میں جا چکے تھے۔ گڑیا بھی باہر لان میں تھی۔ لان کے طرف کھلتے دروازے سے میں نے اس کے لہراتے آنچل کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

ٹی وی پر ایک خاتون لہرا لہرا کر بناسپتی کوکنگ آئل کے فوائد بتا رہی تھی، میں نے بدمزگی سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی ہی بند کر دیا۔

☆☆☆

گڑیا اور بیٹے زوار کی شادی خیر و عافیت کے ساتھ ہوگئی۔ زوار کی دلہن میرے گھر آگئی اور گڑیا میرے گھر سے عدن کے ساتھ بڑی آپا کے پاس چلی گئی۔

زوار کے لیے میری اتنی خواہش تھی کہ اپنی چھوٹی بہن روبینہ کی اکلوتی بیٹی لے آؤں لیکن حسن اور زوار کی ضد پہ مجبوراً مجھے حسن کے دوست کے گھر جانا پڑا۔

ارم معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی، شکل سے تو دبوسی لگ رہی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آج کل کی لڑکیاں کتنی چلتر ہیں۔

شادی کے سات دن بڑی خاموشی سے اس کی حرکتیں دیکھتے ہوئے بڑے تحمل سے گزارے۔

آٹھویں دن میں نے سب کے سامنے کہہ دیا۔

”لو بی بی! اب تم آئی ہو تو گھر کے سارے کام سنبھالو۔ ہفتہ ہو گیا ہے، تمہارے تو چونچلے ہی نہیں ختم رہے۔ جب دل کیا پرس لٹکا کر میاں کے ساتھ چلی جاتی ہو۔ کچن کی بھی خیر خبر لیا کرو، میں کب تک پکا پکا کر تم لوگوں کو کھلاؤں۔“

میرے سخت لہجے پر حسن نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی، جسے میں صاف نظر انداز کر گئی۔ زوار کے چہرے پر ناگواری صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کو اپنی بیوی کی شان میں کہے گئے میرے الفاظ شاید پسند نہیں آئے تھے۔ میں نے سر جھٹکا، مجھے کیا۔

”شاہین! یہی تو بچوں کے انجوائے کرنے کے دن ہیں، گھومنے پھرنے دو، گھر کے کاموں کے لیے عمر پڑی ہے۔“ حسن نے شگفتہ لہجے میں ماحول کا تناؤ ختم کرنے کی کوشش کی۔

میں نے ارم کی طرف دیکھا۔ وہ میسنی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرے اندر غصے سے ایک ابال اٹھا۔ بنا کسی کی طرف دیکھے میں اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں آ گئی، پیچھے سے حسن مجھے آواز دیتے رہ گئے۔

☆☆☆

گڑیا شادی کے بعد اگلے دن دعوت پر آئی تھی اس کے بعد اس کا چکر ہی نہیں لگا تھا۔ ایک طرف مجھے اس کی فکر ہو رہی تھی اور دوسری طرف میں ارم کا سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کو کیسے گھر کے کام کاج سونپ دوں۔ اس کے انداز میں بے پروائی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن اگلے دن مجھے اپنے اندازے کو غلط ہوتے دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

اگلی صبح میں یہ سوچ کر اٹھی کہ شاید آج پھر دونوں میاں بیوی باہر گئے ہوں گے لیکن جب میں باہر آئی تو پورا گھر صاف ستھرا تھا۔ میں کچن میں آئی تو وہ چولہے کے ساتھ کھڑی تھی۔

”آنٹی! آپ جائیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی ساری چالاکیاں سمجھ میں آ رہی تھیں۔ لیکن مجھے گڑیا کی فکر لگی ہوئی تھی۔ موبائل ڈھونڈ کر میں نے اس کا نمبر ملایا۔

"بیٹا! تم تو پرائی ہو گئی ہو، چکر لگایا کرو، تمہارے بابا یاد کرتے ہیں تمہیں۔"

میں نے پیار سے اس سے شکوہ کیا۔

"جی ماما! آج ارادہ ہے، میں آج آؤں گی۔"

جانے کیوں اس کی آواز مجھے بجھی بجھی لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ میری بچی، میری جان، سب ٹھیک ہے؟" مجھے تشویش ہوئی۔

"جی ماما! سب ٹھیک ہے۔"

لیکن مجھے اس کی آواز میں پہلے جیسی کھنک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ باتوں کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ اتنے لوگوں کے درمیان رہنا شاید اسے عجیب لگ رہا ہوگا، اتنا ہجوم بھی تو کبھی نہیں دیکھا اس نے۔ یہاں کل ملا کے چار افراد اور وہاں آپا کا گھر بھرا پرا تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہوئی اور اس کے آنے کی تیاریوں میں جت گئی۔

شام کے وقت وہ گھر پر تھی۔ عدین اسے گھر کے باہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اس کے آنے سے گھر گھر لگنے لگا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میرا گھر خوشیوں سے بھر گیا ہے۔ میں محبت سے اسے تکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم چائے پیو، میں تمہارے لیے رات کے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔"

"ماما! کھانا پھر کبھی سہی، آج واپس جا رہی ہوں۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب واپس جا رہی؟" میرا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ "اتنے دن بعد تو آئی ہو۔"

"پھر آؤں گی نا۔ آپ چھوڑیں یہ باتیں۔ اتفاق دیکھیے، بھابھی کہہ رہی ہیں کہ ان کے گھر میں ان کی امی بھی ان کو گڑیا کہتی تھیں۔" وہ ارم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے ارم کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ زوار اور حسن بھی چائے پیتے ہوئے ہماری باتیں سن رہے تھے۔

"بیٹا۔ گڑیا ہونے اور کہلوانے میں فرق ہوتا ہے، تم تو بالکل گڑیا لگتی ہو۔" میں نے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

ارم کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ زوار نے ارم کی طرف دیکھا، ماحول پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

حسن کھنکارے۔

"بیٹا۔ اب تو تم اپنی ساس کی گڑیا بن گئی ہو لیکن پھر بھی روز شام کو ہماری طرف بھی ایک چکر لگایا کرو۔ تمہارے بابا کو یاد آتی ہے تمہاری، اگرچہ ہماری دوسری گڑیا نے بھی بہت زبردست چائے بنائی ہے آج۔" حسن نے بہو اور بیٹی دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"بابا! ہماری گڑیا تو اب چابی کی گڑیا بن گئی ہے اور اس کی چابی اب بڑی خالہ کے پاس ہے۔" زوار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے اسے گھورا۔

"کوئی نہیں میری بڑی آپا بہت اچھی ہیں۔"

اس لمحے گڑیا کا موبائل بجا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی، اس نے بہ مشکل مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ مجھے اس کا رنگ فق پڑتا محسوس ہوا۔ وہ فون کان سے لگا چکی تھی۔ دوسری طرف بڑی آپا تھیں اور شاید میں نے زندگی میں پہلی بار بڑی آپا کو اس قدر کرخت لہجے میں بولتے سنا تھا۔ میں شل بیٹھی ہوئی تھی۔

میری بیٹی فون کاٹ چکی تھی لیکن اس کے چہرے کی رونق بجھ گئی تھی۔

ذہن میں ڈوبتے ابھرتے کئی سوالوں کے ساتھ ساتھ زوار کی آواز میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"چابی کی گڑیا...... چابی کی گڑیا۔"

میں نے سامنے بیٹھی سانولی سی ارم کو دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی تو چابی کی گڑیا ہے۔ ہر لڑکی والدین کی گڑیا ہوتی ہے جانے کیوں دوسروں کے لیے چابی کی گڑیا ہوتی ہے، جیسے ارم میرے لیے تھی۔

☆☆

ناولٹ

گل ارباب

پریت بدلے ریت

”کیا ہوگیا ہے اس لڑکی کو؟“

وہ کن انکھیوں سے ہانیہ کو دیکھتے ہوئے مسلسل سوچوں کے الجھے ریشم کو سلجھانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ بجھی بجھی سی آنکھیں، لرزتے ہونٹ، الجھا ہوا چہرہ اور کانپتے ہاتھوں کی ایک دوسرے میں پھنسی انگلیاں۔ جو اس کی ذہنی کیفیت کی نشان دہی بلکہ چغلی کھا رہی تھیں۔

”یہ لڑکی تو آج وہ نہیں لگ رہی جو یہ ہے۔“ عفرہ نے حیرانی سے ہانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھر سوچا۔ وہ کام کاج سمیٹتے ہوئے صبح سے نوٹ کر رہی تھی کہ ہانیہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن کہتے کہتے رک سی جاتی۔ اور یہ پہلی بار ہو رہا تھا ورنہ تو وہ انتہائی منہ پھٹ قسم کی لڑکی تھی۔ بنا یہ سوچے کہ سننے والے کو اس کی بات دکھی بھی کر سکتی ہے جو دل میں ہوتا بول دینے کی عادی تھی۔ اس لیے عفرہ حیران تھی کہ ایسا کیا ہوا ہے جو ہانیہ اسے بتاتے ہوئے جھجک رہی ہے۔

”یقیناً کوئی بڑا مسئلہ ہوا ہے۔“ مختلف قسم کے خدشات تو اس کے دل میں پنجے گاڑھ چکے تھے لیکن جو پگھلا ہوا سیسہ اس نے عفرہ کی سماعتوں میں انڈیلا تھا اس کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی پہلے تو سماعتوں کا دھوکا لگا لیکن ہانیہ کی کیفیت اس کے بولے ہوئے کی تصدیق کر رہی تھی۔

”ہانیہ! کیا بات ہے گڑیا؟ میں بہت دیر سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہتے کہتے کوئی ڈر تمہیں روک دیتا ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ ”دیکھو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہاری بھابھی ہی نہیں بلکہ بڑی بہن اور دوست بھی ہوں تم اپنی سہیلی کو سب کچھ بتا سکتی ہو...... دل پر جو بھی بوجھ ہے اتار کر میرے حوالے کر دو۔ بظاہر تو بہت نازک سی ہوں لیکن میں سارے بوجھ اٹھانے کی سکت رکھتی ہوں۔“

ہانیہ کی آنکھوں میں دھند سی پھیل گئی تھی۔

”بھابھی! میرا دم گھٹنے لگا ہے ندامت اور شرمندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا دل اب یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ سسکنے لگی۔

”سنو ہانیہ! یہ تو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ جب جوان لڑکی ایسی باتیں کرنے لگے تو یقیناً بوجھ پتھر کا نہیں پہاڑ جتنا بڑا اور بھاری ہوتا ہے اور پہاڑ کو دل میں چھپانا بھی ممکن نہیں تو اب بول دو جلدی سے میرے سارے کام پڑے ہیں۔“ وہ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو ہانیہ نے ایک لمبی سانس لے کر جیسے بکھرا ہوا حوصلہ مجتمع کیا۔

”بھابھی! مجھے اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں نے...... میں نے...... بہت مجبور ہو کر چھ مہینے پہلے اپنی مرضی سے نکاح کر لیا تھا۔“ لرزتے کانپتے لہجے میں یہ جملہ کہتے ہوئے اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی یقیناً سینے میں چبھ رہی ہوگی۔

عفرہ کے سر پر جیسے اچانک ہی چھت آ گری تھی، وہ اپنے چکراتے سر کو جھٹک کر اس کے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے قریب رکھی کرسی کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔

ہانیہ جواباً جس رویے کی توقع کر رہی تھی وہ اب

دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے جھکی ہوئی نظریں بمشکل اٹھائیں اور بھابھی کے چہرے پر پھیلے صدمے اور بے یقینی کے جذبات دیکھ کر مزید شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

"بھابھی! پلیز خود کو سنبھالیں...... اور یہ بھی تسلیم کرلیں کہ جو آپ سن رہی ہیں میں وہی بول رہی ہوں۔ مجھ سے یہ جرم ہوگیا ہے اب مجھے سزا دیں یا معاف کردیں یہ آپ کا ظرف ہے۔"

ہانیہ نے اپنی بڑی بھابھی جسے وہ ماں کہتی تھی کے ٹھنڈے یخ ہاتھ پکڑ لیے تھے اور بات ختم کرکے یوں ہانپنے لگی۔ جیسے بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔ بھاگ تو رہی تھی وہ اپنے خدشات اور غیر یقینی خیالات کے سایوں سے لیکن اچھی طرح جانتی تھی کہ انسان جتنا بھی تیز ہو تقدیر کی گرفت سے نہیں نکل سکتا

ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ جب بندہ تقدیر سے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوششیں بے سود ہی ثابت ہوتی ہیں۔

''تم ...... تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟'' عفرہ نے ہانیہ کے چہرے پر پھیلی پچھتاوے کی تاریکی میں سے آس کا جگنو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ضبط کھو بیٹھی۔

''بھابھی۔ کاش یہ سب جھوٹ ہوتا ...... کاش میں نے یہ غلطی نہ کی ہوتی ...... کاش! یہ سب خواب ہوتا اور آنکھ کھلتے ہی میں شکر ادا کرتی رب کا کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔'' وہ سسکتے ہوئے ان کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔

''ہانیہ حسن خان! جن لڑکیوں کی زندگیوں میں اتنے کاش اکٹھے ہو جائیں انہیں جینے کا حق نہیں دیا جاتا بلکہ ہمارا معاشرہ تو انہیں پچھتانے کا موقع دیے بغیر ...... صفائی کا حق دیے بغیر سزائے موت سنا دیتا ہے۔''

وہ عفرہ کے سرد لہجے اور غصیلی نظروں کی تاب نہ لا کر مزید تڑپنے لگی۔

''تو ٹھیک ہے گھونٹ دیں میرا گلا ...... مار دیں مجھے۔ مجھ جیسی لڑکی کو واقعی جینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ میرے عزت غیرت والے بھائی کی عزت کے جنازے سے پہلے میرا جنازہ اٹھ جانا چاہیے۔'' وہ آنسوؤں کے دریا پر حتمی فیصلے کا بند باندھ چکی تھی اور اب سزائے موت کے منتظر قیدیوں کی طرح پھانسی گھاٹ پر جانے اور پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار تھی۔

''ٹھیک ہے آپ میرے قتل کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتیں نا؟ تو یہ لیں اس پڑیا کو میں پانی میں ڈال کر لاتی ہوں بس اتنا کیجیے کہ میرے منہ سے یہ گلاس لگا دیں ...... میں نہیں چاہتی میرے کیے کی سزا کے طور پر مجھے ابدی زندگی کی بخشش کے لیے ترسنا پڑے ...... خودکشی کرنے والے کو کبھی معافی نہیں ملتی ...... جیسے اس دنیا میں بہن بیٹی کو اپنی مرضی کرنے پر معافی نہیں ملتی۔'' اس نے اپنی شفاف ہتھیلی عفرہ کے سامنے پھیلا دی جس پر شاید چوہے مار دوا کی پڑیا رکھی ہوئی تھی۔ وہ عفرہ کے چہرے پر پھیلے سکوت سے گھبرا کر تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔

عفرہ کا دل خدشات کے بوجھ تلے دبنے لگا اسے سینے میں گھٹن محسوس ہونے لگی اس قدر گھٹن کہ سانس رک سا گیا۔

''یا اللہ خیر۔'' اس نے ہانیہ کی آنکھوں سے جھانکتی دیوانگی دیکھ کر بے اختیار رب کو پکارا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بھاری قدموں کو اٹھا کر اس کے پیچھے جاتی اگلے ہی لمحے وہ ہاتھ میں گلاس پکڑے تیزی سے تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ لیں اتنا احسان تو کر ہی سکتی ہیں نا؟'' وہ گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا کر پوچھ رہی تھی۔

عفرہ نے دیکھا اس کی اکلوتی چھوٹی نند جسے اس نے ہمیشہ چھوٹی بہنوں والا لاڈ پیار دیا تھا اور جس کی ہر قسم کی جائز ناجائز فرمائشیں پوری کی تھیں آج اس سے موت مانگ رہی تھی۔

''کیسے دے دوں میں اسے زندگی سے نجات؟ اپنے ہاتھوں سے جس پھول کی آبیاری کی ہے اسے۔''

''بس اک آخری احسان کر دیں بھابھی۔ مجھے حلال موت بخش دیں میں حرام موت نہیں مرنا چاہتی یہ دوا مجھے پلا دیں پلیز۔'' وہ باقاعدہ اس کے پاؤں پڑ گئی اس کے ہاتھ میں پکڑے گلاس میں سے بدبو کا بھبکا سا اٹھا اور فروا کا سر چکرانے لگا۔

''ادھر دو یہ زہر اور پاگل پن کی باتیں نہ کرو۔'' اس نے نند کے ہاتھ سے وہ گلاس لیا اور واش روم کی طرف بھاگی۔ ہانیہ اس کے ہاتھ سے گلاس چھیننے کے لیے بڑھی لیکن جب تک وہ اس کے پیچھے جاتی عفرہ نے صحن کے کونے میں بنے واش روم کے کموڈ میں جلدی سے پانی بہا کر گلاس بھی ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ اس دوران عفرہ کے ہاتھ پر چند

قطرے اس پانی کے چھلک کر گرے تھے اور اب وہاں کی جلد یوں جلنے لگی تھی کہ جیسے کسی گہرے زخم پر مرچیں ڈال دی گئی ہوں۔

عفرہ نے بیسن میں ٹھنڈے پانی کا نلکا کھول کر کر ہاتھ پر پانی بہانا شروع کر دیا۔

''اف کس قدر تکلیف دہ موت ہوتی ہوگی یہ دوا کھانے والوں کی۔'' وہ جلنے والی جگہ پر ٹوتھ پیسٹ کا لیپ کرتے ہوئے افسوس سے سوچ رہی تھی۔

''یہ کیا کر دیا آپ نے؟ میرے فرار کا راستہ بھی بند کر دیا۔ وہ واش روم کے دروازے میں کھڑی سسک رہی تھی۔

''چند منٹوں کے تڑپنے کے بعد مجھے اس بد صورت زندگی کی ہمیشہ کی تڑپ سے نجات مل جاتی۔'' دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکتے ہوئے اس نے کہا تو فروا اسے کندھے سے پکڑ کر باہر لے آئی۔

''آہستہ بولو ہانیہ! آس پاس کے لوگوں نے جوان لڑکیوں کی آوازیں سن کر افسانے بنانے ہوتے ہیں اور کوئی بھی افسانہ تمہارے بھائی کی زندگی ختم کر دے گا پلیز مجھ پر اور اپنے اکلوتے بھائی پر رحم کر لو۔''

وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''جب تم نے اپنی پسند سے نکاح کر لیا ہے تو پھر کم سے کم تمہاری زندگی تو بد صورت نہیں ہونی چاہیے؟ بیٹھو اور مجھے شروع سے سب بتاؤ۔''

عفرہ نے دیکھا اس نے پانی کا گلاس یوں خالی کیا جیسے وہ صدیوں سے پیاسی ہو۔

''بھابھی! یوں لگتا ہے جیسے گلے میں کانٹے ہی کانٹے اگ آئے ہیں، شاید کڑی دھوپ میں روہی کا چولستان میرے اندر جل رہا ہے۔ میں جو اس گلستان کی تتلی تھی رنگوں و خوشبوؤں کو چھوڑ کر تھوڑی سی چھاؤں کے لیے بھی ترس رہی ہوں۔''

وہ ہنستی مسکراتی لڑکی آج پہلی بار ایسی باتیں کر رہی تھی۔

''تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟ اور کس سے نکاح کر لیا اور...... اور کیوں؟''

عفرہ ہانیہ کے سامنے بیٹھی جواب طلب کر رہی تھی اس کے بیڈ روم میں روشنی کم تھی اسے مدہم لائٹس اچھی لگتی تھیں۔ بیڈ روم میں کھڑکیوں پر پڑے دبیز پردے باہر سے آنے والی روشنی کو یوں اپنے اندر چھپا لیتے تھے جیسے اسفنج پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ہانیہ اسی نیم تاریک کمرے میں رکھی صوفہ چیئر پر بیٹھی تھی اور عفرہ اس کے مقابل کارپٹ پر بیٹھی تجسس اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں اس کا منہ تکتی جا رہی تھی۔

''اس کا نام اسفندیار ہے وہ مجھے ایک سال پہلے ملا تھا۔ دوسرے شہر سے مائیگریشن کرا کے ہماری یونی آیا تھا۔ ایک سال سینئر تھا مجھ سے۔''

وہ چپ ہوئی تو عفرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آگے کی کہانی سناؤ اور جلدی کرو کیونکہ صارم کے آنے کا وقت ہے۔''

وہ بھی وال کلاک کی طرف پریشانی سے دیکھنے لگی۔

''ہم دونوں اتفاق سے ملے اور ہمیں ایک دوسرے میں ایسی کشش محسوس ہوئی کہ بار بار ملنے لگے...... میں نے اسے جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ آپ اور بھیا ضرور اور میرے اچھے فیصلے کو بخوشی قبول کر لیں گے...... میں آپ کو اور بھیا کو اس کے بارے میں بتانا بھی چاہتی تھی...... لیکن وہ یہی کہتا تھا کہ ابھی وقت نہیں ہے ہیں ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی نہ ہی میری کوئی جاب ہے...... گھر والوں سے میں نے منگنی کی بات کی تو انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میری والدہ نے کہا کہ پہلے دونوں بہنوں کی شادی ہوگی پھر تمہاری شادی کروں گی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی والدہ کبھی نہیں مانیں گی۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی تھی اور یونی کا آخری سال چل رہا تھا۔'' ہانیہ کی آنکھوں میں

پچھتاوے کے آنسو تھے۔

عفرہ اپنی معصوم صورت والی نند کی طرف دیکھتے ہوئے مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں نہ سمجھ سکی کہ اس کے دل میں اور زندگی میں کیا چل رہا ہے۔

گاڑی کے ہارن نے دونوں کی رنگت متغیر کردی۔

''اوہ صارم آگیا ہے..... میرے خیال میں تم اپنے کمرے کی طرف جاؤ اس نے پوچھا تو میں کہہ دوں گی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ بھابھی کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھتی ہوئی تیزی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر سی گئی۔

☆☆☆

''میں تمہارے عشق میں مجنوں ہو کر اپنی ذات کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں مجھے اپنا آپ نہیں مل رہا..... میں آپ میں خود کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔ مجھے مجھ سے ملا دیں ہانیہ حسن خان۔'' وہ اس کے سامنے سراپا سوال بنا اپنا آپ مانگ رہا تھا۔

وہ تو ہانیہ حسن خان تھی جس کے حساس دل سے سبھی واقف تھے اس کے در سے تو کبھی کوئی بھکاری کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔ بچپن سے دیالو تھی۔ کوئی سہیلی کہتی۔ ''ہائے ہانیہ۔ یہ پاؤچ کتنا پیارا ہے۔'' تو وہ اسی وقت پاؤچ میں سے پیسے وغیرہ نکال کر اسے دے دیتی۔ کوئی کلاس فیلو نئے اسکول بیگ کی تعریف کر دیتی تو اسکول سے واپسی پر ماں دیکھتی اس نے اپنی کتابیں پلاسٹک کے شاپنگ بیگ میں رکھی ہوتیں اور پوچھنے پر نہایت معصومیت اور لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہتی۔

''اب سہیلی کو تحفہ بھی نہ دوں کیا؟ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ تحفے دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ اب محبت کو بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھتی رہیں۔''

لیکن اس بار تو وہ تحفے میں اپنا آپ نہیں دے سکتی تھی۔ ہاں ایک عجیب بات ہوئی تھی اس دیالو لڑکی کے ساتھ کہ پہلی بار اسے بھی کوئی اتنا اچھا لگا تھا کہ ہمیشہ دینے والی چپکے چپکے رب سے اس خوبرو نوجوان کو مانگنے لگی تھی۔

محبت انسان کو رب کے کتنا قریب کر دیتی ہے اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ وہ نماز پڑھتی تھی مگر پابندی سے نہیں۔ کبھی فجر نیند کی وجہ سے چھوٹ جاتی تو کبھی عشا تھکاوٹ کی وجہ سے۔ لیکن اب تو ہر سجدہ حاضری ہوتا۔ اپنی عرضی مالک کے سامنے رکھنے کا موقع وہ بالکل نہ گنواتی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ کبھی تو اس کی عرضی پر بھی ہاں لکھ دی جائے گی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ہاں تو اس کی تقدیر کی کتاب میں لکھی جا چکی تھی اس وقت سے جب وہ دنیا میں آئی بھی نہ تھی۔

''میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں ہانیہ حسن خان..... مجھے لگتا ہے میری آتی جاتی سانسیں کہانیاں ہیں اور آپ ہر کہانی کی ابتدا بھی ہو اور انتہا بھی..... جس دن آپ سے دور ہوا ہر کہانی بھی ختم ہو جائے گی۔'' اس کا لہجہ سچائی کا گواہ تھا۔ ''کیا آپ کو میرے لہجے کی سچائیوں کا احساس نہیں ہوتا؟'' وہ اداس تھا۔

''بعض اوقات گواہ جھوٹی گواہی بھی تو دیتے ہیں۔'' وہ نظریں اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں پر جمائے لرزتی آواز میں جواب دیتی۔

''میں ہر طرح کی سچائی کا ثبوت دینے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتا۔ ''اظہار کے چند لفظوں کی طلب نے میرے سارے وجود کو کشکول بنا دیا ہے ہانیہ حسن خان۔ آپ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ بہت دیالو ہیں۔ کیا یہ کشکول آپ خالی لوٹا دیں گی؟'' وہ سراپا سوال بن کر کہتا تو وہ اک ٹھنڈی سانس لے کر اندر اٹھتے طوفان پر مصلحتوں کا بند باندھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی۔

''اظہار عورت کو بے وقعت کر دیتا ہے۔ میں جو آپ کے ساتھ ہوٹل کے ایک نیم تاریک کونے میں چائے پیتے بیٹھی ہوں اپنے بھائی کی عزت کی گٹھڑی کو سر سے اتارے ہوئے..... تو اس کا

مطلب یہ ہی ہوا کہ وہ خواہش جو آپ کے دل میں طوفان بپا کیے ہوئے ہے اس کی لپیٹ میں میرا وجود بھی آچکا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

چند لمحے تو اسفندیار کو یقین ہی نہ آیا کہ یونیورسٹی کی حسین ترین اور مغرور لڑکی اس کے سامنے یوں اپنا آپ کھول رہی ہے۔

"مجھے ہمیشہ کے لیے اپنانا ہے تو گھر والوں کو جلد سے جلد بھیجیں...... میرے بھیا اور بھابھی میری ہر خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ ان کی شادی کو بارہ سال ہو چکے ہیں اور ان کی کوئی اولاد نہیں ہے ماں کے مرنے کے بعد وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں باپ بچپن میں ہمیں چھوڑ کر اس دیس جا چکے ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند پھیل چکی تھی۔

"مجھ سے بڑی دو بہنیں ہیں متوسط طبقے سے تعلق ہے ماں اور دونوں بہنوں کی واحد امید میں ہوں اسی لیے ان کا ہر خواب میری ذات سے جڑا ہوا ہے...... میں امی سے بات کروں گا تو وہ انکار نہیں کریں گی۔"

وہ خیالوں کی سحر انگیز دنیا کی سیر کرتے ہوئے خوش فہمیوں کے جھولے میں جھول رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ حقیقت کی تلخیاں تو ابھی انہوں نے چھکلیں ہی نہیں۔

وہ جب بھی گھر جاتا واپسی پر تسلی کی سوغات ساتھ ضرور لاتا تھا۔

"اسفند! میرے رشتے آرہے ہیں۔ پلیز! جو بھی کرنا ہے جلدی کریں۔ بھیا اور بھابھی بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ڈگری لیتے ہی میری شادی کر دی جائے گی۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے انہوں نے خاندان میں ہی کہیں میری بات طے کر رکھی ہے۔"

وہ اپنی پریشانی اس پر ظاہر نہیں کرتا تھا لیکن اس طرح کی باتوں کے جواب میں وہ الجھ سا جاتا تھا۔

"اگر میرے گھر والے نہ مانے تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گی؟"

ہانیہ کا دل اس سوال پر تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔

"مجھ سے صاف صاف بات کریں۔ ایسا کیا ہوا ہے کہ آپ جب سے واپس آئے ہیں الجھے الجھے نظر آرہے ہیں؟"

"اماں سے شادی کی بات کی تو وہ بگڑ گئیں۔" وہ شرمندگی سے بول رہا تھا۔

"لیکن انہیں کیا اعتراض ہے؟" ہانیہ کا بھی پریشان ہونا لازم تھا۔

"وہ کہتی ہیں پہلے بہنوں کی شادیاں ہوں گی پھر اس کے بعد میں اپنی مرضی سے سے تمہاری شادی کروں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دکھتے ہوئے سر کو پکڑ کر بولا تو ہانیہ نے مایوسی سے سوچا۔

"اب تو یقیناً جدائی کے علاوہ دوسرا کوئی رستہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

وہ شاید اس کی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر دیکھ چکا تھا۔ اسی لیے جلدی سے بولا۔

"یوں جدائی کی باتیں مت کرو ہانی...... بدن سے روح جدا ہو جائے تو یقینی موت ہوتی ہے۔"

"اسفند! اب ہمیں مرنے جیسا جینا پڑے گا۔"

"تم فکر مت کرو میں ایک بار پھر اپنی ماں کے پاؤں میں سر رکھ دوں گا۔ اور رو رو کر تمہیں ان سے مانگوں گا۔ ہمیشہ میرے آنسو میری ماں کا دل میرے لیے نرم کر دیتے تھے لیکن جانے اس بار ایسا کیوں نہیں ہو رہا کہ میں ماں کے سامنے رو رو کر کہتا رہا مجھے ہانیہ دے دیں میں اس کے بعد کوئی خواہش نہیں کروں گا...... اور وہ یہ سب سن کر مسلسل انکار کرتی رہیں۔"

وہ مرد ہو کر رو رہا تھا۔ محبت کا موتی اس کی آنکھ سے گرا اور ہانیہ نے وہ انمول موتی اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپا لیا۔

"مطلب بچھڑنے میں صرف تین مہینے رہ گئے ہیں؟"

اس کی بات نے اسفند کو مزید پریشان کر دیا۔

"یہ کبھی بھی مت سوچنا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے...... کم سے کم میں موت سے کم میں جدائی کا سودا ہرگز نہیں کروں گا۔" اسفند کا لہجہ مضبوط ہوتا۔

"اب باتوں کا وقت نہیں بچا ہمارے پاس۔" وہ بھی تو اس کے بغیر ادھوری تھی اس لیے چاہ رہی تھی کہ اب مکمل ہو جائے۔

"میں بھیا بھابھی سے بات کروں گی تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ اسفند کے گھر والے رشتے کی بات کرنے آجائیں۔"

وہ شرمندہ تھا اس لیے نظریں جھکا لیں۔

"یقیناً لڑکیوں کے والدین یا گھر والے خاندان سے باہر جب رشتے کرتے ہیں تو یہ سب ضروری ہوتا ہے۔" وہ پرسوچ انداز میں اسے دیکھ کر بولا تو تو ہانیہ بھی چپ ہو گئی۔

☆☆☆

"شوہر کے سو جانے کے بعد وہ چپکے سے باہر نکل آئی۔ یہ حرکت خلاف معمول تھی کیونکہ جب میاں گھر آجاتے تب وہ مکمل ان کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ ان کی گھر آمد سے پہلے ہی سارے کام ختم کر کے وہ تیار ہو جاتی ان کی پسند کا کھانا دوپہر میں ہی بنا کر رکھا ہوتا تھا اسے ان عورتوں سے چڑ تھی جو شوہر کے آنے کی منتظر رہتیں اور شوہر کو دکھا کر گھر کا کام کرتیں جیسے احسان کر رہی ہوں۔

"ہانیہ! دروازہ کھولو پلیز۔" عفرہ نے دستک کے جواب میں مسلسل خاموشی سے گھبرا کر اسے پکارا۔

"بھابھی! پلیز۔ آپ بھیا کے پاس جائیں انہیں شک ہو جائے گا۔" ہانیہ نے دروازہ کھول کر کہا تو عفرہ نے اطمینان کا سانس لیا اور اسے نرمی سے دروازے سے ہٹا کر اندر داخل ہو گئی۔

"میں سخت پریشان ہوں ہانیہ...... مجھ سے اس سوال کی چبھن برداشت نہیں ہو رہی جس کا جواب تم نے مکمل نہیں دیا ابھی تک۔" عفرہ صوفے پر بیٹھ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ وہیں بھابھی کے قدموں میں پڑی قالین پر بیٹھ گئی۔

"بہت ساری باتیں آپ سے کرنی ہیں۔ بھابھی، شاید آپ میں سننے کی تاب نہ رہے۔ لیکن میں نے اپنی روح پر سے یہ بوجھ ہٹانا ہے ہر صورت میں۔" وہ عفرہ کی گود میں سر رکھے آگے کی کہانی سنانے لگی۔

"وہ بہت اچھا ہے لیکن مجبور ہے۔"

اس کے لہجے میں مان تھا...... محبت تھی وہ محبت جو کبھی عورت کا ہاتھ پکڑ کر کانٹوں پر چلنے کا حوصلہ بن جاتی ہے تو کبھی زخم زخم پاؤں پر تسلی کا مرہم بن کر سفر کے درد کو کم کر دیتی ہے۔

محبت منزل کی جستجو میں رواں مسافر کے دل سے سارے خوف نکال دیتی ہے زاد راہ کی پروا نہیں کرنے دیتی۔

"اچھے لوگ دوسروں کی بیٹیوں کو یوں رسوا نہیں کرتے...... یہ محبت نہیں ہوس ہے...... جو بیٹیوں کو بغاوت پر اکساتی ہے۔" عفرا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں وہ ہوس کا پجاری نہیں ہے وہ تو محبت ہی محبت ہے آپ اس سے ملیں گی تو میری پسند کی داد دیں گی۔" ہانیہ کے لہجے میں فخر اور مان تھا۔

"کاش! تمہاری آنکھوں پر سے محبت کی پٹی اترے تو تم حقیقت کا اصلی چہرہ دیکھ پاؤ...... کوئی بھی مرد اتنا کمزور نہیں ہوتا...... جتنا وہ ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ آسان ہدف لڑکی ہی ہوتی ہے...... وہ سب کر سکتا تھا ذرا سی مستقل مزاجی اور ضد کرنی پڑتی۔ لیکن تم نے اسے آسان راہ سے خود تک رسائی دے دی تھی تو وہ کیوں مشکل راہ پر چلتا؟"

وہ چند پل کے توقف کے بعد اس کے الجھے چہرے پر نظریں جمائے اپنے اندر اٹھتے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں بولی۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کرلیا تھا تو اب مجھے بتانے کی نوبت کیوں آئی ہے؟"

ہانیہ نے پہلی بار اپنی بڑی بھابھی کا سپاٹ لہجہ سنا تھا۔ ورنہ تو وہ جب بھی اس سے مخاطب ہوئی تھی اس کے لہجے کا شہد ہانیہ کی سماعتوں میں مٹھاس بھر دیتا تھا۔

"اب بھگتو اپنے کیے ہوئے اتنے بڑے فیصلے کی سزا۔" ہانیہ نے پچھتاوے اور افسوس سے سوچا۔

"اس نے ہر ممکن کوشش کی اپنے گھر والوں کو منانے کی لیکن اس کی ماں بہت ہی ضدی قسم کی خاتون ہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آپ اور بھیا میری پسند کو اپنی پسند بنا کر ہم دونوں کو ایک کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ لیکن ہم دونوں اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اگر اکیلے اسفند آپ کے پاس رشتہ مانگنے آتے تو آپ لوگ ہرگز قابل اعتنا نہ سمجھتے۔ ہم دونوں کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک بار جدا ہوئے تو پھر کبھی مل نہ پائیں گے۔"

"افسوس کہ یہ تم لوگوں کے خود ساختہ خدشات تھے۔" وہ ہانیہ کی بات کاٹتے ہوئے افسوس سے بولی تو ہانیہ نے سر جھکا لیا۔

"ہم دونوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب ہمیں وت ہی ایک دوسرے سے جدا کرسکے گی۔ ہم نے نیا کی کسی رکاوٹ کے سامنے ہار مان کر رکنا نہیں ہے۔"

"اب کیا ہوا ایسا کہ تم اس فیصلے کو بوجھ سمجھنے لگیں؟" وہ اپنے سوال کا جواب اس کے اداس ے پر بدستور کھوج رہی تھی جبکہ وہ شش و پنج کی یت میں انگلیاں مروڑے جارہی تھی۔

"میں نے طبیعت کی خرابی پر چند دن پہلے ٹ کرایا اور پریگنسی ٹیسٹ پازیٹیو آیا ہے۔" ہانیہ ی آواز اتنی دھیمی تھی کی عفرہ کو اپنی سماعتوں کا پورا ور لگا کر سننی پڑی۔

"اوہ میرے خدایا۔" عفرہ کی حالت یہ سن کر خراب ہوگئی اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں قریب رکھی پانی کی بوتل سے منہ لگالیا۔

"پلیز۔ بھابھی۔ کچھ کریں میں بہت ڈری ہوئی ہوں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہورہا۔"

اس کی فریاد سن کر عفرہ کا جی چاہا تھپڑ مار مار کر اس کا منہ لال کردے۔ وہ شدید غصے پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہوچکی تھی۔

"اللہ بیٹیاں دیتا ہے تو کاش تھوڑی سی عقل بھی دے دے ان کو۔ یوں گھر والوں کو بے عزت تو نہ کرایا کریں...... اب کس کس کو نکاح نامہ دکھا کر اس بچے کو جائز ثابت کروگی؟" دونوں رو رہی تھیں۔

عفرہ نے خود پر قابو پانے کے لیے واش روم میں جاکر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور واپس آکر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اب کیا کروگی؟"

وہ چپ تھی۔

"وہ کیا کہتا ہے؟" عفرہ نے کچھ توقف کے بعد پوچھا تو ہانیہ کے چہرے پر پھیلا جامد سناٹا مزید گہرا ہوگیا۔

"وہ کھوگیا ہے بھابھی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکنے لگی۔

"کیا مطلب کھوگیا ہے؟" عفرہ نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہ اس کا فون مل رہا ہے نہ کوئی خیر خبر۔" وہ بھیگے لہجے میں بولی تو عفرہ نے صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھا۔

"تو اس کے کسی دوست یا گھر والوں سے معلوم کرونا۔"

"بھابھی مجھے اور کچھ پتا نہیں ہے بس یہ جانتی ہوں کہ وہ کس شہر میں رہتا ہے۔ اور اس کے فون نمبر کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتی نکاح میں اس کے جو دوست شامل تھے وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔" وہ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کررہی تھی۔

"پہلے بھی کبھی اس نے اس طرح کیا ہے؟"

مطلب اچانک رابطہ منقطع کر دینا؟''

وہ تیزی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''کتنے دن ہو گئے اس سے رابطہ ختم ہوئے؟''

''آج پورے بیس دن ہو گئے ہیں کہ میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی نہ ہی اس کی کوئی کال آئی ہے۔''

''کتنے دنوں کے بعد تم لوگوں کی بات ہوا کرتی تھی؟''

''دن میں بیس بار بھی۔''

اس کی بات سن کر عفرہ کو اپنی بے خبری پر بہت افسوس ہوا۔ وہ تو اسے فون پر مصروف دیکھ کر یہ سمجھتی تھی کہ سہیلیوں کے ساتھ اسٹڈی ڈسکس کر رہی ہے۔

''اب کیا سوچا ہے کہ آگے کیا ہوگا؟''

بھابھی کے اس سوال پر وہ ایک بار پھر بکھر سی گئی۔

''مجھ میں اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی تو میں اتنے بڑے فیصلے یوں جلدی میں کبھی نہ کرتی۔''

وہ اعتراف کر رہی تھی مگر اب کیا فائدہ؟ عفرہ افسوس سے اسے دیکھنے لگی۔ الجھے بال سوجی ہوئی آنکھیں زرد چہرے پر پھیلے خدشات کے سائے اور جھکا ہوا سر...... گالوں پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کے نشان۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہ کیوں اس طرح گم ہو گیا ہے؟''

وہ جواباً خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

''مجھے اس سوال کا جواب اچھی طرح سے معلوم ہے لیکن میں پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہ رہی ہوں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ تم کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں ہو۔ کیوں کہ جو بات سامنے نظر آرہی ہے اسے تم کسی صورت بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو سکتیں۔ کیا تمہیں سامنے ہی یہ حقیقت نظر نہیں آرہی کہ وہ لڑکا تمہیں بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر خود غرضی کی کشتی پکڑے بھاگا ہوا ہے؟''

وہ سر جھکائے بیٹھی اپنے انگوٹھے کا ناخن کرید رہی تھی۔

''تم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش تو کی ہوگی؟''

اس سوال پر ہانیہ نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟ مجھ سے تو خود اپنی ذات کا سرا گم ہو چکا ہے۔ میں خود کو کھو چکی ہوں کسی اور کو کیا ڈھونڈ پاؤں گی؟''

اب عفرہ کو اپنی اس بے وقوفی کی حد تک معصوم سی نند پر غصے کی جگہ ترس آنے لگا تھا۔

''تم نے جو کرنا تھا وہ تو کر لیا، اب تمہارے یوں پریشان ہونے اور رونے دھونے سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں کل تمہارے ساتھ یونیورسٹی جا کر اس کے بارے میں معلومات کرتی ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں اس کے گھر کا ایڈریس مل جائے گا۔ پھر کوئی صورت نکالتی ہوں اس سے ملنے کی۔'' جانے وہ خود کو تسلی دے رہی تھی یا اس کو۔

''بھابھی۔ پلیز، بھیا کو اس معاملے کی ذرا سی بھنک بھی نہیں ملنی چاہیے۔ میں جانتی ہوں ان کو کتنا صدمہ ہوگا وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہوگی۔'' وہ اس کی منت کر رہی تھی۔

عفرہ نے پل بھر کے لیے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور بنا یہ پوچھے اٹھنے لگی کہ جس وقت تم یہ فیصلہ کر رہی تھیں اس وقت بھائی کا خیال کیوں نہیں آیا؟

''بھابھی! ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ اس مدت میں اسفندیار اپنی ماں کو منا کر آپ دونوں کے پاس رشتے کی بات کرنے کے لیے لے آئے گا...... یوں کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی اور......'' ہانیہ نے اس کا سوال اس کے چہرے پر پڑھ لیا تھا اسی لیے وہ جلدی وضاحت دینے لگی۔

"یہی "اور" تو ہے۔ جو ہمارے لیے کاتب تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے جس سے ہم بے خبر ہوتے ہیں اور پھر اپنے فیصلوں کے الٹ حالات دیکھ کر ہی ہمیں اس کے ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے۔"

"میں تو ان بیس دنوں میں ہزاروں بار سجدے میں جھک کر اس سے معافی مانگ چکی ہوں کیا وہ میری توبہ قبول نہیں کرے گا بھابھی...... کیا میرا گناہ اتنا بڑا تھا کہ میں ہر لمحہ اس کی سزا پاتی رہوں؟" وہ پاس بیٹھی عفرہ کی گود میں سر چھپا کر کر سسکنے لگی۔ جبکہ وہ اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا کرسکتی تھی؟

عفرہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی امید اور ناامیدی کے کھیل کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"کیا؟" عفرہ نے اس بوڑھی عورت کی بات سن کر بے اختیار کھلے دروازے کا پٹ تھام لیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور رنگت بالکل زرد پڑ گئی تھی۔ سامنے کھڑی دکھیاری خاتون کی نظر شاید بہت کمزور تھی اور اب تو آنسوؤں کی دیوار نے مزید فاصلے پیدا کردیے تھے اس لیے وہ اس کی کیفیت سے بے خبر رہیں۔

"اندر آجاؤ بیٹی۔ یوں دروازے میں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔" وہ اسے کہہ کر واپس ہو گئیں کہ یقیناً وہ پیچھے آئے گی لیکن عفرہ کے قدم تو من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ باوجود کوشش کے کھلے دروازے سے اندر نہ جاسکی۔

"باجی۔ آپ بھیا کی کلاس فیلو رہ چکی ہیں شاید؟" وہ سولہ سترہ سالہ لڑکی ماں کے کہنے پر اسے اندر بلانے آئی تھی۔

"آپ اندر آئیں۔ یقیناً یہ خبر آپ کے لیے بھی شاک ہی ہوگی۔ آپ نے تو ان کے ساتھ پڑھا ہوگا ایک یونیورسٹی میں وقت گزارا ہوگا۔ ان کے بارے میں کوئی اجنبی بھی سنتا ہے تو ہمارے دکھ پر تڑپ اٹھتا ہے۔ ہمارا تو ایک ہی آسرا تھا وہ بھی چھن گیا۔"

اس کی آنکھوں کا پانی شاید ختم ہوگیا تھا اس لیے اس کی آنکھیں بالکل سوکھی تھیں۔ لیکن چہرے پر نوحے لکھے تھے جنہیں ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

"میرا نام روبی ہے۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑے اندر لے آئی۔

"امی! دیکھیں، باجی کے ہاتھ کیسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ بھیا کی موت پر شاید انہیں بھی یقین نہیں آرہا۔"

ماں نے بجھی بجھی آنکھوں سے اس کے چہرے پر جیسے کچھ تلاشنے کی کوشش کی۔

"تم ہانیہ تو نہیں ہو؟" ان کے عجیب سے انداز پر عفرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ بہت منت سماجت کرتا رہا مجھے منانے کے لیے میرے پاؤں میں بیٹھ گیا رو رو کر کہتا رہا کہ اماں اس وقت تک آپ کے پاؤں سے نہیں اٹھوں گا جب تک آپ ہاں نہیں کرتیں۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی کیا کرتی بیٹیوں کی ماں ہوں۔ ان کی فکریں کرنے کے لیے ان کا باپ نہیں تھا اور...... اور باپ جیسا بھائی شادی کر کے اپنی زندگی میں مست ہو جاتا۔ بہنوں کا کس نے پوچھنا تھا؟ یہی ڈر میرے دل میں بیٹھ چکا تھا اور میں نے اس کی ہر بات کے جواب میں ایک ناہی اسے دی...... وہ مرتا نہ تو اور کیا کرتا؟" وہ شدید پچھتاوے کے احساس تلے دبی ہوئی تھیں۔

"کیسے ہوا یہ سب؟" اسے اپنی پھنسی ہوئی آواز اجنبی سی لگی۔

"اماں اور بھیا کی لڑائی ہوئی تھی اس دن بھیا کہہ رہے تھے۔ اماں ان سے صرف رشتے کی بات کرلیں۔ شادی میں بہنوں کی شادیوں کے بعد کروں گا۔ لیکن اس دن اماں کا بی پی بہت زیادہ تھا۔ بی پی کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں اور اماں خوب شور مچا رہی تھیں۔ انہیں لعنت ملامت کر رہی تھیں کہ

اچانک وہ اٹھے اور تیزی سے باہر نکلنے لگے۔ میں بھی اسی تیزی سے ان کے پیچھے گئی اور پوچھا کہ بھیا کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟ انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ان کی نظروں نے جیسے مجھے ان کی دلی کیفیت بتا دی۔

”نہیں ...... بھیا ...... مایوس نہیں ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا بس تھوڑا سا انتظار کریں آپ دونوں۔“ وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی اور عفرہ دم بخود سی سب سن رہی تھی۔ ”بھیا نے دروازے کی کنڈی کھولتے ہوئے اک الوداعی حسرت بھری نظر صحن میں بیٹھے سبھی لوگوں پر ڈالی اور دھیرے سے کہا کہ کاش میں مر جاؤں۔ میں نے پیچھے سے ان کی شرٹ کا دامن پکڑ لیا۔ ”بھیا ہم سب کا آسرا اللہ کے بعد آپ ہی تو ہیں ...... ایسی باتیں کرتے ہوئے ماں بہنوں کا خیال کیوں نہیں آتا آپ کو؟ میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ نرمی سے دامن چھڑاتے ہوئے جو آخری الفاظ بول گئے وہ یہ تھے کہ اماں کی گولیاں ختم ہیں وہ لے کر ابھی آتا ہوں فکر نہ کر جھلی تیرا بھائی اتنی جلدی نہیں مرے گا۔

”پھر ...... پھر کیا ہوا تھا؟“ سکوت کو توڑتے ہوئے عفرہ نے پوچھا۔

”جب ہم ہاسپٹل میں پہنچے تو وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ خون میں لت پت درد سے تڑپتا میرا گبرو جوان بھائی اتنا بے بس تھا کہ وہ اپنی روشن آنکھوں کی پلکیں بھی نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اماں تو باہر گر کر بے ہوش ہو چکی تھیں، میں ہی ہمت والی ہوں ان سب میں۔ انہوں نے میری مسلسل پکار پر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور خون بھرے چہرے پر جھکے میرے چہرے نے ان کی سرگوشی کی گرمی محسوس کرتے ہی سماعتوں کا پورا زور لگا لیا کہ وہ آخری لفظ کیا بولتے ہیں۔

ڈاکٹرز نے کہہ دیا تھا مریض کے آخری لمحات ہیں، یہ پل بہت قیمتی تھے میں جان چکی تھی۔ بھیا کلمہ پڑھیں۔ میں نے بڑے حوصلے سے انہیں کلمہ پڑھایا اور ہمیشہ کی خاموشی سے پہلے کی ہچکی میں انہوں نے ہانیہ کا نام لیا وہ شاید کوئی پیغام دینا چاہتے تھے یا ان کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے تھے ...... لیکن وقت ختم تھا ایک پل ایک لمحہ بھی نہ ملا انہیں ...... کہ وہ بات مکمل کرتے ...... بس یہ کہا ہانیہ میری ...... اور ساکت ہو گئے۔“

کچے صحن میں جامن کا بڑا سا پیڑ سر جھکائے کھڑا تھا صرف اس پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یا کبھی ہوا کے تیز جھونکے سے لرزتے پتوں کی ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوتی باقی سارے تو چپ تھے۔

آنسوؤں کے گرنے کی آوازیں اگر سنائی دیتیں تو شاید اس گھر کے صحن سے اٹھتا شور برداشت سے باہر ہو جاتا۔ عفرہ نے آنسوؤں کی جھڑی کو بہنے دیا اسے ابھی تو اس گھر کے مکینوں کے بے آسرا ہونے کا دکھ رلا رہا تھا لیکن اندر ہی کہیں اس لڑکی اور اس کی کوکھ میں پلنے والے بچے کا دکھ بھی اس کے دل کو کچوکے لگانے لگا تھا۔

”میں ابھی تک نہیں جان پائی کہ انہیں ہوا کیا تھا؟“ وہ خود پر قابو پا کر پوچھ رہی تھی۔

روبی چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ چکی تھی اور اب پیالی سے اٹھتے دھوئیں پر نظریں جمائے وہ الفاظ جمع کر رہی تھی جن سے کم تکلیف دہ انداز میں وہ سب کچھ کہہ سکتی۔

”وہ ڈاکو پکڑے گئے ہیں ان کا بیان بھی عجیب ہے کہتے ہیں جب ہم نے اس لڑکے کو روکا تو و
خاموشی سے رک گیا یوں کہ جیسے منتظر ہو ایسے کس
حادثے کا۔ ان کے بیان کے مطابق ان کے ہاتھ
میں فون بھی نہیں تھا۔ وہ فون گھر پر چھوڑ گئے تھے او
جب ان کی جیب کی تلاشی لی جانے لگی تو انہوں ن
ہاتھاپائی شروع کر دی جس سے ہمیں یقین ہو گیا ک
ان کی جیب میں کچھ قیمتی چیز ہے نقد رقم یا سونے ک
قیمتی چین وغیرہ ضرور ہو گی۔ جس کو بچانے کے ل
وہ جان کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے وہ فائر ک

بغیر انہیں زیر نہیں کر سکتے تھے۔ گولی چلانے کے بعد جب وہ بے بس ہو کر گر گئے تب انہوں نے بھیا کی جیب کی تلاشی لی اور ان کی جیب سے برآمد ہوئیں اماں کی بی پی کی گولیاں اور چند نیند کی گولیاں اس کے علاوہ پانچ سو روپیہ کا ایک مڑا تڑا سا نوٹ تھا۔ انہوں نے کوئی خفیہ جیب ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے پھاڑے گئے بٹوے کی ایک خفیہ جیب سے ایک لڑکی کی تصویر ملی جس پر ہانیہ لکھا ہوا تھا وہ یہ سب کچھ وہیں پھینک کر بھاگے لیکن ان میں سے ایک کا فون وہیں گر گیا تھا جس کی مدد سے پولیس کو ان تک رسائی میں مدد ملی جلد ہی وہ پکڑے بھی گئے۔ لیکن بھیا تو واپس نہ آئے۔''

عفرہ کی سماعتوں میں تو روبی کی زبان سے نکلا ایک جملہ ہی گونج رہا تھا۔ ایک لڑکی کی تصویر نکلی جس پر ہانیہ لکھا تھا۔

''اف...... میرے خدایا! کتنے بدقسمت ہیں دونوں اور پھر کیسا نصیب ہے اس بچے کا جس کے باپ کو یہ خبر بھی نہ مل سکی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔''

وہ گم صم سی بیٹھی گھر کے صحن میں ہر جگہ موجود اداسی کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''کیا آپ ہمیں ہانیہ کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں اور آپ کا نام کیا ہے؟'' اسفندیار کی بہن کے اس سوال نے اسے پریشان کر دیا۔

''میں تو جرم اور پچھتاوے کے احساس تلے دبی ہوئی ہوں۔ بیٹے کی خاطر اس لڑکی کو قبول نہ کرنے کا افسوس ہر پل ہر لمحہ میری روح کو تڑپاتا رہتا ہے۔''

ماں کے جھریوں بھرے چہرے اور بجھی ہوئی آنکھوں میں سے جھلکتا پچھتاوے کا احساس دکھ کے ساتھ مل کر انہیں جلد ہی مار دینے والا تھا۔

''اگر انہیں کچھ ہو جائے تو ان لڑکیوں کا کیا بنے گا؟'' عفرہ نے فیصلہ کر لیا تھا انہیں مزید شرمندہ نہیں کرے گی پچھتاوے کے جان لیوا احساس سے انہیں نجات دلانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر کے رہے گی ایک نہیں کئی زندگیوں کا سوال تھا...... جو گیا سو وہ تو واپس نہیں آ سکتا، جو زندہ ہیں ان کے لیے زندگی موت سے بدتر نہیں ہونی چاہیے۔

''نہیں آنٹی! آپ کا فیصلہ ٹھیک تھا...... بس اسفندیار کی قسمت اچھی نہیں تھی اس لیے بہانہ بن گیا۔ ہانیہ ہماری کلاس فیلو تھی لیکن بہت تیز اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ کبھی اسفندیار سے شادی نہ کرتی کیونکہ اس کے خوابوں کا شہزادہ کوئی امیر ترین انسان تھا جو اسے دولت کے ساتھ ساتھ آزاد زندگی بھی گزارنے دیتا اسے پابندیاں کسی بھی طرح کی قبول نہیں تھیں۔ اسفندیار کو تو وہ یونہی بے وقوف بنا رہی تھی کیونکہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔''

اس نے نیک مقصد کے لیے بولے گئے جھوٹ کا ردعمل اس کی ماں کے چہرے پر دیکھا وہاں اب تاثرات بدلنے لگے تھے۔

''دیکھ لو۔ میں کہتی تھی نا کہ میرے اندر سے کوئی آواز سنائی دیتی ہے کہ اسفند کے لائق نہیں ہے وہ لڑکی۔'' وہ بیٹیوں کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

کیا میں یہ سب انہیں نہ بتا کر زیادتی تو نہیں کر رہی؟ ہانیہ ان کے بیٹے کی بیوہ۔ اور اس بیوہ کے بطن میں پلتا بچہ؟ وہ شش و پنج کی کیفیت میں الجھی ہوئی تھی۔

''بیٹا! تم خود انصاف کرو بمشکل تمام پینشن کے پیسوں سے گھر کا خرچ چلاتی ہوں۔ میری یتیم بچیاں ٹیوشنز پڑھا کر اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہر مہینے بہت سارا قرض دکان والے کا چڑھ جاتا ہے۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسے حالات میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جاتا۔ اسفند یار کو نوکری مل بھی جاتی تو جوان بہنوں کے جہیز کی کوئی فکر کرتا۔ شادی کیسے کر لیتا۔ جب کہ......'' ان کی آواز گلے میں پھندا بن کر پھنس گئی تھی۔

عفرہ کو اپنا فیصلہ درست لگا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے اندر اٹھتے ندامت کے طوفان پر قابو پانے کی

Wadaa Azeem www.pakistanipoint.com

کوشش کی کہ اس گھر کے مکینوں پر اضافی بوجھ کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتا ہانیہ اور اس کے ہونے والے بچے کا۔

"کیا آپ ہمیں ہانیہ کی تصویر دکھا سکتی ہیں وہ یقیناً اتنی پیاری ہوں گی کہ بھیا ان کے دیوانے ہو گئے تھے۔ میرے بھیا بڑے اچھے کردار اور اعلا اقدار رکھنے والے انسان تھے۔"

بہنوں کے دل میں تو ویسے ہی بھائیوں کو ہیروز کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ ادھر تو اکلوتا سہارا بھی وہی تھا۔

عفرہ نے کچھ سوچتے ہوئے موبائل فون نکالا اور ہانیہ کی دو تین تصاویر انہیں دکھانے لگی۔ وہ سب تصاویر دیکھ رہی تھیں اور عفرہ گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا جس کے صحن میں ایک طرف چارپائیاں اور دوسری طرف میز اور کرسیاں پڑی تھیں۔ پرانی طرز کی پلاسٹک سے بنی گئی کرسیوں کا رنگ بہت خراب ہو رہا تھا اسی طرح چارپائی پر ڈالی گئی چادر بھی ڈھل ڈھل کر بالکل پرانی لگ رہی تھی۔

"یا اللہ مجھ اس امتحان میں کامیابی بخش دینا۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔

"یہ تو بہت پیاری ہیں گوری چٹی اور حسین آنکھوں والی۔" اس نے دیکھا سبھی افسوس سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں سے حسرت بھی ٹپک رہی تھی کہ کاش وہ ان کے بھائی کی دلہن بن سکتی۔

"خوبی تو اصل میں کردار کی ہوتی ہے دیر تک رہنے والا کردار کا حسن ہی ہو سکتا ہے۔" عفرہ نے جلدی سے وضاحت دی۔

"میں اب چلتی ہوں مجھے بہت دور جانا ہے۔" اس نے اب موبائل فون میں ٹائم دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے اجازت چاہی۔ تو وہ بھی کھڑی ہو گئیں اماں نے گھٹنوں کو پکڑ کر دوبارہ چارپائی پر گرنے والے انداز میں بیٹھتے ہوئے اداس نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"ایک بات پوچھوں بیٹی؟" وہ ان کے ساتھ براہ راست زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں ان کی جہاندیدہ نظریں جھوٹ کا کوئی سرا پکڑ نہ لیں اس لیے نظریں جھکائے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تم دوسرے شہر سے اتنا لمبا سفر کر کے یہاں کیوں آئی ہو؟" ان کا انداز مشکوک تھا۔

"اماں جی! میرا کوئی سگا بھائی نہیں ہے۔ اور یہ کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی لیکن یونیورسٹی میں اسفندیار نے میرا بھائی بن کر یہ کمی پوری کر دی۔ وہ مجھے بہن کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی تھا۔ بہت دنوں سے اس کا فون بند آ رہا تھا تبھی مجھے پریشانی ہوئی لیکن رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ شوہر بہت مصروف آدمی ہیں اس لیے چپ رہی۔ لیکن اتفاق سے خالہ زاد بہن اپنے سسرال شفٹ ہو گئی جو اسی شہر میں ہے میری خالہ زاد بہن پہلے ہمارے قریب ہی رہتی تھی۔ باجی کو اللہ نے شادی کے دس سال بعد بیٹا دیا ہے تو انہوں نے بچے کے عقیقے میں سارے خاندان کو مدعو کر رکھا ہے۔ میں بھی اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آئی ہوں اور اپنے بھائی کی خیر خبر لینے کے لیے ایک سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے آئی ہوں...... لیکن کیا خبر تھی کہ......" وہ سر جھکا کر افسوس سے بولی تو اسے خود پر حیرانی ہونے لگی کہ کیسے وہ اتنے سارے جھوٹ بول رہی ہے

"بیٹا! کوئی بچہ ہے تمہارا؟"

اماں نے روایتی سا سوال کیا تو وہ اداسی کی ایک لہر میں ڈوبتے ابھرتے حسرت سے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگی۔

"شاید یہ سکھ میرے نصیب میں نہیں لکھا گیا۔ یا شاید میری دعائیں ابھی خالص نہیں ہیں۔"

وہ ان کے سامنے جھکی اور انہوں نے عفرہ کو گلے لگا لیا عفرہ کو ان کے لمس سے عجیب سا سکون ملا اسے اپنی مرحومہ ماں کی آغوش یاد آ گئی وہی نرم و ملائم

سا خوشبو بھرا لمس، وہی احساس تحفظ جوان کی آغوش میں اسے بہادر بنا دیتا تھا۔ اسے اس وقت ہمت اور بہادری کی ضرورت بھی تھی۔ وہ ان سے مل کر نکلنے ہی لگی تھی کہ جاتے جاتے یکدم کچھ سوچ کر پلٹی وہ سب اسے سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے غیر محسوس انداز میں پرس میں ہاتھ مار کر نوٹوں کی گنتی کی اور مطمئن ہو کر کچھ پیسے نکالے۔

”اماں جی! سچ کہوں تو یہ پیسے لوٹانا اصل مقصد تھا۔“ اس نے نوٹ اماں کی گود میں رکھتے ہوئے وضاحت دی۔ ”اصل میں ایک یار اچانک یونیورسٹی میں پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی تبھی اسفندیار بھائی نے یہ پیسے دیے تھے اب اس امانت کی حق دار آپ ہیں۔ سو یہ رکھ لیں۔“

بوڑھی خاتون کے ساتھ ان کی بیٹیوں کی آنکھیں بھی اس انداز پر بھیگ گئی تھیں لیکن وہ سب یہ نمی ایک دوسرے سے چھپاتے ہوئے ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اسفندیار کے پاس کبھی فالتو پیسے نہیں ہوا کرتے تھے کہ وہ کسی کی مدد کر سکتا۔

”جیتی رہو بیٹی اور اللہ تعالیٰ دل کی ہر مراد پوری فرمائے۔“

بہنیں دروازے تک اس کے ساتھ آئیں۔

”اگر میں کچھ اس ایڈریس پر بھیجا کروں تو برا نہ منانا پلیز۔ اسفندیار بھائی کے رشتے سے تو ہم سب بھی بہنیں ہوئیں نا؟“

وہ اثبات میں سر ہلا کر اس سے باری باری لپٹ رہی تھیں۔

”آپ نے اماں کا احساس جرم کم کرنے کے لیے یہ سب کہا نا؟“ روبی کے سوال نے اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔

”جانے والا تو چلا گیا لیکن سائبان چھننے کے بعد والی تیز دھوپ جو انسان کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے اس سے اماں کے آنچل نے آپ سب کو بچا رکھا ہے...... اب ماں کا بہت خیال رکھا کرو کہ تم بہنوں کا اکلوتا سہارا ہیں اس دنیا میں۔“

وہ اپنی مرحومہ ماں کو یاد کرتے ہوئے بے اختیار پلکوں پر اترتے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش میں تیزی سے کھلے دروازے کی چوکھٹ پار کر گئی۔ جاتے جاتے وہ روبی کو اپنا نمبر دینا نہ بھولی تھی۔ الگ سی ہمدردی اور محبت وہ اس خاندان کے لیے اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

سارا راستہ عجیب سی بے کلی اس کے روم روم میں چھپ کر بیٹھی رہی۔ گاڑی کی سیٹ سے اپنا دکھتا سر ٹکائے وہ آنکھیں بند کر کے تھوڑا سا سکون حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن آنکھوں کے سامنے ہانیہ کا ستا ہوا چہرہ آگیا۔

”میری پیاری بھابھی جان! اپنے الفاظ کا ایسا جادو پھونک کر آنا اسفندیار کی ماں بہنوں پر کہ وہ فوری بارات لے کر آجائیں اور خوشی خوشی سب پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔ ہمارے خوابوں کی تعبیریں مقدر کی لکیروں سے مل کر جدائیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔“

وہ بہت پر امید تھی اور یہی امید اس کے دل میں اک نیا ولولہ پیدا کر رہی تھی...... وقت رخصت اس نے عفرہ کے دونوں ہاتھ تھام کر اداس لہجے میں کہا۔

”اور بھابھی! اسفندیار سے یہ ضرور کہیے گا کہ اتنے دنوں سے ہانیہ...... جی نہیں رہی بلکہ جینے کی اداکاری کر رہی ہے...... اور کچھ دن کی اداکاری نے اس کی روح کو بھی تھکا دیا ہے۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

”اچھا اب نکلنے بھی دو، ایک تو تمہارے بھائی کی تشویش اور تفتیش تھکا چکی ہے۔ کیوں جا رہی ہو؟ کیا بہت ضروری ہے؟ باجی سے معذرت کر لو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تم فکر نہ کرنا میں سب ٹھیک کر کے ہی آؤں گی۔“ وہ ہاتھوں کو نرمی سے دبا کر اسے تسلی دے رہی تھی۔

لیکن خود کو تسلی کیسے دیتی۔ اس لڑکی کو کیا کہتی جو

اب بھی مکمل یقین تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اسفندیار اور اس کے گھر والے اسے رخصت کرا کر لے جائیں گے۔

کل شام کو وہ پہنچی اور۔ آج سہیلی سے ملنے کے بہانے اسفندیار کے گھر آتے ہوئے پرامید تو وہ بھی تھی لیکن واپسی پر ناامیدی، مایوسی، دکھ اور اب کیا ہوگا کا سوالیہ نشان اس کے ہمراہ تھے۔

وہ واپسی کے سفر میں سوچ چکی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے...... لیکن یہ سب کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے رب سے بار بار حوصلہ مانگتی رہی۔ آسانیوں کی دعائیں اس کے لبوں کا ورد رہیں۔ بار بار ہانیہ کا فون کاٹتے ہوئے وہ خود کو بڑی مشکلوں سے مجتمع کرتی اور پھر بکھرنے لگتی۔ اپنے شوہر کی عزت...... ہانیہ کے بچے کی زندگی...... بنا رخصتی کے اس بے وقوف لڑکی کا بیوی کی آزمائش سے گزرنا...... کتنے ہی پل صراط پار کرنے ہیں ابھی اس لڑکی نے۔

"میرے اللہ۔ میں بے بس ہوں۔ ہم سب کی عزتوں کا پاسباں تو ہی ہے۔ میرے اللہ غیب سے انتظام کردے ہر مشکل کو آسانی میں بدلنے کا۔" وہ بار بار رب کو پکار رہی تھی بظاہر گاڑی کے شیشوں میں جھانکتے مناظر پر نظریں جمائے وہ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"بھابھی! بتائیں نا پلیز۔ کیا کہا اس نے؟ کیوں اتنے دنوں سے فون بند ہے اس کا...... بھابھی آپ نے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے...... سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات پر ہو رہا تھا کہ جو بات میں نے اسے خود بتانی تھی وہ یہ خبر آپ سے سنے گا...... اچھا چھوڑیں...... یہ بتائیں اس کے گھر والے کیسے لگے آپ کو...... یہ تو مجھے پتا ہے کہ اس کی امی بہت غصے والی ہیں لیکن میں گزارا کرلوں گی ان سے...... اپنی ماں سمجھ کر ان کی عزت ان سے محبت کروں گی تو وہ بھی کبھی نہ کبھی تو نرم ضرور پڑ جائیں گی۔"

وہ مسلسل بولے جا رہی تھی خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب بھی دے رہی تھی۔ گھر آتے ہی وہ بے چینی سے صحن میں ٹہلتی ہوئی ملی تھی اس نے جوش میں غور ہی نہ کیا کہ عفرہ کا چہرہ اترا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

وہ اس کے ساکت چہرے اور جامد لبوں کو چند پل دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا ہے بھابھی...... سب ٹھیک ہے نا؟ اسفندیار کی امی نے کچھ کہا ہے نا؟ کوئی بات نہیں وہ مجھے قبول نہیں کرتیں نہ کریں کیونکہ اسفندیار تو مجھے قبول کر چکا ہے۔ اب ہم دونوں کو اپنے بچے کے لیے بڑے فیصلے کرنے ہوں گے ورنہ اس بچے کے ماتھے پر ناجائز کی کالک لگ جائے گی۔" وہ اب بھی وہ نہیں سوچ سکتی تھی جو ہو چکا تھا۔

"تم بیٹھ کر آرام سے میری بات سنو گڑیا۔" وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر بولی تو ہانیہ نے بھابھی کے لہجے پر غور کیا۔

"جب امی کے ٹیسٹ کا رزلٹ آیا تھا تب آپ کی شکل ایسی ہی بنی ہوئی تھی اور جب امی مرگئی تھیں تو بھی آپ نے مجھے اٹھا کر یہ بات بتائی تھی...... یاد ہیں مجھے آپ کے وہ الفاظ بھی اور وہ تاثرات بھی...... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج بھی آپ مجھے کسی کے مرنے کی خبر دینے والی ہیں؟" وہ ایک دم سے سیدھی ہو کر بیٹھ چکی تھی اور اس کی آنکھیں آنے والے لمحات کے ڈر سے پھیل سی گئی تھیں۔ "کیا ہوا ہے؟ پلیز بتائیں...... کیا اسفندیار کی ماں مرگئی ہے تبھی اس نے رابطے ختم کر رکھے ہیں؟" وہ پگلی اب بھی وہ نہیں سوچ رہی تھی جو عفرہ کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔

"زندگی موت کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہے اللہ نے وہ امانت واپس لے لی۔ اور اب ہمیں صبر کرنا ہے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔" عفرہ نے ضبط کھو دیا اور رونے لگی۔

"کون مرگیا ہے بھابھی؟" وہ اسے جھنجوڑ نے

لگی

"اسفندیار مر گیا ہے ہانی...... تیرا شوہر...... تیرے ہونے والے بچے کا باپ مر گیا ہے۔" وہ سسکتے ہوئے بتا رہی تھی لیکن ہانیہ کے چہرے پر اب بھی بے یقینی کے تاثرات تھے۔

"نہیں۔ بھابھی۔ آپ شاید غلط گھر چلی گئی تھیں۔ یونیورسٹی میں اور بھی اسفندیار پڑھتے تھے۔ ایک شانگلے کا تھا، ایک ہم سے سینئر ڈیرہ غازی خان سے آیا ہوا تھا...... وہ...... وہ مریل سا تھا پیلا زرد۔ وہی مر گیا ہوگا...... میرا اسفند تو اونچا لمبا صحت مند مرد ہے وہ کیسے مر سکتا ہے اس نے تو ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے...... وہ وعدے کا بہت پکا ہے...... پتا ہے بھابھی...... وہ دس بجے آنے کا کہتا تو پورے دس موجود ہوتا۔ ایک منٹ بھی لیٹ نہ ہوا کبھی۔ میں چھیڑتی تو کہتا وعدہ خلافی بڑا گناہ ہے؟" وہ خشک آنکھوں میں دیوانگی بھرے اسے دیکھ کر بولے جا رہی تھی۔

عفرہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے اس کی بے یقینی کو یقین میں بدلے۔

"میں نہ شانگلہ گئی تھی نہ ہی ڈیرہ غازی خان۔ میں اسی کے گھر گئی تھی...... دیکھو یہ ثبوت...... مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ تم یقین نہ کرو گی لیکن...... تمہیں جلد ہی یہ سب قبول کرنا ہوگا۔" اس نے موبائل فون میں موجود اسفندیار کی پکچر نکالی جو اس کی بہن نے تابوت میں لی تھی آخری نشانی کے طور پر۔

وہ پکچر دیکھ کر چند لمحے تو ساکت سے تکتی رہی اور پھر یہ سکوت طویل ہوتا گیا...... اس کی بے تاثر آنکھیں اور سپاٹ چہرہ اسے اذیت دے رہا تھا......

☆☆☆

عفرہ سخت پریشان تھی اسے اب سب سے زیادہ فکر اس بچے کی تھی جس کے کل کا فیصلہ ابھی ہوا نہیں تھا یا اللہ کی طرف سے تو ہو چکا تھا لیکن ابھی تک انسانوں کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ وہ جتنا سوچتی الجھتی جا رہی تھی۔ صارم ان دنوں آفس کے کام میں بہت مصروف تھے اسی لیے ہانیہ کا پوچھتے تو عفرہ ٹال دیتی یہ کہہ کر کہ "اس کو ایم ایس کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے دن بھر پڑھتی رہتی ہے ابھی سوئی ہے۔"

لیکن آخر کب تک؟ کوئی فیصلہ تو کرنا تھا اس نے ہانیہ کے کمرے میں کھڑے ہو کر بے سدھ لیٹی اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا شاید اس کا دکھ کم کرنے کے لیے مجھے یہاں بھی جھوٹ بولنا پڑے گا۔

"ہانیہ!"

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی کمرے پر قابض ملگجے اندھیرے میں بھی اس کی زرد رنگت آنکھوں تلے حلقے اور الجھے بال صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"ہانیہ اسے بھول جاؤ...... اور اب اس کا ماتم کرنا تمہاری تیسری غلطی ہے...... پہلی غلطی یہ کہ تم نے اپنے لیے غلط شخص کا انتخاب کیا...... دوسری بڑی غلطی تم نے یہ کی کہ کسی کو بھی اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا...... اور اب تیسری بڑی غلطی تم یہ کر رہی ہو کہ یوں کبوتر کی طرح حقیقت سے آنکھیں چرائے یہاں پڑی ہو۔ تم شاید نہیں جانتی لیکن مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے اس بچے کی وجہ سے ہماری زندگی اور عزت کے لیے خطرہ بڑھتا جا رہا ہے...... ابھی تک تو صارم سے سب کچھ پوشیدہ ہے لیکن زیادہ عرصے تک یہ سب چھپانا ممکن نہیں رہے گا۔ بقول تمہارے...... تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے یہ بات ثابت ہو کہ تم نے اور اسفندیار نے نکاح کیا ہوا تھا اور جو دوست اس نکاح میں شامل تھے ان میں سے کسی کا پتا تمہارے پاس نہیں ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟ تم شاید اپنے بھائی کو اتنی اچھی طرح سے نہیں جانتی ہو گی جتنا میں اسے جانتی ہوں...... وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے اس صورت میں جبکہ بہن یہ ثابت بھی نہ کر سکے کہ وہ

کنواری ماں نہیں بن رہی ہے یا سچ مچ اسفندیار کی بیوہ ہے۔''

عفرہ نے سخت لہجے میں بات ختم کر کے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش میں ناکامی پر فیصلہ کن انداز میں جو کہا وہ ہانیہ کو مضطرب کرنے کے لیے کافی تھا۔

''میں کہنا تو نہیں چاہتی لیکن تمہارے اس رویے نے مجھے یہ سب بتانے پر مجبور کردیا ہے۔ تو سنو تمہارا وہ محبوب جس کے لیے تم نے سگے رشتوں کو دھوکا دیا وہ اتنے دنوں سے اس لیے غائب تھا کہ اس کی شادی طے ہوچکی تھی اور وہ تم سے جان چھڑانے کے لیے نمبر بدل چکا تھا...... جب یونیورسٹی میں ایک دوست خاتون پروفیسر کے ذریعے میں اس کا ایڈریس لینے پہنچی تو جانتی ہو مجھے اسٹاف میں سے ایک لڑکے نے کیا کہا؟ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کا نام ہانیہ تو نہیں ہے؟ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ آپ کیوں یہ پوچھ رہے ہیں تو وہ بولا کہ ایک وجہ ہے...... اگر آپ مجھے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھادیں تو میں وہ وجہ اور اسفندیار صاحب کا ایڈریس بھی آپ کو بتاسکتا ہوں۔ میں نے اسے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا تو وہ مطمئن ہوگیا پھر اس نے بتایا کہ اس کا دوست اسفندیار تاکید کر کے گیا ہے کہ کسی کو اس کا ایڈریس نہ دوں۔ اور خاص طور پر یہ کہا تھا کہ ایک لڑکی ہانیہ نام کی ضرور میرا ایڈریس پوچھنے آئے گی۔ اس نے کہا یہ نام اپنے پاس کہیں نوٹ کرلوں...... لیکن میری بھتیجی کا نام بھی ہانیہ ہے اسی لیے مجھے نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

عفرہ نے دیکھا وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی لے کر پورا گلاس خالی کرچکی تھی...... وہ اس کی اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ بھرے بھرے جسم کو بھی بغور دیکھ رہی تھی ابھی تھوڑا ٹائم ہوا تھا حمل کو لیکن اس کے جسم میں تبدیلی آنا شروع ہوچکی تھی۔

''میں پھر بھی تم سے یہ سب کہہ نہ پائی کیونکہ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ تم اندر سے ٹوٹ جاؤ گی یقیناً اس حقیقت کی ضرب بہت کاری ہوگی جہاں تک ممکن تھا میں تمہیں اس تکلیف سے بچاتی رہی۔''

عفرہ کے دل کی دھڑکنیں جھوٹ بولتے ہوئے بے ترتیب ہورہی تھیں لیکن وہ ہمت کرتے ہوئے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جو بولنے والی تھی اس کا ردعمل بہت شدید متوقع تھا۔

''میری یہ بات بہت غور اور حوصلے سے سننا...... مجھے ان کے گھر جا کر جن حقیقتوں سے آشنائی ہوئی تھی وہ ساری میں تمہارے سامنے کھول نہیں پائی وجہ پھر وہی کہ تمہیں بہت درد ہوگا...... لیکن درد کے بغیر یادوں کے ناسور سے تمہیں نجات نہیں مل سکے گی...... میں نے اسفندیار کی ماں بہنوں کو بہت کریدا اور بڑے طریقے سے ساری معلومات حاصل کی ہیں...... وہ ہانیہ نام کی کسی لڑکی کا گھر میں کوئی ذکر نہیں کرتا تھا نہ ہی اس نے ماں سے شادی کی کوئی بات کی تھی...... اس کی دونوں بہنوں کے رشتے طے تھے اور...... اس کی پسند کی لڑکی سے...... اسفندیار کا رشتہ بھی طے ہوچکا تھا...... وہ نکاح کی تیاری کررہے تھے اور جس دن اسفندیار کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ اپنے نکاح کی تقریب کے انتظامات کے لیے گھر سے نکلا تھا...... یہ ساری کڑیاں ملتی رہیں اور تب مجھ پر یہ اذیت ناک انکشاف ہوا کہ وہ سب جھوٹ تھا...... جو تم سے کہا گیا اور جس پر تم نے آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا...... مجھے انتہائی افسوس ہے اس کی جوان موت پر اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہ گھر کا اکلوتا مرد تھا...... اس کی ماں بہنوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی...... ان کا دکھ بہت بڑا ہے جوان بھائی۔ ہنستا کھیلتا تابعدار بیٹا پل بھر میں ان کو چھوڑ گیا ہمیشہ کے لیے...... لیکن ہانیہ یہ جان لو کہ وہ پوری طرح سے مطمئن تھا کہ تم اس تک نہیں پہنچ پاؤ گی۔ نجانے کس بات کا بدلہ لیا ہے اس شخص نے تم سے؟ بولتے بولتے وہ یک دم چپ ہوگئی۔

ہانیہ کی بے یقین آنکھوں نے یہ سب ماننے سے انکار کردیا تھا لیکن عفرہ نے ان بے یقین

Waqar Azeem www.paksitanipoint.com

آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند بھی دیکھ لی تھی اسفندیار کی موت کا ماتم تو اب پرانا ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ آنسوؤں کی دھند بے وفائی کا ماتم ہے؟

”کچھ تو بولو ہانیہ...... یہ چپ ہم سب کی عزتوں کے جنازے پر بین کرے گی اور لوگ تماشائی بن کر اس جنازے میں شریک ہوں گے۔“

ہانیہ کے گالوں پر سے آنسوؤں کے موتی لڑیوں کی طرح گر رہے تھے۔

”پلیز ہانیہ! خود کو سنبھالو۔ کوشش کرو کہ...... صارم کو اس درد سے نا آشنا ہی رکھ سکو جو بہنوں بیٹیوں کی خودسری سے باپ بھائیوں کے دل چیر دیتا ہے ہمارا صارم اتنا مضبوط نہیں کہ وہ یہ سب سہار سکے۔“

ہانیہ اس کے گلے لگ کر سسکنے لگی۔ عفرہ دھیرے دھیرے اس کی کمر تھپکتے ہوئے اسے خاموش تسلی دینے لگی اس کی سسکیاں تیز ہونے لگیں۔ عفرہ نے اسے رونے دیا بعض اوقات آنسو چراغ بن کر غم کے اندھیرے میں روشنی کا سبب بن جاتے ہیں اسی لیے تو کہتے ہیں زیادہ رونے والوں کے دل اجلے ہوتے ہیں اور روتے بھی وہی ہیں جنہیں چوٹیں لگتی ہیں اور اللہ کریم جنہیں آزمائشوں میں ڈالتا ہے وہی اس کے چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی روتی رہیں۔

☆☆☆

”کیا بات ہے صارم! آپ کچھ پریشان ہیں؟“

عفرہ اپنی پریشانی کی دھند سے نکلی تو شوہر کا اترا ہوا چہرہ اسے واضح نظر آنے لگا۔

”وہی باس کا حکم کہ تم کیوں باہر نہیں جا رہے؟“

عفرہ کے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور سارا منصوبہ اس نے دوسرے ہی پل بنا لیا۔ فکروں کے پہاڑ سر سے سرکتے ہوئے محسوس ہوئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ڈرتے کہ کہیں صارم اس کا اطمینان محسوس نہ کرلے۔

”تم تو جانتی ہو کہ وہ مسلسل دو سال سے میری درخواست پر میری جگہ کسی اور کو بھیج رہے ہیں اب تیسری بار کسی قسم کی رعایت نہیں دیں گے۔“ صارم بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے پریشان نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں تو آپ کو پہلے بھی کہہ رہی تھی کہ چلے جائیں اس طرح ترقی کے مواقع زیادہ ہوں گے لیکن آپ ہی نہیں مانتے میری بات۔“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”دیکھیں صارم! میری اور ہانیہ کی فکر بالکل نہ کریں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال اچھی طرح رکھ سکتے ہیں...... بس آپ اس دفعہ ہاں کریں اور پھر تیاری بھی...... جو اضافی پیسے ملیں گے ہم تینوں ان پیسوں سے عمرے کے لیے چلے جائیں گے۔ ایک سال کا پتا بھی نہیں چلے گا اور آپ واپس آ جائیں گے۔“ وہ ہر طریقے سے اسے قائل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”ہانیہ کو بلا کر لاؤ اس سے پوچھتے ہیں وہ جیسا کہے گی پھر ویسا ہی کرتے ہیں...... ٹھیک ہے نا؟“ وہ صارم کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”دیکھو ہانیہ! کوشش کرو کہ بھیا دوبئ چلے جائیں ان کی ایک سال کی جدائی ہمارے بہت سارے مسائل حل کر سکتی ہے۔“ وہ اسے ساتھ لیے سمجھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور جب ہانیہ نے بھی اجازت دے دی تب صارم کے پاس کوئی وجہ نہ رہی انکار کی۔

”تم ہانیہ کا خیال رکھا کرو عفی!“ صارم کی پریشانی پر عفرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”کیا ہوا ہے ہانیہ کو بالکل ٹھیک ہے ماشاء اللہ۔ آپ اپنی تیاری کا سوچیں۔ چھوڑیں ہماری فکریں اور ایسا کریں کہ وہاں جا کر حسین صحراؤں کی سیر کریں بڑے بڑے شاپنگ مالز اور برج خلیفہ

دیکھیں قدم قدم پر ملتی حسیناؤں کو دیکھ کر واہ واہ کریں۔“ اس نے بات بدلی۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☆☆☆

”جی آپ کا نام؟“ ڈاکٹر کے پوچھنے پر اس نے لرزتی آواز میں کہا ”مسز اسفندیار۔“ اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

گائنا کالوجسٹ نے اسے حیرت اور شک سے بھرپور نظروں سے دیکھا۔

”آپ رو کیوں رہی ہیں کہیں یہ بچہ ناجائز؟“

”نہیں نہیں۔ وہ ڈاکٹر سعدیہ اصل میں ان کے شوہر اچانک ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے ہیں اور اب یہ پریگنینسی۔ یقیناً اداس تو ہوں گی۔ اس صورت میں کہ سسرال والے بھی بیوہ اور بچے دونوں کو رکھنے کے لیے تیار نہیں جبکہ شادی بھی اس نے اپنی پسند سے ہی کی تھی۔ عفرہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔

ڈاکٹر نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”بہت ینگ ہیں یہ۔ اور ہمارے معاشرے میں بچے کے ساتھ بیوہ کو قبول کرنے کا رواج بھی نہیں کہ ہر شخص ذمہ داری سے دور بھاگتا ہے۔ اور پھر غیر کا بچہ۔ یہ بچی بہت پیاری ہے اسے کوئی اچھا جیون ساتھی باآسانی مل جائے گا لیکن افسوس بچہ ماں باپ دونوں کے لیے ہی ترستا رہے گا۔“

عفرہ نے کچھ حوصلہ پا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کیا ابارشن نہیں ہو سکتا؟“

ڈاکٹر نے اسے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔

”سوری، بی بی! بچہ چوتھے مہینے کا ہے اور اب اسے مارنا بہت بڑا گناہ ہے۔ میں تو مشورہ نہیں دوں گی کیونکہ ماں بچے دونوں کے لیے یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔“

وہ دونوں ڈاکٹر کے فیصلہ کن انداز سے پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں ہانیہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے عجیب سی بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی اسی کا فیصلہ تھا کہ ابارشن کراتی ہوں۔ مجھے اس بے وفا کے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ جس کے لیے میں سب کچھ کھو دوں۔ عفرہ نے بہت کوشش کی کہ وہ یہ فیصلہ بدل دے لیکن وہ ڈٹی ہوئی تھی لیکن اسے امید تھی کہ بچہ ابھی زیادہ مہینوں کا ہے اور ڈاکٹرز اسے آسانی سے ابارشن نہیں کرانے دیں گی۔

”اب کیا ہو گا؟“ وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”اللہ پر بھروسا رکھو، وہ کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دے گا۔“ وہ تسلی دینے لگی۔

☆☆☆

صارم بیڈ روم میں تھا اور وہ دونوں لاؤنج میں تھیں۔ اچانک ہانیہ کا جی متلانے لگا اور وہ واش روم کی طرف دوڑی عفرہ نے سہمی ہوئی سماعتوں سے ہانیہ کی الٹیوں کی اوازیں سنیں واش روم کے ساتھ ہی ان کا بیڈ روم تھا۔ اور یقیناً صارم سب سن رہے ہوں گے اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہانیہ کے باہر نکلنے کا انتظار کیا اور جب وہ باہر آئی تو ساری بات سمجھ گئی۔

”کون واش روم میں وومٹ کر رہا تھا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تم دونوں کی؟“ صارم کے پوچھنے پر وہ شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے اللہ سے معافی بھی مانگ رہی تھی۔

”مجھے وومیٹنگ ہو رہی ہے صارم اور لگتا ہے کہ خوش خبری کے آثار ہیں۔“ وہ اس غیر متوقع بات پر خوشی سے اچھل پڑا۔

”تو چلو نا ڈاکٹر کے پاس...... ابھی چلتے ہیں۔“

وہ اس کی خوشی دیکھ کر احساس جرم کا شکار ہو رہی تھی۔

”ارے آج کل تو گھر میں ٹیسٹ ہو جاتا ہے۔ آپ ایسا کریں پریگنینسی ٹیسٹ کے لیے کٹ لے آئیں میں ابھی کرتی ہوں ٹیسٹ۔“

وہ اسے بانہوں میں تھامے مسکراتی نظروں

سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کاش کہ یہ خوشی کی خبر مجھے مل ہی جائے بہت انتظار کر چکا ہوں اس دن کا۔"

وہ مسکرا دی۔

"میں پچھلے دو مہینے سے محسوس کر رہی ہوں کہ کچھ ہے ایسا۔ لیکن عموماً یہ دیر سویر ہارمونز کی میڈیسن کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے اس لیے غور نہیں کیا۔" وہ منصوبے کے مطابق بات کر رہی تھی۔

چلو میں ابھی لاتا ہوں کٹ۔" وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خوش خبری سنتے ہی صارم نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

"ابھی تمہارا خیال کون رکھے گا، میں تو کل جا رہا ہوں؟" وہ پریشان بھی تھا اور خوش بھی۔

"میں رکھوں گی بھیا، اپنی پیاری بھابھی کا خیال۔" ہانیہ نے آنسو پیتے ہوئے کہا تو عفرہ اداس نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "آپ فکر نہ کریں اور سکون سے سفر کی تیاری کریں۔"

وہ تینوں ایک ہی کمرے میں بیٹھے الگ الگ احساسات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہانیہ بالکل خالی ذہن اور خالی دل لیے بیٹھی تھی۔ اس کا بھروسا خود پر سے بھی اٹھ چکا تھا۔ اگر عفرہ جیسی بھابھی نہ ہوتی تو اس نے اب تک موت کی آغوش میں پناہ لے لی ہوتی۔ اسے اب زندگی سے، اس بچے سے اور اس بے وفا شخص کے کیے گئے کسی بھی فعل سے کوئی مطلب نہ رہا تھا وہ گھنٹوں خالی دل اور خالی دماغ لیے کسی بھی غیر مرئی چیز کو گھورتی رہتی اور جب تھک جاتی تو آنکھیں بند کر کے ذہن کے گھپ اندھیرے میں اک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ جاتی۔

دوسری طرف عفرہ کے دل میں یہ اطمینان تھا کہ عزت بچنے کے ساتھ ساتھ بچے کی زندگی بھی بچ جائے گی اور اس طرح اسے کسی یتیم خانے یا ایدھی ہوم میں نہیں بھیجنا پڑے گا...... کیونکہ خود تو ہانیہ کسی صورت اس بچے کو نہیں پال سکتی تھی...... نہ ہی بغیر عدت کے اس کی شادی کہیں ہو سکتی تھی اور عدت کے بعد تو بچے کے وجود کو چھپانا ناممکن تھا...... وہ بند گلی سے نکل کر منزل کے قریب پہنچ چکی تھی...... بے شک یہ وہ منزل نہ تھی جس کی اس نے چاہ کی تھی لیکن کسی بھی راہ بھٹکے ہوئے گمشدہ منزل کی تلاش میں سرگرداں مسافر کے لیے فقط منزل اہم ہو جاتی ہے...... چاہے وہ کوئی بھی منزل ہو بس مسافتوں کی تھکن سے نجات ہی چاہیے ہوتی ہے، سو اسے بھی اس مسافت کو طے کرتے ہوئے اپنے تھکے ہوئے بدن کو کو کہیں ستانے کی جاہ چاہیے تھی اور وہی جگہ سامنے نظر آ چکی تھی۔ اسی کمرے میں بیٹھا صارم بہت زیادہ خوش تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ برسوں بعد نواز رہا ہے۔ لیکن یہ بے چینی بھی اسے مضطرب کیے ہوئی تھی کہ وہ ایسے موقعے پر خود موجود نہیں ہوگا۔ وہ تینوں اپنے خیالوں میں گم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"صارم پہلے تو اللہ سب خیر کرے گا۔ لیکن کوئی بھی پیچیدگی ہوئی تو چند گھنٹوں کا سفر ہے دوبئی سے پاکستان کی فوری فلائٹ پکڑ کر آ جایئے گا۔" وہ حیرانی سے اس بہادر عورت کے پرنور چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کہ اللہ نے اتنی قیمتی متاع میری کسی نیکی کے انعام کے طور پر مجھے عطا کی ہے۔

☆☆☆

صارم کے جانے پر اسے سکون ملا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکلوتی بہن کے کردار اور تابعداری پر فخر کرنے والے بھائی کو ایسا دھچکا لگے جس سے دونوں کے درمیان موجود بے تحاشا احترام اور محبت کا رشتہ دم توڑ جائے۔

"ہانیہ۔ بخدا، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی گود بھرنے کے لیے یا زمانے اور صارم کو یہ دکھانے کے لیے کہ میں ماں بن سکتی ہوں یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسا ہے اگر وہ چاہے گا تو مجھے اولاد کی نعمت اپنے در سے عطا کر دے گا۔ اور اگر نہ چاہے تو بھی میں اس کی رضا میں راضی رہوں گی آخری دم تک۔ تم اس بات کی گواہ ہو کہ میں

Waqas Azeem

کئی بار صارم کو یہ کہہ چکی ہوں کہ اگر وہ بچے کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو میری طرف سے مکمل آزادی ہے۔ بلکہ یہ حق انہیں دینے والی میں کون ہوتی ہوں جب کہ خدا نے انہیں یہ حق دے رکھا ہے۔ لیکن ہمیشہ وہ میری اس بات کے جواب میں مجھے یہ کہہ کر چپ کرا دیتے ہیں کہ اگر اولاد ہوئی تو تم سے ہی ہوگی میں کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

وہ اپنی صفائی پیش کر رہی تھی جبکہ ہانیہ اس کی گود میں سر رکھے چپ چاپ سب سن رہی تھی۔

”میری خواہش یہ ہے کہ سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے۔ اس بچے کے ساتھ اس کے والدین نے اچھا نہیں کیا لیکن ان شاء اللہ تعالی میری پوری کوشش یہ ہوگی کہ اس بچے کو وہ سب ملے جو اس کا حق ہے۔ اور تم جس کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے اپنے ایک غلط فیصلے کی سزا تمام عمر تو نہ بھگتو۔ تمہارے لیے بھی اس طرح آسانیاں پیدا ہو جائیں کہ تم پھر سے نارمل زندگی گزارنے لگو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر دھیمے لہجے میں بولی۔

”بھابھی آپ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کریں مجھے خود اپنے آپ پر شرم محسوس ہوتی ہے...... کہ میرے کیے کو سنبھالنے کے لیے آپ کو کیسے کیسے جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں۔“

عفرہ کی رنگت اس کی بات سن کر پل بھر کے لیے متغیر ہو گئی تھی۔

تم کیا جانو ہانیہ کہ میں کہاں کہاں اور کیسے کیسے جھوٹ بول کر دوسروں کے دکھ کم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اللہ میرے اس گناہ کو معاف فرمائے۔ اور میرے عمل کی کی سزا مجھے نہ ملے بلکہ میری اچھی اور صاف نیت کا اجر مولا مجھے دے۔

”اس بچے کی خوش نصیبی ہوگی کہ وہ آپ جیسی اچھی ماں کی گود میں پرورش پائے گا اور میرے بھائی جیسا باوفا مرد اس کا باپ ہوگا...... ورنہ تو نہ اس کی ماں اچھی عورت ہے اور نہ ہی اس کے مرحوم باپ میں وفا موجود تھی۔“ یہ بات سن کر وہ ہانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔

”ہانیہ اگر تم چاہو تو ہم اسفندیار کے شہر جا کر اس کی ماں بہنوں سے مل سکتے ہیں صارم بھی یہاں نہیں ہیں تمہیں شاید اس طرح سکون مل جائے۔“ وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں وہ جانے کی حامی ہی نہ بھر لے۔ لیکن ہانیہ کے نفی میں سر ہلانے نے اس کے سارے خدشات ختم کر دیے اور عفرہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

پانچ مہینے تک ہانیہ کو اس نے دنیا کی نظروں سے مکمل چھپا کر رکھا۔ پڑوس میں بھی ہر کسی کی طرف آنا جانا چھوڑ دیا تھا ان دونوں نے۔ سب کو یہ پتا تھا کہ عفرہ ماں بننے والی ہے اس لیے ہانیہ اس کی خدمت کرتی ہے اور عفرہ کو مکمل بیڈ ریسٹ کرنا ہے جس کی وجہ سے ہانیہ اسے اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔ اس بات پر وہ دونوں خدا کی شکر گزار تھیں کہ آخری مہینے سردی میں آئے تھے۔ سوئیٹر اور بڑی سی شال نے اس کے جسمانی خدوخال و نشیب و فراز چھپا رکھے تھے۔ گھر میں ملازمہ کوئی نہیں تھی۔ فلیٹس میں چوکیدار کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ایک چوکیدار پوری بلڈنگ کی چوکیداری کر سکتا ہے اس لیے تو وہ مکمل اطمینان سے یہ سارا وقت گزار رہی تھیں۔

ہاسپٹل سے ڈیلیوری کی ڈیٹ ملنے پر بھی عفرہ نے صارم کو نہیں بتایا کیونکہ وہ اس امکان کو بھی ختم کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں اچانک ہی انہیں سرپرائز دینے صارم بنا بتائے واپس آ جائیں۔

”صارم ابھی وقت ہے ڈاکٹرز کے مطابق وہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔“ وہ اس وقت بھی اسے یہ کہہ کر مطمئن کر رہی تھی جب ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ڈیٹ پر وہ ہاسپٹل کی طرف روانہ ہونے والے

تھے۔

وہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ خدا کرے ڈیلیوری نارمل ہو۔ کیوں کہ نارمل ڈیلیوری تو شوہر سے چھپائی جا سکتی تھی لیکن آپریشن کا چھپانا ناممکن سی بات تھی۔

وہ لمحے بہت تکلیف دہ تھے جب وہ دردزہ میں تڑپتی ہانیہ کا ہاتھ پکڑے اپنے آنسووں کی زبان سے اسے تسلی دے رہی تھی کیونکہ تسلی اور دلاسے کے لفظ ختم ہو چکے تھے وہ اسے کیا کہتی؟ اک جملہ بھی تو نہ تھا اس کے پاس۔ اسی لیے تو چپ تھی لیکن آنسووں پر اس کا اختیار ختم ہو چکا تھا یہ آنسو اس بچے کی بدقسمتی پر بھی بہہ رہے تھے جس کا کوئی والی وارث نہ تھا ماں کے سوا۔

لیبر روم کے باہر بے قراری سے ٹہلتی عفرہ کے ہاتھ بار بار دعا کے لیے اٹھ رہے تھے وہ زبانی یاد۔ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی کہ نرس نے بیٹا پیدا ہونے کی خبر سنائی۔

”مریضہ بھی بالکل ٹھیک ہیں اور بچہ بھی۔“

یہ ہی وہ الفاظ تھے جن کے سننے کے لیے سماعتیں منتظر تھیں۔ وہ سربسجود ہو کر اللہ کا شکر ادا کرتی رہی کہ سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا اس نے سوچا تھا۔

بچے کی پیدائش کی خبر پر صارم کی خوشی انوکھی تھی وہ بار بار کیمرے میں اسے دیکھتا اور اسے چھونے اسے اٹھانے اور سرخ گالوں کو چومنے کی حسرت اسے بے قرار کر دیتی لیکن عفرہ اسے تسلی دیتی کہ فقط چند مہینوں کا فاصلہ ہے۔ ہانیہ اس سے بالکل لاتعلق نظر آتی لیکن جب وہ عفرہ کی گود میں ہوتا اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کئی بار اس نے پکڑا تھا۔

”اس کا نام کیا رکھیں گے ہانیہ؟“ وہ اس سوال پٹپٹائی۔

”جو آپ کو پسند ہو بھابھی۔ آپ کا بچہ ہے۔“ وہ بے زار انداز میں بولی تو عفرہ نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر سر اونچا کیا تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر گالوں پر پھیل گئے۔

”ہانیہ! تم دونوں نے مستقبل کے بارے میں مل کر جو خواب دیکھے تھے ان خوابوں میں اس بچے کا ذکر ضرور ہوا ہوگا کیونکہ نکاح کے فوراً بعد ہی میاں بیوی کے درمیان بچے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے کسی لمحے میں بیٹا یا بیٹی کے لیے نام بھی پہلے سے سوچا ہوا ہوتا ہے والدین نے۔ ہماری جب شادی ہوئی تو پہلے مہینے میں ہی میں نے اور صارم نے اپنے ہونے والے بچے کا نام سوچ لیا تھا۔“ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”اسفند نے کہا تھا جب ہمارا بیٹا ہوگا تو اس کا نام شہریار اور بیٹی ہوگی تو اس کا نام وانیہ رکھیں گے۔“ وہ بھیگے لہجے میں دھیرے سے بولی۔

”تو پھر طے ہوا کہ اس کا نام شہریار صارم ہے۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی۔

☆☆☆

”ارے۔ آج میری آپا نے کیسے یاد کر لیا؟“ دوسری طرف سے یاسر مراد کی شوخ آواز نے عفرہ کا موڈ خوش گوار کر دیا۔

”میرے بھائی تمہاری آواز میں اتنی انرجی ہے کہ بندہ سوتے سے جیسے جاگ جاتا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تم کہیں مل سکتے ہو آج؟“

”جی حکم کریں تو ابھی آ جاؤں گھر پر؟“

”نہیں کہیں باہر ملتے ہیں چند منٹ کے لیے۔“

”ٹھیک ہے جیسا حکم۔ میں حاضر ہو جاتا ہوں ابھی۔ لیکن اپنے شیطان بیٹے کو اس کی سستی کی ماری پھوپو کے پاس چھوڑ کر آئیے گا ورنہ تو اس نے سیدھا میری وگ کو پکڑ لینا ہے۔ یاد ہے نا سفینہ آپا کہ بیٹی کی شادی؟ اس شیطان کو پپی کے لیے اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے حسین و جمیل شہزادے کی جگہ گنجا سا جوکر لوگوں کی نظروں کا مرکز

بن گیا تھا۔" دونوں ہنسنے لگے اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے۔

"نہیں وہ گھر میں ہی رہے گا...... ویسے سب کو پتا ہے کہ تمہارے بال عین عالم شباب میں گر رہے ہیں بلکہ گر چکے ہیں۔" وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم شروع سے ہانیہ کو پسند کرتے ہو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب بھی وہ پسندیدگی باقی ہے یا......؟" عفرہ نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

یاسر مراد عفرہ کی پھوپو کا بیٹا تھا بزنس مین اور امیر کبیر پڑھا لکھا۔ قدرے فربہ بدن۔ لیکن ایک کمی نے اس کی ساری شخصیت کو بگاڑ کر رکھا ہوا تھا اور وہ کمی تھی بالوں کی۔ جب پھوپو اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں تب ہانیہ نے اس کا خوب مذاق بنایا تھا۔

"صارم بھیا! بھابی کو سمجھائیں پلیز۔ اللہ گنجے کو ناخن اسی لیے تو نہیں دیتا نا۔"

عفرہ کی رنگت اس طرح مذاق اڑانے پر متغیر ہوئی لیکن وہ نظر انداز کر گئی کیونکہ وہ کسی بھی طرح کی بدمزگی سے ہمیشہ بچنے کی کوشش میں رہتی تھی۔

"میری سہیلیوں کو خبر ملے تو ان کی انگلیوں میں کھجلی شروع ہو جائے یاسر کے سر پر چماٹ مارنے کے لیے۔"

"تو میں انکار کر دوں؟" عفرہ کے پوچھنے پر وہ بڑے مغرورانداز میں بولی۔

"صرف انکار نہ کریں بھابی، بلکہ یہ بھی کہنا کہ اگر دنیا کے سارے مرد ختم ہو جائیں اور آخری آدمی یاسر مراد رہ جائے تب بھی میں ان سے شادی کی حامی نہیں بھروں گی۔" اسی پل عفرہ نے اللہ سے اس بڑے بول پر معافی مانگتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔

"اے اللہ اس کم فہم لڑکی کی جگہ میں معافی مانگتی ہوں اسے ان بڑے بولوں کی سزا نہ دینا۔ لیکن توبہ تو اپنی اپنی ہوتی ہے جیسے گناہ اپنے ہوتے ہیں۔

آج وہ اسی یاسر مراد سے ہانیہ کے رشتے کی بات کر رہی تھی۔

"آپا جی۔ میری پسند ناپسند سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ہانیہ پر منحصر ہے ورنہ میں تو برسوں سے اس کی ہاں کا منتظر ہوں۔ امی بھی اسی آس میں مر گئیں میں نے ان کی خوشی کو اپنی خوشی کے لیے نظر انداز کر دیا تھا جس کا بوجھ دل پر ہمیشہ رہے گا۔" وہ اداس تھا۔

"اب وہ اگر مان جائے تو؟" عفرہ نے استفسار کیا تو یاسر مراد کی جیسے مراد بر آئی۔

"اس نے میرے گنجے پن پر بڑی جگتیں ماری ہیں بڑی بے عزتیاں شیز تیاں کی ہیں لیکن میں آج بھی اسی سے محبت کرتا ہوں...... کسی بھی فیملی فنکشن میں اسے چوری چوری دیکھ کر اس کی حسین مسکراہٹ کا صدقہ دیتا ہوں دل ہی دل میں دعائیں مانگتا ہوں کہ اسے کوئی بالوں والا ہرگز پرپوز نہ کرے اور اگر میرے علاوہ وہ کسی کی ہو بھی تو میں اسے مکافات عمل سمجھ کر خوش ہوتا رہوں۔ ویسے آپا آپ کے میاں بھی بالکل بہن کی کاپی ہیں۔" وہ چپ ہوا تو عفر مسکرانے لگی۔

"مطلب پھر تو تمہیں صارم سے بھی محبت ہوگی ہے نا؟" وہ منہ بنا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"مجھے مغرور لوگ قطعی پسند نہیں ہانیہ کے علاوہ۔"

"اچھا فضول باتیں ختم کرو، میرے پاس وقت نہیں۔ شہریار، ہانیہ کو تنگ کر رہا ہوگا۔ تم کہو تو میں رشتے کی بات کرتی ہوں...... ہانیہ اب بہت میچو ہو چکی ہے۔"

وہ اسے دیکھنے لگا۔

"ایک بات پوچھوں آپا؟"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"وہ شاید یونی میں کسی لڑکے کو پسند کر

ہے۔“

عفرہ کا رنگ اڑ گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ اس کی آواز لرز گئی تھی یاسر مراد سے یہ پوچھتے ہوئے۔

”یار آپا۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی خبر بھی تو رکھی جاتی ہے۔ اس کی یونی میں میرا ایک دوست پڑھتا تھا اس نے بتایا کہ وہ کسی اسفندیار نامی لڑکے کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ بہت قابل لڑکا تھا وہ اور بہت خوبصورت بھی، لمبے گھنے سلکی بالوں والا۔“

یاسر مراد اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تو چند لمحے اس نے یہ سوچنے میں لگائے کہ اب کون سا جھوٹ بولے کہ سب ٹھیک ہو جائے خواہشوں کی چھڑی پر امید کا جادو چڑھا کر سارا منظر بدل دے۔

”وہ بہت اچھا لڑکا تھا اسی کی وجہ سے ہانیہ سب رشتوں کو انکار کرتی رہی اور واقعی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“ اس کے اعتراف پر یاسر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”تو پھر کیا ہوا ہے ایسا کہ آپ مجھ سے رشتے کی بات کر رہی ہیں۔؟ وہ اپنے ناخنوں پر نظریں ائے چند پل کچھ سوچتی رہی۔

”ایک ایکسیڈنٹ میں مرگیا تھا وہ۔“ اس کی اداس لہجے میں سنائی گئی خبر نے یاسر کو حیران و پریشاں ر دیا۔

”اوہ خدایا۔“ یاسر مراد کو بہت افسوس ہو رہا تھا

”ہانیہ تبھی تو بہت بدلی بدلی لگنے لگی ہے۔ یہ ا سی لڑکی کیا کچھ سہہ رہی ہے اپنے دل پر اور وں کو احساس بھی نہیں ہونے دے رہی۔“

وہ پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ل

”یاسر...... تم جیسا جیون ساتھی اسے زندگی کی واپس لاسکتا ہے اور وہ تمہاری محبت کی چھاؤں تلے ستانے کے لیے تیار ہو گئی تو وہیں ڈیرہ جمانے پر تم اسے مجبور کر سکتے ہو۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے میری تو دلی خواہش ہی یہ ہے۔“

”یاسر تم اسے کبھی شہریار کا طعنہ تو نہیں دو گے نا؟“ اس سوال پر وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے افسوس بھرے انداز میں بولا۔

”آپ نے ابھی تک اپنے بھائی کو پہچانا ہی نہیں آپا۔ آپ جیسی بہن کا بھائی ہوں میں۔“

وہ مکمل مطمئن ہو کر گھر واپس آئی تھی۔ کیونکہ ہانیہ سے وہ پہلے ہی بات کر کے اسے سمجھا چکی تھی۔

☆☆☆

”بھابھی! کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے بہت کچوکے لگاتا ہے کہ میں اتنے پیار کرنے والے شوہر کو کبھی سچ بات نہ بتا سکی۔ یاسر مجھے بہت چاہتے ہیں اور مجھ پر بہت بھروسا بھی کرتے ہیں۔ لیکن میرے ضمیر پر پڑا بوجھ مجھے ہمیشہ بے قرار رکھتا ہے۔ میں کیا کروں؟“

وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے سامنے دل کھولے بیٹھی تھی۔ ہانیہ کی گود میں دو سالہ وانیہ سو رہی تھی اور باہر لان میں شہریار کے ساتھ صارم اور یاسر دونوں کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”میں نے کہا بھی ہے کہ دیواروں پر بھی بھروسا نہ کیا کرو، ایک غلطی تھی وہ ہو گئی، اب اسے سدھارنے کے لیے ...... رشتے بچانے کے لیے اسے بھولنا پڑے گا۔

تکلیف دہ یادیں ذہن سے یوں صاف کر دینی چاہئیں، جیسے کپڑے سے سلیٹ پر لکھی تحریر صاف کر دی جاتی ہے...... عورت کی ذرا سی لغزش تمام عمر ماتھے کی کالک بن کر اسے ہزاروں میں الگ سے پہچان دے دیتی ہے...... تم ہزاروں میں شامل رہو کیونکہ تمہاری پیشانی کی کالک تمہاری بھابھی نے اپنے دوپٹے سے پونچھ لی تھی اور دوپٹا بدل لینا مشکل نہیں ہوتا۔ سو الحمدللہ...... ہم دونوں اپنی زندگیوں میں مطمئن ہیں۔ کوئی مرد اتنا اعلا ظرف نہیں ہوتا کہ

وہ عورت کی لغزش معاف کر سکے چاہے وہ بھائی ہو یا شوہر ہو۔“

”بے شک وانیہ نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے اور اسے میں بالکل آپ جیسا بناؤں گی دوسروں کے لیے خود کو مٹانے والی عورت کیونکہ جو خوشی دوسروں کو خوش کر کے نصیب ہوتی ہے وہ انمول ہے۔“

وہ ہنس دی۔

”پگلی دوسرے کون؟ تم تو میری اپنی ہو...... صارم کی بہن، میری بہن اور اس کی عزت، میری عزت۔“

وہ مسکرا دی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ عفرہ کی بچت کا ایک بڑا حصہ ایک بے نام لفافے کی صورت اسفند یار کی ماں بہنوں کے پاس ہر مہینے جاتا تھا اور اس لفافے کی خوشبو سے ہی ایک بوڑھی اور غریب عورت پہچان لیتی تھی کہ کس نے بھیجا ہے اور کیوں بھیجا ہے وہ کبھی سوچتی تھی کہ ایک بار ضرور اسفند یار کی ماں کے پاس اس کے پوتے کو لے کر جائے گی اور اسے یہ بتائے بغیر کہ یہ کون ہے کہے گی پلیز اماں جی اس بچے کو اپنے سینے سے لگا کر میرے ضمیر کے بوجھ کو کم کر دیں۔ لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے سے اسے ایک ہی بات اب تک روکے ہوئے تھی کہ جو عورت اس کے بھیجے ہوئے لفافے کی خوشبو سے اسے پہچان لیتی ہے وہ اپنے پوتے کے بدن کی خوشبو میں اسفند یار کو کیسے نہ ڈھونڈ پائے گی؟

اسے یاد تھا وہ دن۔ اسفند کی بہن کو اپنا نمبر دے کر آئی تھی یہ کہہ کر کہ کوئی بھی ضرورت ہو مجھے فون کر لینا اس کے نمبر پر بے نام نمبر سے کال آئی تھی

”تم اب مزید پیسے نہ بھیجا کرو بیٹی۔“ پہلی بات ہی یہ کی انہوں نے۔ ان کی آواز بالکل ویسی ہی تھی جیسی وہ برسوں پہلے آمنے سامنے سن چکی تھی۔

”میں نے تو کوئی پیسے نہیں بھیجے۔“ وہ سٹپٹا کر فوراً بولی تو وہ دھیرے سے ہنس دیں۔

”پھر لفافے سے اٹھتی تمہارے ہاتھوں کی خوشبو جھوٹی ہوگی۔“

وہ چپ رہی کچھ کہہ نہ پائی۔

”اب دونوں اپنے گھر کی ہوگئی ہیں اللہ کا شکر ہے مشکلیں آسان ہو چکی ہیں۔“ ان کی آواز میں سکون تھا۔

”آپ، اکیلی رہ گئی ہیں نا؟“ اس کے استفسار پر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔ ”ساری ماؤں کا نصیب تنہائی ہی ہوتی ہے۔“

”میرے پاس آجائیں نا؟“ اس نے سچے دل سے کہا تو......

وہ ہنس دیں۔

”تیری خوشبو ہر مہینے مجھ سے ملنے آجاتی ہے اب میں کس لیے آؤں؟“

عفرہ نے چھیڑا۔

”اب تو حکم ہوا ہے کہ لفافے نہ آئیں پھر خوشبو کیسے پہنچے گی؟“

”وہ لفافے میرے تکیے تلے پڑے ہیں، بے شک خالی ہیں لیکن رپیوں کے بغیر خوشبو زیادہ تیز ہوتی ہے۔“

”گزارا کیسے ہو رہا ہے اب؟“ اس کے استفسار نے انہیں چند پل کے لیے چپ کرا دیا۔

”اپنی بھوک اور ضروری چیزوں کی تڑپ اتنی تکلیف دہ نہیں ہوتی جتنی اولاد کی آنکھوں سے جھانکتی حسرت تکلیف دیتی ہے اب مجھے زیادہ پروا نہیں اب تو میں ہی ہوں نا۔“

”اماں جی! بے شک لفافہ بانٹ دیجیے گا لیکن وصول ضرور کرنا ہے ہر مہینے۔ کیونکہ خوشبو کو بھی فرق تو پڑتا ہے کسی بہت پیارے کے ہاتھوں میں بسنے کی آرزو تو اسے بھی ہوتی ہے۔“ عفرہ نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا اور ان کا نمبر دادی کے نام پر سیو کر لیا۔

☆☆

شمائلہ دلعباد

عہد رفتہ

پھوپھو، پاپا بتاتے ہیں آپ لوگوں کا بچپن گاؤں میں بہت شاندار گزرا ہے۔ بہت مزے کرتے تھے آپ بہن بھائی۔"

"مزے تو میں نے کیے ہیں تم لوگوں کے باپوں نے تو نظر بندیاں سہی ہیں اور مار کھائی ہے۔ کبھی کبھی تو ان کی مروت میں میں نے بھی کھائی ہے۔" ماہین ہنستے ہوئے بھتیجے بھتیجیوں کو بتانے لگی۔

وہ پانچ سال بعد ڈلاس سے آئی تھی اور کافی خوش تھی۔ میکے میں پانچوں بھائیوں کی اولادیں بڑی ہو چکی تھیں۔ سب بچے اپنی اسمارٹ اور حاضر جواب سی پھوپھو سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ بھرا پرا کنبہ، خوش حال میکا ماہین کے قلبی اطمینان کو کافی تھا۔

"رافع۔ ہم یہاں باجماعت ارتغرل دیکھنے کے لیے بیٹھے ہیں، ڈیٹول کی مشہوریاں دیکھنے نہیں۔ ابھی وقت ہے تو چینل ہی بدل دو۔" ٹھنڈی میٹھی کھیر کے پیالے ہاتھوں میں پکڑے لاؤنج میں سب بچے کس لیے جمع تھے یہ ماہین کو اب سمجھ میں آیا۔

"بڑے بھیا۔ جتنی مرضی کمرشل دیکھ لو بقلم خود نہاؤ گے تو بدبو جائے گی۔"

"اوئے، اردو دان۔ بقلم نہیں بذات خود..... میں بذات خود تین بار ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نہاتا ہوں۔"

"رافع بھائی۔ تین بار نہیں تین دن بعد۔" زینی نے آنکھیں نچائیں۔

"ان کو چھوڑیں پھوپھو، آپ ارتغرل دیکھتی ہیں؟"

"میں دیکھتی نہیں دکھاتی ہوں۔ خود پوری فلم ہوں، ڈرامہ کیا دیکھوں۔ مقام شکر ہے بچوں ہمارے وقت میں ارتغرل نہیں تھا ورنہ جس خضوع و خشوع کے ساتھ اماں دیکھ رہی ہیں یقیناً اپنا سارا ارتغرل پن ہم پر نکالتیں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ہماری لھکائی کیا کرتیں۔ ان کی نظر میں ہم سے بڑا کوئی منگول، کوئی صلیبی نہیں تھا۔" سب بچوں نے قہقہہ لگایا۔

ہم لاکھ چھپائیں پیار مگر
دنیا کو پتا چل جائے گا
لیکن چھپ چھپ کے ملنے سے
ملنے کا مزا تو آئے گا

"ارے یہ گانا تو تمہارے تایا ابو کا فیورٹ ہے۔ اس سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

"کیسی یادیں پھوپھو۔" سب نے اشتیاق سے پوچھا تو ماہین عرف مانو سالوں پیچھے پہنچ گئی۔

☆☆☆

سیمنٹ کی الماری میں چار خانے ہوتے تھے۔ تیسرے نمبر کا خانہ ڈیک اور کیسٹوں سے اٹا پڑا ہوتا تھا۔ دیہات میں گھروں میں ڈرائنگ روم رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ بیرونی دروازے کے ساتھ بیٹھک (ڈرائنگ روم) کا دروازہ تھا۔ آگے سرخ اینٹوں کا پکا تھڑا تھا۔ جس پر کرسیاں رکھ کر کبھی کبھار ابو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتے تھے لیکن زیادہ تر ہم بہن بھائیوں کا غاصبانہ قبضہ رہتا تھا۔ بیٹھک میں ہمہ وقت دو سے تین بھائی موجود ہوتے تھے اس کا مطلب ڈیک آن رہتا تھا، موسیقی چلتی رہتی تھی۔

بڑے بھائی کا تسلط بالکل مسلمانہ تھا۔ باقی ان سے چھوٹے اور سب سے چھوٹی میں، ان کی تابعدار رعایا کی عظیم مثال تھے۔ ہمارے گھر میں سب کے سب کبرو جوان تھے، میں تو کسی کھاتے میں نہ تھی چنانچہ ماں کو نہایت کم عمری سے ہی بھائیوں کی کڑی نگرانی کرتے پایا۔

اماں کا حکم تھا لڑکیوں کی چھٹی ہوتے ہی بیٹھک کا دروازہ اگر کھلا ہے تو بند کر دیا جائے کیونکہ لامحالہ لڑکیوں کو ہماری بیٹھک کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا۔ تم لوگوں کے باپ اپنی طرف سنجے دت، وحید مراد اور شاہ رخ بنے رہنے کی پوری پوری کوشش جاری رکھتے تھے۔

سب سے زیادہ پڑھے لکھے بزعم خود میرے بھائی ہی تھے، ذہین فطین۔ ٹیوشن کا رواج رتی بھر نہ تھا ورنہ قسم اٹھوا لو پورے علاقے میں ٹیوٹر ہمارے گھر سے سپلائی کیے جاتے۔ آٹھویں کے بورڈ میں انگلش، میتھس فیل لڑکیاں گھر بیٹھ کر سلائی کڑھائی نہ سیکھتیں مگر خط پتر لکھنا ضرور سیکھ لیتیں۔"

"اب اس بات کا کیا مطلب پھوپھو؟ کیا ان کو خط نہیں لکھنا آتا تھا؟"

وہ سب یوں متوجہ تھے جیسے درس سن رہے ہوں۔

"لو یہ بھی نہیں بتایا تمہارے باپوں نے۔"

ماہین جی بھر کر بدمزا ہوئی۔

"ایسی کیا خاص بات ہے پھوپھو، جو آپ یوں منہ بنا رہی ہیں۔"

"ایک خاص قصہ ہے، پہلے وہی سن لو۔ یاد آیا اس گیت سے بھی گہرا تعلق ہے ایسے قصوں کا۔ وہ ایک گرم دوپہر تھی جب میں اسکول سے گھر آئی تو اماں نے کھانا دینے سے پہلے مجھے رازداری سے اندرونی کمرے میں بلایا۔ ایک بار تو لگا اماں ہماری پسلیاں توڑنے والے قول کو عملی جامہ چھپ کر پہنانا چاہتی ہیں۔ مجھے بس ایک پریشانی تھی کہ اکیلی میرے حصے میں یہ رواداری کیوں آرہی ہے۔ پھر جو اماں نے صندوق میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا اور ساتھ میرا دایاں کان پکڑ لیا۔

"پڑھ کر سناؤ اس چٹھی میں کیا لکھا ہے۔ خبردار! جو غلط پڑھا۔ میسنی بھائیوں کی سگی، جلدی پڑھ۔"

میں نے جونہی ورقہ کھولا سامنے لال مار سے ٹیڑھا میڑھا دل بنا تھا۔ اس دل میں سبز رنگ سیاسی تیر مارنے کی تک مجھے یہی سمجھ آئی کہ یہ الیکش کمپین ہے۔"

"دل نہ دیکھ، رقعہ پڑھ کے سنا۔" اماں چ میرے چھوٹے چھوٹے بوائے کٹ بالوں کو چ میں پکڑ کر کھینچا۔ "دیکھو تو کس کے نام ہے یہ خط۔"

"ادھر تو میری جان لکھا ہوا ہے۔"

"آ لینے دو ان کو آج ان کی جان تو میں نکا ہوں۔" اماں نے دھمو کا جڑ کر خط واپس قبضے میں

گیا۔

☆☆☆

”چلو...... چھوٹے خبیث۔ تم مجھے یہ خط پڑھ کر سناؤ ذرا۔ کیا لکھا ہے، کس نے لکھا ہے، کس کو لکھا ہے؟ بہن کے سامنے پڑھو تا کہ حیا تو آئے کیسے کسی کی بہن بیٹی کو ورغلاتے ہیں۔“

”اماں ہم نے نہیں لکھا۔“ سب بھائی یک زبان تھے۔

”بیٹھک کے دروازے کے سامنے سے ملا مجھے، اس بات کو کیا سمجھوں۔“ اماں بپھری کھڑی تھیں۔

”تم سب سارا دن ساری رات بیٹھک میں گھسے رہتے ہو۔ تان سین کے جانشین بن کے رات دن راگ بھی چھیڑے رکھتے ہو اور کون اتنا خراب ہے ادھر، خود بتاؤ؟ تمہارا باپ اس عمر میں کسی کو خط لکھے گا کیا؟ ابھی پتا چل جائے گا کون عاشقی معشوقی کر رہا ہے دیکھنا کیسے گردن توڑتی ہوں۔ مجھے وہ ماں نہ سمجھو جو سب غلط سلط برداشت کر لیتی ہے ایک بار مجھے پتا چلنے دو کس کو آیا ہے یہ رقعہ؟ پڑھو اس کو لوٹے کے سر والے۔“ اماں تیرے پاپا کو لوٹے کے سر والا کہتی تھیں۔“ ماہین نے بھتیجی کو بریف کیا تو وہ سٹپٹا گئی۔ باقی سب قہقہہ لگا کر ہنسے۔

”فانی کا سر بہت لمبا ہے ناں۔ اماں نے بڑی محنت کی سر بٹھانے کے لیے۔ چھلے میں بھی ساری ساری رات جاگ کر سر سیدھا رکھتی تھیں۔ ابھی بھی کہتی ہیں کہ ”پھر بھی سر نہ بنا، لوٹا ہی بن سکا۔“

ایک تو ماہین کا انداز بڑا دلچسپ تھا، اوپر سے بات ایسی کہ سارا لاؤنج بلند آہنگ ہنسی سے گونجنے لگا۔

”پھوپھو۔ خط کا بتائیں ناں؟“ شافع سے مزید صبر نہ ہوا۔

”ہاں تو میں کہاں تھی؟“

”فانی چاچو خط پڑھنے لگے تھے۔“ کسی نے لقمہ دیا۔

”لو بھلا اماں کو کیا سمجھتے ہو۔ انہوں نے جھٹ وہ خط فانی سے چھین لیا۔ ان کو وہم ہو گیا تھا فانی صحیح نہیں پڑھے گا بلکہ نام چھپا کر بھائیوں کو بچا لے گا، اس لیے بھائیوں کے سامنے مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ سب بھاگنا چاہتے تھے۔ بہن عاشقی معشوقی والا خط پڑھے تب ایسا سین نہیں ہوتا تھا۔ پر اماں کا ڈنڈا سب کا پیر تھا۔ وہ کہتی تھیں بہن پڑھے گی تو ہی ان کو احساس ہو گا کیسے کسی دوسرے کی بہن بیٹی کی عزت کرنی ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

میری جان اے۔

آگے پڑھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بچوں۔ اوپر لال تیر جڑا دل اور نیچے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔“

”کیا!!!!!......“ سارا لاؤنج چیخوں سے گونج اٹھا۔

”ارے بتایا جو تھا لڑکیاں کون سا اتنا پڑھی لکھی تھیں۔ ایسی ہی کسی بے شعور لڑکی کا خط تھا اے نامی صاحب کے لیے۔“

”اچھا پھر آگے کیا ہوا پھوپھو؟“ سب کا اشتیاق عروج پر تھا۔

”پھر کیا۔ اماں کو کون سا میرا اٹکنا سمجھ میں آ رہا تھا البتہ بھائی مشکوک ہو چکے تھے۔ انہیں یہ گڑبڑ سمجھ میں آ رہی تھی۔

اماں کا زوردار دھموکا مجھے روانی سے پڑھنے پر مجبور کر گیا۔

”میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ آپ مجھے اپنی ایک تصویر دے دیں۔“

پانچ نفوس قہقہوں سے لم لیٹ ہو گئے یہاں تک کہ اماں بھی منہ پر کپڑا رکھے قہقہوں میں شریک ہو گئیں۔

”بلی، یہ کیا پڑھ رہی ہو؟“ ہنسی کا طوفان تھمتا اور پھر سے شروع ہو جاتا۔

”آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد......“

”بس بس بہن بس۔“

سب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہرے ہوئے کھڑے تھے۔

”میں غلط نہیں پڑھ رہی بھائی لوگوں۔ ہر آپ پر چھوٹا صواد لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب درود پاک ہی ہوتا ہے نا۔“

میری معصومیت گویا عروج پر تھی۔ میں نے خط فضا میں یوں لہرا کر دکھایا جیسے میں فلموں میں ایسے سین دیکھا کرتی تھی۔ اماں اب ہنسی سے سنبھل چکی تھیں۔

”نیچے دیکھ بلی کس کا نام ہے؟“ اماں نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ایسی دین دار بچی کون ہے؟“

”فقط آپ کی این لکھا ہے اماں۔“

اس دن اماں کی عدالت اس لیے برخواست ہو گئی تھی کہ تین بھائیوں کے نام اے سے تھے سات محلے کے لڑکوں کے جبکہ محلے کی تیرہ لڑکیوں کے نام این سے شروع ہوتے تھے۔ اب بھلا اماں کس کی ماں کو ماسی کہتیں۔ اس لیے بھائیوں کو وارننگ اور لیکچر دے کر چھوڑ دیا گیا۔ ساتھ ہی اماں نے یہ بتانا مناسب سمجھا کہ دوسرے گاؤں سے بھاگنے والا جوڑا پکڑا گیا ہے۔

”اماں وہ جو گرز پہن کر بھاگتے تو میرا دعوا ہے کبھی نہ پکڑے جاتے۔“

فانی کی زبان نے ہم سب کی سینکائی کروادی۔ اماں مار میں بھی انصاف کی قائل تھیں ایک سے شروع ہو کر آخر تک اطمینان سے جاتی تھیں۔“

☆☆☆

”وائے محلے کی لڑکیوں کی قسمت یا پتا نہیں میرے بھائیوں کی قسمت وہ کسی کے ٹیوٹر نہ بن سکے۔ لوگوں کو لڑکیوں کی ٹینشن ہوتی تھی، میری ماں کو بھائیوں کی...... ویسے بھی اس خط والے واقعے کے بعد اماں زیادہ ٹینشن لینے لگی تھیں۔ ابو سے تو انہیں گلہ ہی رہتا تھا۔

”مانو دے ابو تو انوں کوئی پروا ای نئیں لڑکے کوئی چن نہ چڑھادیں۔“

”سکون نال بیٹھی رہا کر۔“ ابو کہتے۔ ”تیرے ہندے سورج نہیں نکلدا، چن کی چڑھنا۔“

بڑے برادر کو یہ گانا بہت پسند تھا اور باقی ہم برادرانہ ہمدردی کے تحت بلا مبالغہ بیس بار سنتے تھے۔ باوجود اس کے اندرونی دروازہ بند ہوتا تھا تاکہ گانے کی آواز کم سے کم گھر میں جائے پھر بھی ریپیٹ ٹیلی کاسٹ ماں تک پہنچ جاتا تھا۔

ایک دن بڑے بھائی ہاسٹل سے گھر آئے ہوئے تھے۔ ان کا اب خصوصی پروٹوکول تھا۔ اماں کو بھائی پردیسی لگنے لگا تھا سو وہ دعوتی کھانا بنایا کرتی تھیں۔ جس ویک اینڈ بھائی آجاتے تھے اماں نت نئے کھانے بنا کر خوشی کا اظہار کرتی تھیں اور ہم ڈیک انہیں ہینڈ اوور کر کے خوش کرتے تھے۔ اس وقت اب کی طرح نمبرز والا سسٹم تو تھا نہیں، ڈیک کے پاس بیٹھ کر گانا پیچھے کر کے سننا پڑتا تھا۔ بار بار کیسٹ ریوائنڈ کرنے کے لیے شیلف کے پاس کرسی رکھی رہتی تھی تاکہ اپنی پسند کا گانا ریپیٹ کرنے کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اطمینان سے آگے پیچھے کیا جائے۔ اس وقت کرسی صدارت پر بڑے بھائی تشریف فر تھے کہ دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ ہمارے گھر کے سلطان راہی کی اینٹری ہوئی اور پھر چراغوں میں روشنی ن رہی۔

آٹے سے لتھڑے ہاتھوں نے آؤ دیکھا ت تاؤ، متھن چکرورتی والا ایکشن سین دہرایا۔ میں او بھائی حیران ہوا کرتے تھے ہماری ماں نے شمیم آر تک کو نہیں دیکھا اور ایکشن سین وہ سلطان را والے کرتی تھیں۔ ان کے ڈائیلاگ کیا کسی اعلا پا کی مصنفہ کے ہوا کرتے۔

”نامرادو بے حیاؤ...... نہ اللہ نہ توبہ، چھپ چھپ کر مل لو، سکھاؤ اس میسنی کو اپنے کرتوت...... بن جاؤ میراثی۔ ڈھول بینڈ باجے لے آؤ، لگاؤ نسلو کو لیک۔ تم جیسے دیہاڑیاں کرتے پھر رہے ہی مزدوری کر رہے ہیں تسی میراثی بنے پھرو۔“

ٹھاہ دھمو کا بھائیوں کے۔ ٹھاہ دھمو کا میرے...

''اس کی جیسیاں سارا گھر سنبھال رہی ہیں اس کو چینی والا ڈبا نہیں ملتا۔ کسی کیسٹ کا کہہ دو ابھی ڈھونڈ کر لادے گی۔''

جانے کیا بات تھی مجھے جب بھی اماں کوئی چیز لانے کا کہتیں وہ چیز سلیمانی ٹوپی پہن لیتی جبکہ اماں وہی چیز جانے کس محدب عدسے سے دیکھتی تھیں کہ سامنے پڑی ملتی تھی۔

''پھوپھو۔ یہ تو ہمارے ساتھ بھی ہوتا ہے۔''

''یہ تو ہوگا۔ لیکن اب میرے ساتھ نہیں ہوتا۔''

''یہی تو قیامت ہے۔''

کسی نے ساتھ مصرعہ جوڑا تو لاونج پھر سے قہقہہ بار ہوگیا۔

''پھوپھو۔ اب ایسا بھی کوئی خاص نہیں ہے اس گانے میں کہ بیس بار سنا جائے۔ میں نے سنا ہوا ہے۔''

''بیٹا۔ گانے میں بھلے کوئی خاص بات نہ ہو، ریپیٹ ٹیلی کاسٹ میں تو ہوسکتی ہے نا۔''

''او مائی گاڈ...... یعنی تایا ابو یہ کسی کو سنایا کرتے تھے کہ میں آگیا ہوں ہوسٹل سے۔''

''پھوپھو آپ چھت وت نہیں چیک کرتی نہیں...... کیا پتا ادھر کوئی چاند نکلتا ہو۔''

''چاند واند کا پتا نہیں لیکن ہمارے تایا ابا سرے محلے سے ضرور آجاتے تھے اور آتے ہی ے بھائی سے یہی پوچھتے تھے ہر تیسرے ہفتے...... آگیا تو پروفیسر بن کر۔''

''تو وہ آگے سے کہتے ہوں گے، نہیں ابھی پروسیس (کام جاری) ہوں۔''

''واہ۔ بچے کوئی پانچ فیصد پھوپھی پر چلے ہی پچانوے فیصد ننھیال پر ہوڈل اور کند

''پھوپھو میں سمجھتا تھا آپ روایتی پھوپھو نہیں طعنے نہیں دیتی ہوں گی۔'' شافع نے منہ

''لو بیٹا۔ میں بھی اسی گولے پر رہتی ہوں مریخ سے نہیں آئی، میں تو طعنے اور کھانے کا حق ادا کرنے کی قائل ہوں۔ چلو بھاگو اب ادھر سے میں ذرا لڑکیوں سے گپ شپ لگالوں ڈرامہ تو ویسے بھی ختم ہوگیا۔''

''ادھر آؤ شیزا...... کب سے فون میں گھسی ہوئی ہو ذرا پھوپھو کے پاس بھی بیٹھو۔''

''پھوپھو...... شیزا کہانی پڑھ رہی ہے۔''

''مجھے بھی بتاؤ، میں بھی پڑھ لوں۔''

''وہ...... وہ...... پھوپھو...... میں نے فیس بک کا وہ کہانی والا گروپ ہی چھوڑ دیا۔''

''اچھا کیا۔ لوگوں نے ایسے ایسے تحریری واہیاتی ثبوت چھوڑے ہوئے ہیں کہ بخشے نہ جائیں گے۔''

''پھوپھو۔ آپ فتویٰ نہ لگائیں۔''

''ارے۔ میں تو ایسوں کو جوتے لگاؤں جوتے مگر پہلے تم میرے سر میں ذرا تیل تو لگاؤ۔''

دونوں لڑکیوں نے سٹپٹا کر ایک دوجے کو دیکھا۔

''ٹکر ٹکر کیا دیکھتی ہو؟ ذرا تیل والی شیشی تو لا، پھر ڈائجسٹ بتاؤں گی۔ وہ پڑھنا ایک دم سگھڑ ہو جاؤ گی میری طرح اور عقل بھی دیکھنا کتنی جلدی آئے گی۔ اوہ ہاں، یاد آیا بچوں کیا تم دونوں کی عقل داڑھ آگئی؟''

''نن...... نہیں۔ پھوپھو۔''

''لو جن کی عقل داڑھ نہیں آئی ان کو عقل کیا خاک آئے گی۔ چلو کوئی بات نہیں پریشان نہیں ہونا۔ میں پورا مہینہ ادھر ہی ہوں دیکھنا کیسے عہد رفتہ کی صورت میں تمہاری تربیت کروں گی۔ ابھی ذرا سر کا مساج کرو باری باری تاکہ دماغ تر ہو۔''

حرا شیزا نے بے بسی ایک دوسرے کو دیکھا اور تیل کی شیشی لینے چل دیں کہ اب مہینہ بھر یہی کچھ چلنا تھا۔

☆☆

فرح بخاری

کنارِ خواب جو

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ خالی جیب منتشر دماغ لیے بنا سوچے مری کی کوسٹر میں بیٹھ گیا۔ مری میں ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذر اسے پہلے مہربان دوست کی صورت میں ملے، میاں جی کے توسط سے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔ ہوٹل کے منیجر رفیق احمد کی بیٹی کنعان کالج میں پڑھتی ہے۔ ماضی کے کسی واقعے نے اسے محبت سے سخت بدگمان کر رکھا ہے۔ لیکن سوار سے پہلی ملاقات ہی اس کے دل کی دنیا کو پریشان کن حد تک تبدیل کر دیتی ہے۔

ثمامہ ایک طرح دار جوان بیوہ ہے جس نے مرحوم شوہر کی جائیداد سے مری میں نیا فائیو اسٹار ہوٹل کھولا ہے۔ وہ بھی مری میں نووارد ہے۔

شازمہ جس نئے محلے میں اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوئی ہے وہاں تنہائی اور اکیلا پن اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا کیونکہ شوہر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔

ثمامہ کو ہوٹل کے افتتاح میں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔

رفیق احمد کے پیر میں سیڑھیاں اترتے شدید فریکچر آ گیا۔ سوار نے ان کی بہت مدد کی۔ شازمہ کی محلے میں آمنہ بھابی سے دوستی ہوئی جو کہ مولوی فیض الحسن کی بہو ہیں۔

ثمامہ نے مری کے راستوں پر سوار کو دیکھا، یہ اس کا سوار سے دوسرا سامنا تھا اور معلوم نہیں کیوں لیکن وہ اسے بہت خاص لگا۔

کنعان کی رابعہ پھوپھو ان کے گھر آئیں تو کنعان کے پکائے بدمزا کھانوں کی وجہ سے دیا اور کنعان دونوں کا داخلہ کوکنگ اسکول میں کروا آئیں کنعان نے وہاں پر سوار کو دیکھ کر خوشی محسوس کی۔

چوتھی قسط

مکمل ناول

’’کنعان بی بی آپ؟‘‘ سوار نے ایک نظر آسمان پر چمکتی بجلی کو دیکھا تو دوسری نظر اس کے آگے پیچھے ڈالتے حیران حیران سا چند قدم آگے آیا

’’آپ...... اکیلی آئی ہیں......؟‘‘

’’نن...... نہیں...... وہ ابو چھوڑ گئے ہیں۔‘‘

حیرت، خوشی اور بوکھلاہٹ پر بیک وقت قابو پاتے اس نے بمشکل خود کو جواب کے قابل بنایا اور دو قدم مزید چل کر گیٹ کے قریب آئی۔ خیال یہ گزرا کہ شاید وہاں اور بھی کوئی ہو، لیکن گیٹ کے آس پاس کسی کو نہ پا کر وہ سمجھ گئی کہ سوار بھی اکیلا ہے۔

بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ سوار نے پریشان کن نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ کنعان تب تک اس کی پریشانی سے لاعلم تھی کیونکہ اس نے تو اندر جانا تھا۔ بارش کی تیزی اسی وجہ سے زیادہ پریشان نہیں کر رہی تھی لیکن بیل بجانے کے لیے آگے بڑھتا اس کا ہاتھ بیچ راہ میں ہی یہ دیکھ کر رک گیا کہ ناظمہ میم کے گیٹ پر بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ سوار کی پرسوچ نگاہیں ابھی بھی دائیں بائیں کچھ کھوج رہی تھیں۔ کنعان اور وہ ذرا سی دیر میں پورے بھیگنے والے تھے۔

’’میم......؟‘‘ کنعان نے سوالیہ نظر سوار کی جانب اُٹھائی

’’میم گھر پر نہیں ہیں بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ اِدھر آ جائیں کنعان بی بی۔ وہاں شیڈ ہے۔‘‘

میم ناظمہ کے بنگلے کے دائیں بائیں والے دونوں بنگلے بھی بنا کسی شیڈ وغیرہ کے تھے لیکن تیسرے گیٹ کے ساتھ چوکیدار کے ٹھہرنے کے لیے ایک چوکی نما چھوٹا چوکور ڈبے جیسا کمرا بنا ہوا تھا۔ فی الحال بارش سے بچنے کے لیے وہ ایک واحد پناہ گاہ تھی۔ بنا مزید کچھ سوچے دونوں تیزی سے اُدھر بڑھے۔ کنعان کے لیے اگر ناقابل یقین تھا سوار کے ساتھ اکیلے کہیں طوفان میں پھنس جانا تو سوار کے لیے انتہائی پریشان کن۔ بارش اچانک ہی بہت طوفانی انداز میں تابڑ توڑ برسنے لگی تھی۔ جانے یہ ساتھ کتنا طویل ہونے والا تھا

’’سر تو بیچ راستے میں ہی بھیگ گئے ہوں گے۔‘‘ سوار کو یہ سوچ کر اور بھی فکر لاحق ہوئی کہ کنعان کو چھوڑ کر واپس چلے جانے والے رفیق سر تو ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے۔

’’ابو نے ڈینٹل سرجن کے پاس جانا تھا۔ وہ یہیں قریب ہی ہے۔ اُمید ہے بارش سے پہلے ہی پہنچ گئے ہوں گے۔‘‘ کنعان نے پہلا تفصیلی جواب دے کر اس کی فکرمندی زائل کی۔ سوار نے بھی تسلی بھرے انداز میں سر ہلایا۔ تبھی بجلی چمکنے کے بعد ایک زوردار گڑگڑاہٹ ہوئی۔ کنعان نے بے ساختہ سہم کر سوار کی طرف دیکھا۔

’’پریشان نہ ہوں۔ ابھی طوفان ٹل جائے گا۔‘‘ وہ بنا نظر اس کی طرف گھمائے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

سوار کے بال بھیگ چکے تھے۔ کنعان کو جلد از جلد اس چھوٹے کمرے کی طرف موو کرتے وہ خود پیچھے رہ گیا تھا۔ کنعان نے ویسے بھی اپنا کاٹن کا بلو دوپٹا سر پر لیا ہوا تھا۔ سوار نے انگلیاں اپنے بھیگے بالوں میں پھنسا کر انہیں پیچھے کیا۔ آج وہ اسموک گرے فُل شرٹ کے ساتھ سفید سلیولیس لائٹ سا اپر پہنے ہوئے تھا۔ ساتھ وائٹ جینز تھی، کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس ماڈرن لُک میں کس قدر جاذب نظر لگ رہا تھا۔

’’آپ یہاں اچانک کیسے......؟‘‘ سوار نے باہر کی بارش پر نظریں جمائے دل میں ابھرتا سوال پوچھ ہی لیا۔ یہی سوال بڑی دیر سے کنعان کے اندر بھی تو مچل رہا تھا۔

’’سوچا میڈم کو برتھ ڈے کیک دے کر سرپرائز دیتے ہیں۔‘‘

’’اوہ...... تو سرپرائز کے چکر میں ہم دونوں کے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔‘‘ وہ ہنس پڑا۔

’’یعنی آپ بھی......‘‘ کنعان کی جھجک مجبوری کی بات چیت میں کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔

‘‘جی۔ میں بھی کیک لایا تھا میم کے لیے۔’’

‘‘تو پھر کیک......؟’’ کنعان نے اس کے خالی ہاتھوں کو حیرت سے دیکھا۔

‘‘کچھ دیر تو باہر بیٹھ کر ویٹ کیا کہ شاید کوئی آجائے۔ پھر پڑوسیوں کی بیل بجائی کیونکہ ہوٹل واپس جانا تھا۔ پڑوس سے ایک کافی خوش اخلاق قسم کی آپا جی باہر نکلیں۔ کسی صوت بھی پارسل لینے کو تیار نہ تھیں۔ بڑی مشکل سے راضی کیا بلکہ باقاعدہ کھول کر دکھایا تب کہیں ان کی تسلی ہوئی۔’’

‘‘اوہ...... پھر اس کا کیا ہوگا......؟’’ کنعان نے مایوسی سے اپنے گفٹ پیک کو دیکھا

‘‘ارے بھئی۔ اُنہی کے ہاں رکھوائیں گے۔ آپ بھی کھول کر تسلی کروا دیں۔’’

‘‘لیکن یہ بارش......’’ کنعان نے دوپٹے کے پلو سے اپنی بھیگی گردن کا پانی پونچھا۔

‘‘انجوائے کریں۔’’ ہتھیلی باہر پھیلاتے ہوئے وہ بے ساختہ بولا۔ اس کی دلکش مسکراہٹ اور جملے نے کنعان کا دل مٹھی میں کرلیا۔ بڑی دیر بعد وہ احساس ایک دم پھر سے عود کر آیا۔ وہ سوار کے ساتھ تھی۔ ایک بڑی دلچسپ اور عجیب سی سچویشن میں۔ اور وہ اس سے ہم کلام بھی تھی۔ یہ قیمتی پل موتیوں جیسے اس کی مٹھی میں آئے تھے۔ طوفان اور بارش کا خوف بھی سوار کی موجودگی نے ختم کر دیا تھا۔ اور وہ...... کنعان نے ایک چور نظر ساتھ کھڑے سوار پر ڈالی۔ ‘‘وہ بھی خوش تھا۔’’ دل نے ایک خوش فہم سی انگڑائی لی۔

‘‘آج آپ کی دوست نہیں آئیں؟’’ گیلا ہاتھ جھٹک کر سوار کسی خیال سے اس کی طرف مُڑا تھا۔ فور بائی فور کا وہ مختصر سا کمرا اُس کے رُخ پھیرنے پر کچھ اور بھی سمٹ آیا۔ کنعان بے ساختہ پیچھے ہٹتے دیوار سے لگ گئی۔ لحظے کو سوار اپنا سوال بھی بھول گیا۔ ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ اس غیر معمولی سچویشن میں، اکیلے پن کا احساس پہلی بار کسی شدت سے اندر جاگا۔ دھڑکنوں نے نجانے کیوں صدیق کے خراٹوں جیسی بے سری تال پکڑی۔ بے ساختہ وہ بھی تھوڑا پیچھے ہوا۔

‘‘اُس نے آنا تھا میرے ساتھ۔’’ کنعان نے لہجے کو نارمل کیا۔ بات کرتے لب ہلکا سا کھلے اور رُخساروں کے خفیف سے ڈمپل اُبھر کر فوراً ہی معدوم ہوئے۔ بارش سے بھیگی پلکیں آپس میں مزید جُڑ کر باربی ڈول جیسی لگنے لگی تھیں۔ سوار بے سبب دیکھے ہی گیا۔ وہ بتا رہی تھی۔ دیا کے یہاں نہ آسکنے کے بارے میں۔۔۔ اور پہلی بار سوار ‘‘سُن’’ کم اور ‘‘دیکھ’’ زیادہ رہا تھا۔

‘‘بارش رُک گئی ہے۔’’

‘‘ہوں؟’’ وہ کسی طویل اثر سے باہر آیا۔ دل کو ایک نامعلوم سی شرمندگی نے بری طرح گھیر لیا۔ اور وہ اُس سے پہلے ہی باہر نکل آیا۔ بارش اب پھوار کی صورت برس رہی تھی۔

‘‘کیک کہاں دینا ہے۔’’ کنعان دوپٹا سنبھالتے دوبارہ میم کے گیٹ کے سامنے آئی۔

‘‘وہ آخری والا کالا گیٹ۔’’ سوار نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دونوں ہی اُدھر بڑھ گئے۔ سوار نے ہی ہاتھ سے دستک دے کر گیٹ بجایا، کچھ دیر بعد اُنہی آپا جی نے دروازہ کھولا۔

‘‘تم ابھی تک یہیں ہو؟’’ اُنہوں نے ناک پہ انگلی دھر کر حیرت کا اظہار کیا۔ کنعان اور سوار کو ایک ساتھ ہنسی آئی۔ ‘‘خوش اخلاقی’’ کا مفہوم بھی خوب سمجھ میں آگیا۔

‘‘جی وہ بارش نے جانے نہیں دیا اور پھر...... یہ آئیں۔’’ وہ خفت سے سر کھجا رہا تھا، ہاتھ سے کنارے کھڑی کنعان کی طرف اشارہ کیا تو اُس نے سامنے آکر خود کو نظارے کے لیے پیش کیا۔

‘‘یہ بھی میڈم کے لیے کیک لائی ہیں۔ آپ نے کچھ وشز وغیرہ تو لکھی ہیں ناں۔ نام کے ساتھ؟’’ بات کرتے اس نے کنعان کو مخاطب کیا۔

‘‘جی۔ یہ اُوپر کارڈ لگایا ہے۔’’

‘‘بس ٹھیک ہے۔ وہ سمجھ جائیں گی۔’’ سوار

نے گفٹ پیک کنعان سے لے کر آگے بڑھایا۔

"آپ۔ یہ بھی ناظمہ میم کو دے دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"آپ کہیں تو میں کھول کر دکھاتی ہوں۔"

کنعان خود ہی ذرا سا آگے بڑھی۔ آپا جی کا رعب اس کے بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے۔" آپا جی نے ہاتھ پیچھے کھینچ کر گیٹ بند کر دیا۔

"مبارک ہو۔ آپ کو شاید خواتین ڈسکاؤنٹ حاصل ہوا ہے۔" سوار اب شوخی سے کنعان کو مطلع کر رہا تھا۔ کنعان ہنستے ہوئے آگے بڑھی۔ دھیان کہیں اور تھا اس لیے پتھریلی روش پر معمول کے مطابق عام انداز میں پاؤں رکھ دیا۔ نرم مٹی میں عارضی دھنسے پتھروں کے نیچے سے مٹی تو بارش نکال لے گئی تھی۔ گیلے پتھر اب ذرا سا دباؤ پڑنے پر جگہ بدلنے کو تیار پڑے تھے۔ پہلے پتھر پر پاؤں رکھتے ہی کنعان کا توازن بگڑا، بازو فضا میں لہرائے۔

"کنعان......" سوار نے بے ساختہ چلاتے ہوئے اس کا ہوا میں لہراتا بازو دبوچا اور واپس اُوپر کھینچا۔ "کیا کر رہی ہیں۔ یہ راستہ اب پہلے جیسا نہیں رہا۔"

"اوہ......" اُس نے گھبرا کر منہ پہ ہاتھ رکھا۔ "اب ہم جائیں گے کیسے؟" وہ دھڑکتا دل لیے پریشانی سے نیچے دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔" سوار نے پیشانی مسلتے ہوئے کچھ سوچا۔ "گھاس گیلی ہے اس لیے اس پر پھسلن بہت ہے۔ اور پتھروں پر تو نرا بیلنس خراب ہوگا۔ ہمیں کنارے سے ہو کر کچھ اس طرح جانا پڑے گا کہ ایک پیر گھاس پر ہو اور دوسرا پتھروں پر۔ سبھی پتھر ناہموار نہیں ہو سکتے۔ کچھ ابھی بھی مضبوطی سے جمے ہوں گے۔ اگر آپ کو گھاس پر پھسلن محسوس ہو تو دوسرا قدم پتھروں پر جمائیں۔ اور پتھر توازن خراب کرنے لگیں تو گھاس پر۔"

"جی۔" کنعان نے غور سے راستے کو دیکھتے تائید میں سر ہلایا۔ پتھروں کا پیچے تو جاتا وہ راستہ قریب تین فٹ چوڑا تھا جس کے دونوں طرف دور دور تک گھاس تھی۔ سوار پتھریلے راستے کے دائیں جانب ہو گیا اور وہ پہلے ہی بائیں طرف کھڑی تھی۔

"لیکن......" سوار کچھ کہتے کہتے رُکا۔

کنعان نے اُٹھتا قدم وہیں روک کر سوار کو دیکھا۔

"پھسلن بہت ہے کنعان بی بی۔" اُس نے گلا کھنکار کر خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔ "آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں۔ ہم ساتھ ساتھ نیچے اُتریں گے۔ آئیں۔" اس نے ہاتھ آگے پھیلا دیا لیکن نظریں سامنے راستے پر رکھیں تا کہ کنعان کو جھجک نہ ہو۔ کنعان نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے بڑھے ہاتھ کے اُوپر رکھ دیا۔

زندگی میں ایک ایسا لمحہ بھی آ سکتا تھا۔ محبت ہم قدم ہو اور موسم کا ہر ساز اِس محبت کے حق میں نغمہ سرا ہو۔ محض یہاں آنا اور سوار سے سامنا ہونا ہی بذات خود ایک نہایت خوش کُن اتفاق تھا۔ بادلوں، بجلیوں اور بارش نے پتھریلے راستوں کو ناہموار کرتے محبت کی راہوں کو کس قدر سہل بنا دیا تھا۔ کنعان جیسے کہکشاں پر قدم رکھے چاند سے اُتر کر بادلوں کی وادی سے گزر رہی تھی۔ سوار کے پیروں تلے سے اچانک کوئی پتھر پھسلنے لگتا تو کنعان کے نرم ہاتھ پر اس کی گرم انگلیوں اور مضبوط ہتھیلی کا دباؤ کچھ اور بڑھ جاتا۔ کنعان نے ہاتھ کی اس حرارت کو اپنے اندر تک اُترتا محسوس کیا۔ سوار نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو کنعان کو پتا چلا کہ کہکشاں کا سفر ختم ہو چکا ہے۔ ڈھلان اُتر کر وہ دونوں ذیلی راستے پر آ چکے تھے۔

"آپ کے مری میں بارش کا سیزن آف بھی ہوتا ہے؟" وہ اب دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔

"بادلوں اور بارش کا سیزن یہاں آف ہو جائے تو لوگ شاید یہاں کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیں۔" وہ بھی شگفتہ لہجے میں بولی۔

"ارے۔ اللہ نہ کرے۔" وہ بھی ہنسا۔ "یہاں

کی رونقیں ہمیشہ بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہیں۔“

”آمین۔“

دونوں گیلی سڑک پر چلتے آہستہ آہستہ مین روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فضا میں سردی ایک دم بہت بڑھ گئی تھی۔ اندھیرا ابھی گہرا ہوگیا تھا۔ اس ذیلی سڑک پر روشنی بالکل نہیں تھی۔ وہ ایک قدم نادانستہ اس کی طرف ہوئی تھی۔ سوار نے اس بات کو محسوس کیا لیکن بنا کوئی تاثر دیے آگے بڑھتا رہا۔

”آپ اگلے ہفتے ہوٹل چھوڑ دیں گے۔“ بڑی دیر بعد کنعان نے ہی خاموشی توڑی۔ کلینک آنے تک بڑا ہی مختصر ساتھ بچا تھا۔ وہ ان لمحوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

”ہوٹل والے مجھے چھوڑ دیں گے۔“ وہ بظاہر شگفتگی سے مسکرایا تھا لیکن لہجے میں عجیب سی شکستگی کا احساس گھلا تھا۔ کنعان کے دل کو کچھ ہوا۔ ایک معمولی نوکری کے جانے سے وہ کتنا افسردہ تھا۔

”آپ کچھ دن کے لیے اپنے گھر ہو آئیں۔ ذہن پرسکون ہو جائے گا۔ پھر واپس آ کر نئی جاب تلاش کرلیں۔“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ وہ ازحد سنجیدہ تھا۔ کنعان بے طرح چونکی۔ ایسے جواب کی وہ ہرگز توقع نہیں کر رہی تھی۔

”آپ کہاں سے ہیں؟“ بے ساختہ کنعان وہ سوال کر بیٹھی جو کچھ دن پہلے دیا نے اُس سے پوچھا تھا اور جواب سننے کے لیے تب سے اس کے کان منتظر تھے۔

”ہری پور۔“

ماحول کے زیرِ اثر وہ اس سوال کا بھی روانی میں جواب دے گیا۔ اندھیری سڑک پر ساتھ چلتی ساتھی ہم سفر تو نہ تھی پھر بھی جانے کیوں...... اور پھر ذیلی سڑک ختم ہوگئی، مین روڈ پر چڑھتے ہی روشنیوں، رنگوں اور لوگوں کی بہار کو سوار نے کچھ ذرا اجنبی نظروں سے دیکھا۔ تاریک راستہ پیچھے رہ گیا تھا۔ کسی نہری زنجیر سے بندھے کچھ کچھ خوابوں جیسے خیالات بھی ہاتھ چھڑوا کر وہیں کہیں پر بکھر گئے۔ وہ اب مکمل اپنے اختیار میں تھا۔

”آپ مجھے کنعان بی بی نہ کہا کریں۔“ دھیمے لہجے میں بولتی وہ معصوم پری ابھی بھی اُسی حصار میں تھی۔

”جی بہتر۔“ نیم گیلے بالوں میں انگلیاں گھماتے سوار نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”اور آپ مجھے سوار بھائی کہا کریں۔“ قدم آگے کو تیز کرتے یہ سوار کا آخری جملہ تھا۔

گیلی تارکول کی سڑک نے کنعان کے قدموں کو پورا جکڑ لیا۔ الفاظ کے پتھر توڑنے والے نے پل میں ایک نازک وجود کو پتھر کردیا تھا۔ خالی خالی آنکھوں سے وہ اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی جب چار قدم پر جا کر وہ مُڑا تھا۔ بھیگی براؤن آنکھوں میں ایک دشت آباد تھا۔ سوار کے وجود میں ایک خوف زدہ کرنے والی سنسنی دوڑی۔ الفاظ ایک بار ادا ہو جائیں تو واپس نہیں پلٹا کرتے۔ اب وہ اپنی بات کی اور کیا وضاحت دیتا۔ بنا کچھ کہے ہی دوبارہ پلٹ گیا اور اس مرتبہ نہ رُکنے کا تہیہ کرتے اس نے خود کو اژدھام کے حوالے کردیا۔

جو وہ بول گیا تھا شاید وہ اتنا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن جو وہ کہنا چاہتا تھا اسے سمجھنے اور سمجھانے میں تھوڑی سی غلطی ہوگئی تھی۔ جس کیفیت سے اس نے خود کو کچھ دیر پہلے نکالا تھا اس کا اثر ختم کرنے کے لیے اس نے جن لفظوں کا سہارا لیا تھا وہ خود اس کے اپنے بچاؤ کے لیے تھے۔ لیکن کنعان نے اُن سے جانے کیا اخذ کیا۔ سوار مال روڈ کی بھیڑ سے بھی اپنی سوچ میں غلطاں گزرتا جا رہا تھا۔ کنعان کو افسوس شاید اس لیے ہوا کہ وہ سمجھی تھی وہ ”اسے“ آگے بڑھنے سے روک رہا ہے۔ اِس حد تک تو میسج واقعی بہت غلط گیا تھا۔ نادانستگی میں وہ کنعان کو ایک ایسی نصیحت کر گیا تھا جس پہلو پر اب سے پہلے شاید اُس بے چاری لڑکی نے دھیان بھی نہ دیا ہو۔

”اُف بہت غلط ہوگیا۔“ سخت پشیمانی سے نفی

Viqar Azeem

میں سر ہلاتے ایک مرتبہ پھر وہ ''اصل'' وجہ تک پہنچے بغیر اسے اپنی کوتاہی تصور کرنے لگا۔ کنعان کی دلی کیفیت تک نہ پہنچ پانے کی وجہ ایک مرتبہ پھر اپنی کم حیثیتی بنی۔ کیونکہ کنعان کے نرم بولوں کو خاص معنی پہنانے کے بارے میں تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم بھابھی۔''

''ارے آؤ شازمہ۔ وعلیکم السلام۔'' آمنہ بھابی نے استری کا پلگ نکالا۔ ''تمہارا نمبر تو سچی گم کر بیٹھی تھی اس روز۔'' ''سلمٰی باجی سے پتا چلا کہ سکینہ آگئی ہے۔ سوچا فون کر کے اس خوش خبری پر تمہیں مبارک باد دے دوں، پر نمبر کہاں سے لیتی۔'' وہ اسے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''ہاں بس فون پر ہی ٹرخا دیں۔ گھر کبھی نہ آنا۔'' شازمہ شکوہ کیے بنا نہ رہ سکی۔

''کیا کروں بھئی۔ گھر کی مصروفیت تو تمہیں پتا ہی ہے۔ شام کا وقت ویسے بھی اباجی، عمار، عبدل، بچے گھر پر ہوتے ہیں۔ تب تو سوچ بھی نہیں سکتی کہیں آنے جانے کا، اور صبح کے وقت یہ حال ہوتا ہے کہ ناشتے کے فوراً بعد ہی دوپہر کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ پھر دکان پر کھانا بھیجنا، بچوں کی اسکول سے آمد اور کہیں گھنٹہ بھر کا آرام۔''

''جانتی ہوں بھابھی۔'' شازمہ کشن گود میں رکھتے توصیفی نظروں سے بھابھی کے کمرے کی صفائی اور ترتیب کو دیکھ رہی تھی۔ ''کبھی بہت ترس آتا ہے آپ کی حالت پر تو کبھی دعا مانگتی ہوں کہ۔ کاش میں بھی اتنی مصروف ہوتی۔ نہ فرصت ہوتی سوچنے کی اور نہ اکیلے پن کے خدشے ستاتے۔''

''ارے توبہ کرو۔'' آمنہ نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''ایسی مصروفیت سے تو اللہ دشمن کو بھی بچائے۔ بھئی فرصت کے مزے اُٹھایا کرو، ناشکری نہیں کیا کرتے۔ اب تو سکینہ بھی لوٹ آئی ہے۔ ارے ہاں۔'' آمنہ کو خیال آیا۔ ''سکینہ کہاں ہے۔ اکیلا گھر چھوڑ آئیں کیا؟''

''نہیں بھابھی۔ دراصل دن کے وقت وہ اپنے گھر چلی جاتی ہے، پانچ چھ بجے اس کا بھائی چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھار نہیں بھی جاتی۔ مرضی کی مالک ہے، ویسے ماں اس کی یہی طے کر کے گئی تھی کہ دن کا حصہ وہ اپنے گھر گزارے گی۔''

''چلو اچھا ہے۔ اصل مسئلہ تو رات کا تھا۔ اور سناؤ۔ میاں تمہارے کیسے ہیں؟ وہی ہفتے اتوار کا آنا ہے ان کا۔''

''جی بھابھی...... اور کیا۔ ویسے اس روز صبح آئے تھے۔ میرے لیے لیپ ٹاپ خریدا تھا وہی دینے آئے تھے۔''

''ارے واہ۔'' آمنہ نے شوخی سے ابرو چڑھائے۔ ''بڑے گفٹ مل رہے ہیں۔''

''جی بس......'' وہ ہلکا سا ہنس پڑی۔ ''میں تو اب اتنے احساس کو بھی کافی سمجھتی ہوں۔''

''اچھا بیٹھو۔ میں آتی ہوں۔'' آمنہ آداب میزبانی نبھانے کے خیال سے اٹھی تھی شاید۔ شازمہ نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''میں اب جاتی ہوں بھابھی۔ اصل میں آدی کا پوچھنے آئی تھی۔''

''اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ آدی سے بھی بات کر لینا، بیٹھ تو جاؤ۔''

''نہیں۔ سچی بھابھی۔ بڑے کام پڑے ہیں آج فریج کی صفائی کا ارادہ ہے۔''

''اچھا بھئی مرضی تمہاری۔ سامان کی لسٹ تو لاؤ، آدی کو دے دوں۔'' انہوں نے ہاتھ آگ بڑھایا۔ شازمہ جواباً ہنس پڑی۔

''سامان نہیں منگوانا بھابھی۔ اصل میں مجھ لیپ ٹاپ کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا۔ آن کر بیٹھی ہوں پر آگے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کمپیو وغیرہ کبھی استعمال نہیں کیا ناں۔ سوچا عبدل س کہوں، کچھ ضروری باتیں ہی سمجھا دے۔'' وہ ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئی۔

”ہاں اپنا آدمی تو بہت تیز ہے ایسے کاموں میں۔ اور لیپ ٹاپ تم یہیں لے آتیں۔“

”ہائے نہیں بھابھی۔“ شازمہ بدکی۔ ”کندھے پہ لٹکا کر گلی میں آتے ہوئے کتنی عجیب لگتی۔ محلے والے دیکھتے اور کتنی شرم آتی۔“

”توبہ ہے شازمہ۔“ آمنہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ ”لیپ ٹاپ اُٹھاتے بھی کسی کو شرم آتی ہے۔“

”قسم سے بھابھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اپنے حمید باؤ۔ فضل چاچا اور رحیم بابا...... سبھی بیٹھے ہوتے ہیں اپنی اپنی دکانوں پر، کیسی بری لگوں گی لیپ ٹاپ اٹھا کر آتی۔“ اس کے لیے تو معاملہ واقعی شرمندگی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ آمنہ ہنستی ہی جارہی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ عبدل آجائے تو کہتی ہوں اُسے۔ کاشی کے ساتھ یونیورسٹی گیا ہے۔ اسے اپنا داخلہ فارم لینا تھا اور......“ وہ کچھ سوچ کر رُکیں۔ ”فوراً تو شاید نہیں آسکے گا، ابا جی دکان پر اس کا انتظار کررہے ہیں۔ گھر سے کچھ سامان دکان پر بھجوانا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بالکل فارغ ہوتا ہے۔ خود بھی لیپ ٹاپ لگا کر بیٹھا ہوتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں بھابھی۔ میں نے کون سا کسی کورپورٹ کرنی ہے۔“ وہ خوش دلی سے خود ہی ہنس پڑی۔ ”اب تو گھر کی چیز ہے۔ آرام سے سمجھ لوں گی۔“ وہ باہر کی طرف بڑھی۔

”اچھا رُکو ذرا۔ آج کھیر بنائی ہے۔ اپنے اور ہلینہ کے لیے لیتی جاؤ۔ ابھی کچھ گرم ہے۔ تم جاتے ہی ذرا فریج میں رکھ لینا۔“

وہ زبردستی اسے ساتھ لیے کچن میں آگئیں۔

☆☆☆

ثمامہ نے چشمہ آنکھوں سے اُتار کر بالوں میں پھنسایا۔ پچھلی رات کی بارش کے بعد آج مری میں تیز دھوپ نکلی تھی۔ فی الوقت جبکہ سہ پہر کے پانچ بجے تھے۔ سورج مہاراج مغرب میں گم ہونے سے پہلے کی شعاعیں دھرتی پر ڈھیر کررہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ناظمہ بنگش کی کوکنگ اکیڈمی تھی۔ ”بیک اینڈ ٹیک“۔

پچھلی رات ربیعہ نے باقی کی تمام معلومات بھی اسے فون پر بتادی تھیں۔ حتیٰ کہ ناظمہ میڈم کا فون نمبر بھی اسے مل گیا تھا لیکن پہلی مرتبہ ہی فون پر بات کرلینا ثمامہ کو کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ کلاس ٹائم کے دوران ملنے کا پلان اس نے جان بوجھ کر اسی لیے ترتیب دیا تاکہ اکیڈمی اور ان کا کام وغیرہ بھی دیکھ سکے۔

کالونی کی جانب سے آنے والا یہ مین گیٹ کا راستہ تھا۔ ثمامہ کو بتایا بھی اسی راستے کے متعلق گیا تھا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار وغیرہ نہ پاکر اس نے خود ہی ہلکا سا دباؤ دیتے ہوئے گیٹ وا کردیا۔ فوری طور پر تو کوئی نظر نہیں آیا۔ برآمدہ کراس کرکے وہ داخلی دروازے تک آئی تو وہ بھی بند ملا۔ ہینڈل نیچے کرکے کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ ڈور تو لاک ہے۔ غالباً گھر پر کوئی نہیں تھا۔ جانے پھر گیٹ کیوں کھلا رکھا ہوا تھا۔ وہ مایوس سی واپسی کے لیے پلٹی۔ تبھی دائیں جانب کی اوپن راہداری سے آیا ٹائپ ایک خاتون آتی دکھائی دی۔ ثمامہ کو دیکھ کر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھی تھی۔

”مجھے ناظمہ میڈم سے ملنا ہے۔“

”جی، وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔“ آیا دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سرتاپا اسے بغور گھور رہی تھی۔ ”مومنہ میڈم ہیں۔“

”مومنہ میڈم؟“ ثمامہ ٹھٹکی۔

”جی، وہ لڑکے لڑکیاں پیچھے اکیڈمی میں کام کررہے ہیں۔ اُن کو سکھاتی ہیں۔“

”جی جی۔ میں بھی اسی سلسلے میں آئی ہوں۔“ ثمامہ پرجوش ہوئی۔ کچھ تو امکان پیدا ہوا۔ ”کیا آپ مجھے مس مومنہ سے ملواسکتی ہیں؟“

”آجائیں۔“ عورت ان ہی قدموں پر واپس راہداری کی طرف مڑ گئی۔ راہداری کے خاتمے پر وہ ایک دوسرے صحن میں آگئے۔ یہاں بڑا سالان اور

بلڈنگ ایریا تھا۔ کانوں میں اب ہلکی ہلکی آوازیں اور برتنوں کی کھٹ پٹ سنائی دینے لگی تھی۔

"سوار بیٹا۔ مس مومنہ کہاں ہیں؟" آیا نے کمرے میں داخل ہوتے ایک لڑکے کو آواز دے کر روکا جو جاتے جاتے چونک کر پلٹا۔ اور یونہی سرسری انداز میں اس کی پشت کو دیکھتی ثمامہ کا مارے حیرت اور بے یقینی کے بے ساختہ منہ کھل گیا۔ وہ داڑھی والا خوبرو لڑکا۔ جسے دیکھ لینے کی چاہ میں اس کی گاڑی بے اختیار ایک انجان راستے پر مڑ گئی تھی۔ بنا کسی کوشش کے ایک خوب صورت اتفاق کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سوار اپنی حیرت بھری سوالیہ نظر ثمامہ پر جمائے ہوئے تھا۔ آیا اسے کچھ بتا رہی تھی۔ ثمامہ یک لخت ہوش میں آئی۔

"انہیں مس مومنہ سے ملنا ہے۔"

"وہ تو اندر بڑے ہال میں ہیں۔ آپ یہاں آفس میں آجائیں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا اسے ایک روم کی طرف لے آیا۔ اور وہ عورت مس مومنہ کو بلانے چلی گئی۔

"تشریف رکھیے۔" سوار نے سائڈ میں رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "آیا جی میڈم کو بلانے گئی ہیں۔"

"اور میم ناظمہ؟" ثمامہ اب دل کو سنبھال کر دماغ سے کام لیتے اسے وہیں روکے رکھنے کی ترکیب کرنے لگی۔

"جی وہ مارکیٹ تک گئی ہیں۔ جلدی آجائیں گی۔"

"آ......آپ......؟" ثمامہ نے سوالیہ نظروں سے سوار کو دیکھا۔ پیچ شرٹ اور بلیک ڈریس پینٹ میں ملبوس اس حسین لڑکے کو بار بار دیکھنا آج بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ بھی سوالوں کا جواب دیتے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔ شاید ثمامہ کی پرکشش شخصیت کا اثر تھا۔

"اسٹوڈنٹ ہوں یہاں۔" ہلکا سا مسکراتے اس نے اپنی خوب صورت ہنسی کی جھلک دکھائی۔

"واقعی۔" ثمامہ نے حیرت کا اظہار کرتے اس مرتبہ دوستانہ انداز اختیار کیا۔ دل چاہ رہا تھا مس مومنہ ابھی ادھر نہ آئیں اور وہ بس اسی سے بولتی رہے۔ "مجھے لگا اسسٹنس کرتے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ ابھی سیکھنے کے مرحلے میں ہوں۔" وہ سادگی سے مسکرا دیا۔

"آپ کا نام جان سکتی ہوں۔" ثمامہ کو لگا اب وہ مڑنے والا ہے۔ تبھی بلا سوچے اگلا سوال بھی داغ دیا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آیا نے سوار کہہ کر اسے روکا تھا۔

"سوار علی۔" وہ جاتے جاتے پھر رک گیا۔

"بہت خوب صورت نام ہے۔" وہ پیارا سا مسکرائی۔ "مجھے ثمامہ کہتے ہیں۔ ثمامہ ابراہیم۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ جواباً کچھ کہتا۔ مس مومنہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کی آمد پر سوار باہر چلا گیا۔ ثمامہ نے تعارف کے مرحلے سے گزر کر مومنہ کو اپنی یہاں آمد کا مقصد اور اپنے ہوٹل کے متعلق بتایا۔ اسے اکیڈمی سے فارغ التحصیل اسٹوڈنٹس کے رابطہ نمبرز کی ضرورت تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے خواتین شیف کا کام اچھا لگا تو وہ اپنے کچن کے لیے انہیں ہائر کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے گی۔

"میم ناظمہ آجائیں تو میں اُن سے آپ کی بات کروادوں گی۔ وہ آپ کو زیادہ بہتر طریقے سے گائیڈ کرسکتی ہیں۔"

"اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا میں کوکنگ کا کام دیکھ سکتی ہوں۔ یونہی بس اپنے شوق کی وجہ سے۔" ثمامہ نے مسکرا کر وضاحت دی تاکہ وہ اِسے کوئی انسپکشن نہ تصور کرلے۔

"جی جی ضرور۔ آیئے۔" مومنہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آج ہمارے اسٹوڈنٹس سندھی بریانی اور فروٹ ٹرائفل بنا رہے ہیں۔" برآمدے میں چلتے مومنہ نے انفارم کیا۔ "مجھے خوشی ہوگی اگر آپ

ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔“

”بہت شکریہ۔ آپ کے کہنے سے میرا پیٹ بھر گیا۔ اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ میم ناظمہ کے توسط سے میری مشکل حل ہونے والی ہے۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔ لڑکے لڑکیاں جوش خروش سے کام میں مگن نظر آ رہے تھے۔ ثمامہ کی متلاشی نگاہیں تو کسی ایک کو تلاش کر رہی تھیں۔ اور وہ جلد ہی اسے مغربی کونے میں دو اور لڑکوں کے ساتھ کھڑا دکھائی دے گیا۔ مومنہ جانے اسے کیا کچھ بتا رہی، ثمامہ کا دھیان بار بار وہیں بھٹک رہا تھا۔ مومنہ کو کسی لڑکی نے اپنی میز پر بلایا تو وہ معذرت کرتے ہوئے ادھر بڑھ گئیں۔ ثمامہ نے تھوڑی دیر کچھ سوچا پھر نزدیکی میز پر کام کرتی ایک لڑکی کو اپنی طرف بلایا۔

”جی؟“ دیا نے اس پیاری سی لڑکی کو خوب غور سے دیکھا۔

”سوار علی کو بلا دیں گی ذرا۔“

”جی۔“ دیا نے بڑے اچنبھے سے پہلے بغور ثمامہ کو جانچا پھر بے ساختہ دوسری میز پر کام کرتی کنعان کو دیکھا اور بنا کچھ کہے سوار کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔“ ثمامہ نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ سوار کی طرف بڑھایا، جسے حیرت پر قابو پاتے اس نے مسکراتے ہوئے تھام لیا۔

”شکریہ۔“ سوار نے کارڈ لے کر اُس پر لاشعوری ایک نظر ڈالی لیکن ”پیٹرا ان (Petra inn)“ کا نام پڑھ کر ٹھٹک گیا۔

”آپ پیٹرا اِن کی مالک ہیں۔ وہ جو یہیں پیچھے بڑے روڈ پر ہے۔“ سوار نے باقاعدہ ہاتھ سے اشارہ کیا لیکن ثمامہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے اس کے ہاتھ کو دیکھے گئی۔

”پیٹرا اِن تو یہاں سے بہت دور ہے۔ کیا اِس طرف کوئی اور پیٹرا اِن بھی ہے۔“ بعینہٖ وہی نام سن کر ثمامہ کا تو دل ہی ڈوبنے لگا۔ کتنی ذہنی محنت اور محبت سے ایک نام رکھا تھا وہ بھی……

”زمرد جیسے ماربل والا ٹرپل اسٹوری نیا ہوٹل جو ابھی کچھ دن پہلے اوپن ہوا ہے میں اس کی بات……“

”ج…… جی جی۔“ ثمامہ کا دل دھڑکنے لگا۔

”بالکل وہی ہے لیکن……“ وہ تعجب سے رُکی۔ ”وہ یہاں کہاں؟“ ثمامہ کی آنکھوں میں حیرت کی لہریں سی ڈولنے لگیں۔ سوار نے مسکرا کر گویا اس کی کم علمی پر داد دی۔

”میم۔ وہ یہاں سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے۔ ایکچوئلی آپ بہت لمبا چکر کاٹ کر یہاں آئی ہیں۔ اس بنگلے کے فرنٹ اور بیک ڈور، دو بالکل الگ الگ سڑکوں اور علاقوں میں کھلتے ہیں۔ جس مین روڈ سے آپ ایک طویل چکر کاٹ کر آئی ہیں۔ وہ اِس بنگلے کے پچھلے دروازے سے ڈھلان اُترتے ہی فوراً آ جاتا ہے۔“ سوار نے اس مرتبہ پوری تفصیل سے سمجھایا لیکن ثمامہ کا چہرا بتاتا تھا کہ وہ ابھی بھی بے یقین ہے۔

”کیا آپ مجھے وہ راستہ دکھا سکتے ہیں۔ میں واقعی اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“ ثمامہ کے لہجے میں بچوں جیسا اشتیاق تھا۔ سوار مسکرا دیا۔

”جی بالکل۔ میں بس میم سے اجازت لے لوں۔“

”لیکن آپ کی سندھی بریانی؟“ ثمامہ نے مسکرا کر یاد دلایا تو سوار بھی کھل کر ہنس دیا۔

”اٹس او کے۔ میں ویسے بھی میم ناظمہ کا ایک کام کر رہا تھا ادھر آفس میں۔ آئیں آپ۔“ اُس نے بازو پھیلا کر ثمامہ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

دور اپنی میز پر کام کرتی کنعان کا مارے جلن کے جی سلگ کر آدھا رہ گیا تھا۔ دور سے اسے صرف دونوں کے ہلتے لب اور مسکراہٹیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اب وہ کون تھی، سوار کی کیا لگتی تھی اور وہ اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا۔ وہ کچھ بھی جان

نہیں سکتی تھی۔ ثمامہ کے باہر نکلتے ہی سوار دوسری میز پر سعدیہ اور مریم کو کچھ سمجھاتے میم مومنہ کے پاس گیا۔ آہستہ سے کوئی بات کی جس کے جواب میں انہوں نے سر اثبات میں ہلایا اور سوار بھی سیدھا ہوتے مڑ کر باہر چلا گیا۔

"مجھے لگتا ہے آپ کی بات درست ہوگی۔ یہاں سے واقعی شارٹ کٹ ہوسکتا ہے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ جغرافیہ میرا انتہائی کمزور ہے۔ سمتیں، راستے اور نقشے کبھی میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پھر مری میں نووارد ہوں۔ سمجھتے سمجھتے ٹائم لگے گا، بلکہ اوروں سے شاید دوگنا۔" ڈھلان اُترتے ثمامہ کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ سوار مسکراتے ہوئے آگے آگے اُترنے لگا۔

"آپ شوق کی وجہ سے کوکنگ سیکھ رہے ہیں۔" ثمامہ نے بالآخر وہ سوال پوچھ ہی لیا جس پر تب سے اُسے حیرت تھی جب سے سوار کو یہاں دیکھا تھا۔ ایک کام جو اس کی پرسنالٹی سے میچ نہیں کر رہا تھا، ثمامہ کے ذہن میں بھی سوئی سا چبھ رہا تھا۔

"شوق تو خیر قطعاً نہیں ہے۔ ہاں سیکھے بنا چارہ نہیں تھا یہ کہہ سکتے ہیں۔"

"جاب کی تلاش ہے۔" ثمامہ نے اندازہ لگایا۔

"جی۔"

"مری سے ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ ہری پور سے ہوں۔ دراصل والد کی بیماری کی وجہ سے پڑھائی کے فوراً بعد کام کی تلاش میں نکلنا پڑا۔" میاں جی کی کہانی جو طوطے کی طرح وہ کئی جگہوں پہ رٹ چکا تھا۔ ایک بار پھر دہرادی۔ شہر کے متعلق چھپانا ممکن نہیں تھا کیونکہ اپنے آئی ڈی کارڈ اور ڈاکومنٹس سے ظاہر ہے وہ اپنے شہر کو نکال نہیں سکتا تھا۔ وہ اب ڈھلان اُتر کر ذیلی راستے پر چل رہے تھے۔

"آپ کی کوالی فکیشن جان سکتی ہوں۔ سوال پر سوال پوچھنے کے لیے معذرت چاہتی ہوں، دراصل میرے ذہن میں کچھ ہے۔" ثمامہ نے اس بار سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"اِٹس اوکے۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"میں نے فنانس میں ماسٹرز کیا ہے۔"

"ریئلی۔" ثمامہ نے تعجب سے پوری آنکھیں پھیلائیں۔ وہ یقیناً اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔

"آپ تو اچھی سے اچھی جاب ڈیزرو کرتے ہیں۔"

"تھینک یو۔" سوار نے ہلکا سا سر خم کرتے مزید تبصرہ محفوظ رکھا۔ ذیلی راستہ ختم ہوچکا تھا۔ بڑے روڈ پر چڑھتے ہی دائیں جانب قریب چالیس پینتالیس فٹ آگے اس کا اپنا پٹیرا اِن جگمگا رہا تھا۔ ثمامہ کی آنکھیں ایک انہونی خوشی سے چمکنے لگیں۔

"یہ تو واقعی کمال ہے۔ نیکسٹ ٹائم میم ناظمہ سے ملنے میں اسی راستے سے آؤں گی۔"

"آپ آئی کیسے تھیں؟" سوار کو اچانک خیال آیا تو ثمامہ نے بے ساختہ ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ اپنی غائب دماغی پر ہنسی بھی آئی۔ اپنی گاڑی تو وہ دوسری طرف ہی چھوڑ آئی تھی۔ سوار حیران حیران اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا جب وہ ہنستے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

"گاڑی میں آئی تھی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ کسی کو بھیج کر منگوالوں گی۔ فی الحال میں یہیں سے اپنے ہوٹل جانے کا مزا لینا چاہتی ہوں۔" وہ مزاجاً بہت شوخ تھی۔ سوار کو ایک ہی ملاقات میں اندازہ ہوگیا۔

"جی ٹھیک ہے۔ پھر مجھے اجازت۔" وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"سوار۔" ثمامہ نے آواز دے کر روکا تو مڑ کر اس نے محض دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"اگر میں کسی وقت آپ کو بلانا چاہوں تو......

دراصل مجھے اپنے ہوٹل کے لیے نیا عملہ درکار ہے، اور جیسا کہ میں خود بھی اس کام میں نئی ہوں۔ میں نے ہر ڈیپارٹمنٹ میں نئے لوگوں کو ہی ترجیح دی ہے۔ مجھے لگتا ہے جلد مجھے آپ سے کام پڑنے والا

ہے۔ تو آپ کا کوئی رابطہ نمبر؟“

”نمبر......“ سوار زیرِ لب دہراتے سوچ میں پڑ گیا۔ ”آپ کے پاس ناظمہ میم کا نمبر تو ہوگا، آپ اُن کو پیغام دے دیں۔ وہ مجھے بتا دیں گی۔“

”او کے۔“ اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ ”ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔“

”ان شاء اللہ۔“ اپنی اندرونی خوشی پر قابو پاتے واپسی کا سفر اُس نے جیسے ہواؤں کے دوش پر طے کیا۔ اب یہ تو معلوم نہیں تھا کہ ثمامہ اسے کس جاب کے قابل سمجھ رہی تھی۔ بہرحال ازمیر ہوٹل سے فارغ ہوتے ایک نئی جاب کا امکان روشن ہو گیا تھا۔ فی الحال اُس کے لیے یہی بہت تھا۔

سوار اکیڈمی واپس آیا تو میم ناظمہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔ بریانی کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ لڑکیاں کھانے کی میز پر برتن سجا رہی تھیں۔ وہ مدد کرنے کے خیال سے بے اختیار دو قدم آگے آیا۔ بے دھیانی میں جس کے آگے پلیٹیں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ کنعان تھی، جو اس کے ہاتھ کو لی نظر انداز کرتی داہنی سمت کو مُڑ گئی تھی۔ اس کے ایک ہی عمل نے بتا دیا کہ وہ سخت ناراض تھی۔ سوار ناک سے سانس اندر کو کھینچتے کرسی پر آ بیٹھا۔ پچھلی شام الفاظ کے جو پتھر اُس نے پھوڑے تھے، ان کا اثر جوں کا توں تھا۔ بنا سوچے سمجھے بولنا بھی بندے کے گلے پڑ جاتا ہے۔ سب سیٹیں سنبھال کر کھانا شروع بھی کر چکے تھے۔ وہ غائب دماغی سے خالی پلیٹ کو تک رہا تھا۔

”کیا ہوا سوار۔ کھانا کیوں نہیں لے رہے۔“ بشریٰ باجی نے خالص باجیوں کے انداز میں استفسار کیا۔

”سوار بھائی کی خوشی میں بھوک اُڑ گئی ہوگی۔“ نے مسکرا کر ابرو اُٹھائے۔

”خوشی میں...... کیوں؟“ بشریٰ باجی رُکیں۔

”اِناں دے پروڑیں آئے سی ناں (ان کے ائے تھے ناں)۔“ اگلی بات انعم نے پوری کی تو کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔

”ارے بھئی، وہ ناظمہ میم کی گیسٹ تھیں۔“ کھسیا کر وضاحت دیتے سوار بھی ہنس پڑا۔

”اچھا؟“ ہادیہ نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔ ”پر کارڈ شارڈ تو آپ کو مل رہے تھے۔ ہمیں تو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔“

”پوچھنا کیا۔ ہمارا تو تعارف بھی کسی نے حاصل نہیں کیا۔ اور سوار بھائی کو نام لے کر بلا رہی تھیں۔“ دیا نے معلومات میں کچھ اور اضافہ کیا۔ ثمامہ کی اُس میں خصوصی توجہ کا کافی باریک بینی سے نوٹس لیا گیا تھا۔ سوار سرخ چہرا لیے مسکراتا ہوا سب کی سنے گیا۔ سوائے ایک کے تقریباً سب ہی چھیڑ چھاڑ کر لطف لے رہے تھے۔

کھانے کے بعد فاطمہ، سعدیہ اور سیما باجی بریانی کے پارسل بنانے لگیں۔ سوار بھی ان کی مدد کرنے لگا جب دیا نے جانے کے لیے پکارا۔ جانے کا سن کر سوار نے کام وہیں چھوڑ دیا۔ ویک اینڈ سے پہلے تین چار روز سے وہ مسلسل دیا اور کنعان کے ساتھ جا رہا تھا۔ لیکن ”انقلاب اتوار“ نے شاید بہت کچھ بدل دیا تھا۔

”ہم چلے جائیں گے دیا۔“ کنعان اسے زبردستی بازو سے کھینچ کر باہر نکال لے گئی تھی۔ اور وہ یوں کھڑا رہ گیا تھا جیسے قافلہ بیچ دشت میں مسافر کو بے سروسامان چھوڑ جائے۔ بظاہر اس کے نزدیک بات بہت عام سی تھی لیکن کنعان کا رویہ سوار کو ٹھیک ٹھیک سمجھا رہا تھا کہ فقط ایک جملہ کیسے ایک لڑکی کی انا، اس کے پندار کو مجروح کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔

وہ بجائے پیچھے جانے کے واپس آ کر پارسل بنوانے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے بے سروپا فضول جملے کی ندامت نئے سرے سے حاوی ہونے لگی۔ پتا نہیں وہ کب وضاحت دے سکے گا تا کہ کنعان بی بی کی ناراضی دور ہو سکے۔

☆☆☆

"شازمہ باجی۔ عبدل بھائی آئے ہیں۔"

سکینہ نے کچن میں جھانک کر چائے بناتی شازمہ کو اطلاع دی تو اُس نے چولہے پر کھولتی چائے میں ایک کپ دودھ اور تھوڑی تھوڑی مزید مقدار چینی پتی کی شامل کر کے آنچ دھیمی کر دی۔

"عبدل کو اندر بلا لو سکینہ۔ اور دیکھو اُدھر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دو۔"

"جی باجی۔" وہ سر ہلاتی واپس پلٹ گئی۔ شازمہ نے گلے میں پڑا دوپٹا ہلکا سا سر پہ لیا اور خود بھی باہر آ گئی۔

"السلام علیکم بھابھی۔" وہ سکینہ کے ساتھ چلتا برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ آدی۔ ادھر کمرے میں چلے جاؤ۔" پھر سکینہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"سکینہ! تم میری اور بھیا کی چائے یہیں لے آؤ۔"

"تکلف میں مت پڑیں بھابھی۔ میں کیا مہمان ہوں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "بس آپ لیپ ٹاپ یہیں دکھا دیں۔" اس نے برآمدے میں رکھی بڑی میز کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے پہلے دو یا تین مرتبہ وہ آمنہ بھابھی کے کہنے پر ان کا بازار سے کچھ سامان وغیرہ لایا تھا۔ وہ بھی دروازے پر دے کر چلا گیا۔ اندر آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا کہ ظاہر ہے لیپ ٹاپ وہ انہیں دروازے پر کھڑے نہیں سمجھا سکتا تھا۔ لیکن اندر جانے سے فطری سی جھجک محسوس ہوئی۔

"بھئی ٹائم ہے چائے کا۔ کوئی تکلف نہیں۔ اور یہاں شاید سوچ کا مسئلہ ہو۔ اندر آ جاؤ۔" وہ اس سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو گئی۔ لامحالہ اسے بھی پیش قدمی کرنا پڑی۔

"جلدی میں تو نہیں ہو آدی؟ میرا کام شاید تھوڑا لمبا ہو جائے۔ اب کیا کروں مجھ جیسی نالائق کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ جو آ گیا ہے۔"

"بنا سیکھے خود کو نالائق نہ کہیں۔ کام تو سمجھنے سے آتے ہیں۔ لائیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں، لیکن معذرت کے ساتھ، آج تو واقعی جلدی میں ہوں، دوبارہ ضرور آؤں گا ٹائم نکال کر۔"

"کوئی بات نہیں۔ ویسے تم پہلی بار میں ہی جان جاؤ گے کہ میں کتنا جانتی ہوں۔ بس اُسی حساب سے ہی وقت دے دیا کرنا، کبھی کبھار۔"

"جی۔" عبدل اب لیپ ٹاپ کھولے پوری طرح اس طرف متوجہ تھا۔ "آپ کو نظر تو آ رہا ہے ناں۔" اس نے اسکرین کو تھوڑا اُوپر کیا۔ شازمہ صوفے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں بالکل صاف۔"

"جی تو کیا سمجھنا ہے؟"

"مجھے تو وقاص نے یہ...... یہاں کلک کرنے کو کہا تھا اس میں بہت سارے گانے اور ویڈیو کھل جاتے ہیں۔" اس نے آگے کو جھک کر ایک فولڈر پہ ہاتھ رکھا۔ عبدل نے مسکراہٹ ضبط کی۔ سمجھ میں تو آ ہی گیا تھا کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

"اب میں ہر وقت گانے اور ویڈیوز تو نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے تو کمپیوٹر سیکھنے کا شوق ہے۔ لیکن سچی بتاؤں۔ میں تو ڈر کے مارے کسی بھی اور جگہ کلک نہیں کرتی کہ کچھ خراب نہ کر بیٹھوں۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔" عبدل تھوڑا سا پیچھے ہو بیٹھا۔ "آپ ایک پیپر پین لے کر نوٹ کرتی جائیں، میں آپ کو کچھ بنیادی چیزیں بتاتا ہوں۔ شروع میں آپ کو پیپر سے دیکھ دیکھ کر کام کرنا ہو گا پھر آپ کی پریکٹس ہو جائے گی۔"

"اوکے۔ تو کیا آج سے......؟" وہ فور پُرجوش ہوئی۔

"جیسا آپ چاہیں۔ فی الحال دس منٹ ہیں میرے پاس۔"

"تو ٹھیک ہے، تم چائے پیو۔ میں پیپر پین لے آتی ہوں۔"

وہ کچھ ہی دیر میں واپس آئی تو عبدل اپنی جگ تبدیل کر چکا تھا۔ لیپ ٹاپ کا رخ پھیر کر اب و

تھری سیٹر صوفے سے سنگل صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ دونوں سنگل صوفے پاس پاس رکھے تھے۔ اب اگر شازمہ دوسرے سنگل صوفے پر بیٹھتی تو دونوں کے درمیان فاصلہ بھی قائم رہتا۔ لیپ ٹاپ بھی واضح طور پر دونوں کو دکھائی دے رہا تھا۔ عبدل نے آگے کو ہو کر اسٹارٹ بار کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

”قاسم ابھی ڈیوٹی پر نہیں آیا؟“ رفیق احمد نے پوری رات کی ڈیوٹی کے بعد بھی سوار کو ریسپشن پر بیٹھے دیکھا تو متعجب ہوئے۔ سوار اُن کی آمد پر مؤدب سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

”شاید تیار ہو رہا ہے۔ میں ویسے یہیں ہوں اس کے آنے تک۔“

”مجھے ذرا آفس کی چابیاں دے دو۔ تین دنوں سے رنگ برنگی رسیدیں لیے گھوم رہا ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور گم کر بیٹھوں گا۔ سوچ رہا ہوں جاوید بھائی کے آنے تک رجسٹر پر اُتار لوں۔“

”جی سر۔“ سوار نے دراز سے چابی نکال کر ان کی طرف بڑھائی۔ وہ لے کر دو قدم چلے پھر کچھ سوچتے ہوئے واپس پلٹے۔

”سنا ہے صدیق بھی واپس آ رہا ہے آج۔“

”جی سر۔ سیکنڈ ٹائم یہاں پہنچے گا، کل صبح سے ان شاءاللہ ڈیوٹی پر ہو گا۔“

”اور تم......؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھے۔ سوار ہلکا سا مسکرایا۔

”سر آج شام تک ہوں یہاں۔“ لہجہ بھی اس نے نارمل رکھا تھا لیکن رفیق احمد نے جانے کیا اخذ کیا۔ دو قدم چل کر واپس کاؤنٹر کے نزدیک آئے اور نرمی سے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا چھوا۔

”پرانی جگہوں کو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ نے اس سے بھی کہیں اچھے اسباب پیدا کر رکھے ہوتے ہیں۔ میں دعا کروں گا اللہ پاک تمہیں زیادہ ترقی، زیادہ کامیابی عطا فرمائے۔“

”مجھے آپ کی دعا پر یقین ہے سر۔“ وہ ازحد ممنون ہوا۔

”رابطے میں ضرور رہنا سوار۔ اور ملنے بھی آتے رہنا۔ میں نے ساتھ کام کرنے والوں سے اسی لیے ہمیشہ دوستانہ رویہ رکھا تاکہ کام کبھی مصیبت نہ لگے اور تعلقات کبھی بوجھ تصور نہ ہوں۔ خدا تمہارے لیے جلد کسی نئی مصروفیت کا سبب پیدا فرمائے۔ پر مصروفیت میں سے ہمارے لیے وقت نکالنا نہ بھولنا۔ تم ملتے رہو گے تو ہمیں اچھا لگے گا۔“

”کہنے کی ضرورت نہیں ہے سر۔ جس اچھے ماحول اور آپ جیسے اچھے لوگوں میں مجھے کام کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ میں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ کے کہہ دینے سے البتہ اعتماد میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے۔ میں ان شاءاللہ آتا رہوں گا۔“

”آج شام کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ گپ شپ لگائیں گے۔“

”میں جلد حاضر ہوں گا سر۔ آپ تکلف مت کریں۔“ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

”تکلف کیسا یار۔ مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ دل سے کہہ رہا ہوں۔“ وہ مصر تھے۔

”جانتا ہوں سر۔ لیکن آج ذرا مشکل ہے۔ مجھے دراصل پرانی جگہ آج ہی سامان شفٹ کرنا ہے۔ میں پھر کسی روز چکر لگاؤں گا۔ اور بتا کر آؤں گا۔“ اُس نے رسان سے معذرت کی۔ نگاہوں میں اُس ”شعلہ جوالا“ کا رُوپ پھر گیا۔ بجائے دعوت کے جو اُسے کچا چبانے کے درپے تھی۔ رفیق احمد سر ہلاتے آفس میں چلے گئے۔

قاسم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ اُس وقت کاؤنٹر کے پیچھے اکیلا بیٹھا تھا جب شیشے کا دروازہ کھول کر کنعان اندر داخل ہوئی۔ دیا یا تو آئی نہیں تھی یا بعد میں آنے والی تھی۔ سوار نے بہت کم وقت لے کر کچھ سوچا بلکہ ایک طرح سے طے کر کے آغاز لیا۔

”السلام علیکم۔“ پہل تو ظاہر ہے اُسی نے کرنی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ بنا نظر اُٹھائے کاؤنٹر پر

چابیاں رکھتے واپس مُڑ گئی۔ رُخ بجائے نزدیکی صوفے کے باہر کی طرف تھا یعنی وہ دیا کا انتظار بھی باہر جا کر کرنے والی تھی۔ سوار نے سخت بے چینی محسوس کرتے آواز دے ڈالی۔

"کنعان۔"

"اُف......" کیسی دلفریب پکار تھی۔ آنکھیں زور سے میچے وہ وہیں جم گئی۔

"آئی ایم سوری۔" مختصر سے جملے بھی خوب سج سج کر ادا کیے گئے۔ وہ دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ذرا سی ترچھی ہوئی لیکن پوری نہیں مُڑی۔

"فار واٹ؟"

"جی......؟" سخت معصومیت سے سوال کیا گیا۔ کنعان کو اپنی انگلش ضائع جانے کے ساتھ ساتھ اس کی کم علمی پر بھی سخت افسوس ہوا۔ وہ مزید بات نہ کرنے کا تہیہ کرتے پوری واپسی کے لیے پلٹ گئی۔

"دیا بی بی کے آنے تک یہیں رک جائیں۔" سوار نے سنجیدگی سے اسے روکنے کی کوشش کی۔ بات بھی کہاں کلیئر ہو پائی تھی۔ شاید رکنے کی صورت میں وہ مزید کچھ وضاحت کر پاتا۔

اس مرتبہ وہ بھی سنجیدہ صورت لیے صوفے پر جا بیٹھی۔ سفید شلوار قمیص کے ساتھ اسکن کڑھائی والی کالی چادر اوڑھے وہ قدرے نروس سی فرش کے ماربل کو گھورے جا رہی تھی۔ گالوں کے ڈمپل محض ہنسنے پر ہی دکھائی نہ دیتے تھے، گھبرا کر تھوک نگلتے بھی تتلی سا لہرا جاتے تھے۔ جڑی جڑی پلکوں اور بادام جیسی آنکھوں میں بھی آج سخت غیریت دکھائی دیتی تھی۔ نمایاں کٹ والے چھوٹے لیکن بھرے بھرے لب سخت خفگی کا تاثر لیے ہوئے تھے۔

سوار جملہ ترتیب دے کر خود ہی رد کر دیتا۔ رفیق سر ابھی کچھ دیر پہلے کتنی محبت سے بات کر کے گئے تھے۔ اسے کنعان کے ساتھ بات کرتا دیکھ کر جانے کیا سوچتے۔ پھر دیا بھی اچانک آ سکتی ہے۔ لیکن پچھلی بات کی وضاحت بھی انتہائی ضروری تھی۔ کیسے سمجھائے کہ وہ اُس کے لیے کتنی قابل عزت ہے۔ محض ایک بے ربط جملے نے بلاوجہ کی بدگمانی کو جگہ دے دی تھی۔ وہ کبھی اس کے بارے میں غلط نہیں سوچ سکتا تھا، بتانا ضروری ہو گیا تھا۔ لیکن کیسے......؟

ٹائم دیکھنے کے لیے کنعان نے سر اٹھایا تو سوار کو اپنی جانب دیکھتے پا کر بنا ٹائم دیکھے ہی نظر ہٹا لی۔ کاؤنٹر کے پیچھے اُونچے اسٹول پر سہولت سے بیٹھے کہنیاں آگے میز پر ٹکائے وہ مکمل اسی کی طرف متوجہ تھا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"کہاں ہے یہ دیا کی بچی۔" وہ بے چینی سے شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

"آج میرا آخری دن ہے یہاں۔" سوار نے نرم لہجے میں اطلاع بہم پہنچائی۔ بنا اس کی اندرونی کیفیت جانے۔ کنعان کا ننھا دل سکڑ کر پھیلا۔ کیسا تکلیف دہ احساس جاگا کہ کل وہ یہاں نہیں ہوگا۔ وہ خود پر جبر کیے یونہی شیشے کی دوسری جانب دیکھتی رہی۔ بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے۔ سوار شاید اپنی جگہ سے اُٹھا تھا۔ اور پھر کاؤنٹر سے باہر نکلا۔ معلوم نہیں کہاں جانے کے لیے۔ وہ صرف محسوس کر رہی تھی جب دو قدم اس کے بالکل قریب آ کر رُکے۔ وہ بے اختیار گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے اپنے جملے پر بہت شرمندگی ہے۔ آپ ایک بار کہہ دیں آپ نے مجھے معاف کر دیا تو میرے لیے یہاں سے جانا آسان ہو جائے گا۔"

"سوری کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کہا وہ بالکل ٹھیک تھا، بہت دنوں سے میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" کنعان نے کمال ضبط سے خود کو کہنے کے قابل بناتے اعتماد سے بات مکمل کی۔ "لیکن آپ کو یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ کنعان کے ساتھ بی بی نہ لگانے کی ریکویسٹ صرف اس لیے کی تھی کہ اب ہم کلاس فیلوز بھی ہیں۔ وہاں جب دوسرے آپ کو ایسا کہتے سنتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں۔ اب ہر بار ہر ایک کو بتانا پڑتا ہے۔ مجھے لگا آپ کو اس تصور سے

باہر آجانا چاہیے کہ میں صرف آپ کے لیے سر کی بیٹی ہوں۔“

”بالکل درست سوچا آپ نے۔“ سوار نے فوراً تائید کی۔ ”لیکن بھائی کہنے کے پیچھے ایسی ہی سوچ میرے ذہن میں بھی تھی۔ مجھے لگا پہلے دن کی لڑائی کی وجہ سے آپ بات کرنے میں جھجک محسوس کرتی ہیں۔ اِس لیے ہمیں اُس بات کو بھول کر آگے بڑھنا چاہیے۔“ سوار کا سنجیدہ لہجہ بھی بہت قطعی تھا۔

کچھ ہی منٹوں کے اندر دونوں نے اپنے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے اپنے اپنے دلوں کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ جذبات کو شکست دے کر انہیں اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے اپنے آپ کو صبر اور حوصلے کے امتحان میں پاس ہونے کی داد دینا کبھی کبھی بڑی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ کم از کم کنعان کو اس لمحے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ رہ گیا سوار۔ تو وہ خوش تھا کہ کنعان کے ذہن پر اس جملے کی گرہ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ اس کے لیے وضاحت دینا اہم تھا جو اس نے وقت پر دے دی تھی۔

☆☆☆

سامنے بیٹھے پریشان، گھبرائے شخص کو بغور دیکھتے ثمامہ کے لیے اپنی اندرونی خوشی چھپانا اگرچہ بہت مشکل تھا لیکن لفظوں سے کھیلنا تو وہ خوب جانتی تھی۔ خالد رضا کے جانے کا سن کر خود کو مغموم افسردہ ظاہر کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ اس کے جاب چھوڑ جانے پر اسے کیسی چھپر پھاڑ قسم کی خوشی ملنے والی ہے۔

”میم۔ میرا فی الحال کم از کم ایک سال تک تو بالکل اِرادہ نہیں تھا یہ جاب چھوڑ کر کراچی شفٹ ہونے کا۔ ایک تو ہوٹل کی تعمیر کا کام کافی سلو چل رہا تھا دوسرے دیکھ بھال بھی بڑے بھائی جان کر رہے تھے۔ لیکن اُن کی اچانک طبیعت بگڑنے سے معاملات نے یہ نیا رُخ اختیار کیا ہے۔“ خالد رضا ابھی بھی صدمے سے بے حال تھا۔ ثمامہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں خالد صاحب۔ پھر یہاں میرا کام بھی بالکل نیا ہے۔ آپ کی بدولت مجھے بڑے مشکل مرحلوں پر بھی بڑا حوصلہ رہا۔ لیکن خیر...... یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ اب ہم تھوڑا آگے چلتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں اور میں جانتی ہوں آپ میری وجہ سے ہی پریشان ہیں۔ بس مجھے ایک چھوٹی سی فیور چاہیے۔“

”شیور میم۔“ خالد رضا تھوڑا آگے ہوا، جی جان سے ہر ممکن مدد کو حاضر۔

”ایک ہفتے بعد آپ نے جانا ہے۔ اگر ہو سکے تو آغاز کا کچھ عرصہ چکر لگاتے رہا کریں۔ آپ کے یک لخت چلے جانے سے شاید میرے لیے یہاں مینج کرنا مشکل ہو جائے۔“ اب وہ سنجیدہ ہو کر آگے کی پلاننگ کی طرف بڑھی تھی۔ خالد رضا نے کچھ عرصہ قبل اشارتاً اُسے بتایا ضرور تھا کہ وہ اور اس کا بھائی کراچی میں اپنا ہوٹل کا بزنس شروع کر رہے ہیں لیکن یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال اس میں بہت دیر ہے۔ اندازہ اس نے ایک سال کا ہی ظاہر کیا تھا لیکن بڑے بھائی صاحب کے دل کا ایک والو بند ہو جانے کے باعث وہ اب بیڈ ریسٹ پر تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ تعمیر کا کام وہیں رُک جائے اس لیے جلد از جلد خالد رضا کو کراچی بلوا بھیجا تھا۔ اب خالد رضا کی ثمامہ کو بتاتے حالت پتلی تھی کہ جانے آگے سے اس کا ردعمل کیا ہو۔ اور دوسری طرف ثمامہ کے لیے دھڑکنوں کا بہکتا ردھم سنبھالنا مشکل تھا۔ جس روز سے وہ سوار علی سے مل کر آئی تھی۔ مسلسل اس سوچ میں تھی کہ جلد از جلد اسے کہاں اور کس کام پہ اپنے ہوٹل میں ایڈجسٹ کرے۔ جب اسے نیا عملہ درکار ہی تھا تو اسے کیوں محروم رہنے دیتی جو کچھ دنوں سے دل کے بہت قریب محسوس ہونے لگا تھا۔

”کیوں نہیں میم۔ میری بھی یہی کوشش ہے کہ یہاں کے کام میرے جانے سے پہلے کچھ اس طرح سیٹ ہو جائیں کہ آپ کو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ذرا سی آگے ہو بیٹھی۔

”میں نے اسسٹنٹ منیجر کے لیے تین لوگوں کو شارٹ لسٹ کیا ہے۔ آج شام ہی انہیں کال کرکے کل صبح انٹرویو کے لیے بلا لیتی ہوں۔ کسی ایک کو کل ہی فائنل کرلیتے ہیں تاکہ آپ اسی ہفتے کے دوران اُسے ٹریننگ دے دیں۔“

”جی ٹھیک ہے میڈم۔“ تائید میں سر ہلاتے خالد رضا نے خود پر سے کئی بوجھ اترتے محسوس کیے۔

”اور اسسٹنٹ منیجر رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ فی الحال کچھ عرصہ میں یہی ظاہر کروں گی کہ آپ ہی منیجر ہیں اور کچھ ماہ کی رخصت پر ہیں۔ جب تک میں نئے بندے کو جانچ پرکھ کر اپنی تسلی نہیں کرلیتی اسے منیجر کی جاب پہ اپائنٹ نہیں کروں گی۔“

”بالکل صحیح میڈم۔ درست سوچا آپ نے۔“

”ٹھیک ہے خالد صاحب۔ میں سی ویز کو ایک بار پھر چیک کرکے خود ہی کال کرلوں گی۔“ ثمامہ نے کالز کرنے کی ذمہ داری خود پر لیتے خالد کو جانے کی اجازت دی۔ اور اس کے رخصت ہوتے ہی میٹھی مسکان لبوں میں دبائے ناظمہ میڈم کے کارڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ خالد رضا کو یہ حقیقت نہیں بتا سکتی تھی کہ اسسٹنٹ منیجر اس نے بنا انٹرویو کے ہی منتخب کرلیا ہے۔ تین لوگوں کا انٹرویو تو محض ایک خانہ پری تھی کہ بہر حال اپنی حیثیت اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی ریپوٹیشن کا بھی خیال رکھنا تھا۔

”ویلکم سوار علی۔“ چمکتی شوخ نگاہ سامنے رکھی کرسی پر ڈالتے اس نے خیالوں میں سوار کو اس پر بیٹھے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر کھل کر ہنسی۔

☆☆☆

دیا آج کوکنگ کلاس سے غیر حاضر تھی۔ کنعان نے پھر بھی چھٹی نہیں کی۔ سوار کو اس کی آمد پر تعجب ضرور ہوا کیونکہ وہ تو اتنے پاس کے کالج میں بھی ایک ساتھ حاضر اور غیر حاضر ہوتیں۔ کم از کم گزرے ڈیڑھ مہینے میں تو سوار نے یہی دیکھا تھا۔ پچھلے دو روز سے وہ میاں جی کے پاس تھا۔ قاسم کی آمد پر اسی شام ہی وہ سب کو الوداع کہہ آیا تھا۔ فی الحال نیا کام ملنے تک میاں جی کا ڈھابہ ہی اس کا ٹھکانا تھا۔ واپسی اس کی اب بھی اکیڈمی کے پچھلے گیٹ سے ہوتی اور مال روڈ پر کچھ راستہ ہم قدم رہنے کے بعد وہ بس اسٹینڈ والے راستے کو مڑ جاتا۔ دیا اور کنعان بھی بہت دنوں سے مال روڈ کے راستے ہی گھر کو جارہی تھیں۔ شاید لمبے راستے کی تھکاوٹ کے خیال سے۔

آج انہوں نے حلیم اور زردہ بنانا سیکھا تھا۔ ناظمہ میم نے آج کلاس میں انہیں انفارم کیا کہ اگلے ہفتے سے وہ لوگ چائنیز فوڈز بنانے والے ہیں۔ سوار کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ آپا جی ناظمہ میم کا پیغام لے کر آگئیں۔ وہ انہیں آفس میں یاد کررہی تھیں۔ سوار کے ذہن میں پہلا خیال ثمامہ ابراہیم کا آیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جس روز سے وہ جاب لیس ہوا تھا۔ دماغ میں مسلسل ثمامہ کی آدھی ادھوری آفر ڈوبتی اُبھرتی رہتی۔ کبھی سوچتا خود ہی اُس کے ہوٹل چلا جائے، پھر اگلے ہی پل اپنے خیال کو رد کرتے اس کی طرف سے پہل اور اسی پہل کے انتظار میں صبر کرنے کو ترجیح دیتے وہیں بیٹھ رہتا۔

ناظمہ میم کا بلاوا اس کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ انہوں نے سوار کو یہی بتانے کے لیے بلایا تھا کہ ثمامہ ابراہیم نے اسے اپنے ہوٹل بلایا ہے۔ اگلی صبح دس بجے۔ سوار نے اس پیغام سے اپنے اندر ایک عجیب توانائی سی بھرتی محسوس کی۔ بے روزگاری آپ کو کچھ یوں فضا میں معلق کردیتی ہے جیسے بنا ڈور کے دائیں بائیں ڈولتی پتنگ۔ باوجود اس کے وہ میاں جی کے ساتھ تھا۔ اپنا اندر عجیب خالی خالی سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ثمامہ ابراہیم کی کال سے خوشی اور جوش کے ملے جلے جذبات لیے وہ آفس سے سیدھا ہی گیٹ کراس کرکے باہر نکل آیا۔ ڈھلان کے قریب چنار کے درخت تلے وہ کچھ دیر غائب دماغی سے کھڑا بلاوجہ مسکراتا رہا۔ آنے والے کل کی خوشی نے اسے آس پاس کے ماحول سے بیگانہ کردیا

تھا۔

سوچوں میں غلطاں وہ ڈھلان اُتر کر ذیلی راستے پر آیا تو اسی راستے کے اختتام پر اسے کنعان نظر آئی۔ بڑی دیر بعد سوار کو یاد آیا کہ آج وہ اکیلی تھی۔ لیکن خیر وہ مطمئن تھا کہ آج کل ان دونوں نے پچھلا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ مال روڈ کے سیدھے صاف راستے سے وہ خود ہی آرام سے اپنے گھر جا سکتی تھی۔

سوار نے دانستہ قدم آہستہ کیے تا کہ وہ اس سے کافی آگے نکل جائے۔ اُسے اکیلے پا کر وہ اس کے ہم قدم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن...... سوار بری طرح چونک کر اپنی جگہ رکا۔ کنعان ذیلی راستے کے ختم ہوتے ہی بجائے اپنے راستے مڑنے کے دائیں جانب مڑ گئی تھی۔

اِس طرف...... سوار کے حلق میں گٹھلی سی پھنسی۔ کنعان پنڈی پوائنٹ کی طرف کہاں جا سکتی ہے۔ ایک بالکل مخالف سمت کو جاتا ویران راستہ۔ اور وہ اکیلی۔ سوار کا دماغ اچانک اتنا گرم ہوا کہ چہرا گویا اس کی تپش سے سلگنے سا لگا۔ اُسے یاد آیا کہ کنعان آج معمول سے کچھ زیادہ تیاری کے ساتھ اکیڈمی آئی تھی۔ ہلکی سبز ڈریس میں ہم رنگ دوپٹا لیے وہ بالوں کی دو چوٹیاں بنائے، سامنے کی لٹوں کو دائیں بائیں گرائے، لائٹ سے میک اپ میں خوب ہی شوخ اور خوش نظر آ رہی تھی۔

سوار نے مڑتے وقت یہ بھی دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ بھی تھا۔ سوار تیز قدموں سے ذیلی راستہ عبور کرتے مین روڈ پر آیا۔ وہ چلتے چلتے کافی دور نکل گئی تھی۔ لیکن سوار کو ابھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پریشان کن نگاہوں سے اس کی پشت کو دیکھتا عجیب مخمصے میں تھا کہ کیا کرے کیا نہیں...... کہ اچانک کنعان رُک گئی۔ جانے کہاں سے ایک لڑکا نمودار ہوا۔ پچیس سے اٹھائیس کے بیچ کی عمر کا وہ نفیس خدوخال کا ہینڈسم سا لڑکا تھا جس سے کنعان نے کچھ بات کی، مسکراتے ہوئے شاپنگ بیگ اس کے حوالے کیا۔ لڑکے نے جواباً ہنس کر دو تین جملے بولے۔ سوار کے دماغ میں دھواں سا بھرتا جا رہا تھا۔ ایک غبار تھا جو بگولے کی طرح خون میں گردش کرتا اس کا چہرا سرخ کیے جا رہا تھا۔ کنعان مُڑی تو اس کے چہرے پر ابھی بھی ہلکی سی مسکان تھی۔ ماتھے پر آئی لٹ کو کان کے پیچھے پھنساتی وہ نیچے دیکھتے اپنی دُھن میں مگن واپس اسی طرف آ رہی تھی۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ شاید آٹھ، دس قدموں جتنا ہو گا جب کنعان کی نظر اُوپر اُٹھی۔ سینے پہ ہاتھ باندھے، وہ چہرے کے تنے خدوخال کے ساتھ خوب ہی کڑی نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔

”یہاں کہاں سے آ رہی ہیں؟“ آنکھوں میں چبھتے شراروں سی لپک تھی۔ کنعان لمحے کو کانپ سی گئی۔

”و...... وہ میں......“ لہجہ واضح گڑبڑایا اور سوار کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

”کون تھا وہ لڑکا؟“ وہ آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھتا چند قدم اور آگے آیا۔ کنعان اب خاموش تھی۔ البتہ ایک اُڑتی پڑتی نظر اس نے آتے جاتے لوگوں پر ڈالی تھی۔ سوار نے پلک جھپکتے اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھی۔ ایک نظر دائیں بائیں پر ڈالتے اچانک کنعان کی کلائی پکڑی اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنا رُخ بائیں ہاتھ کے اینٹوں والے اوپر کو جاتے راستے کی طرف کیا۔ اونچے پہاڑی راستے پر گھنے درختوں کے بیچ سیڑھیوں کا یہ راستہ اوپر ایک کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ سوار نے آدھا راستہ طے کرنے کے بعد دھکا دینے کے انداز میں اسے سامنے گھاس پر کھڑا کیا۔

”صاف صاف جواب دیں کنعان۔ میرا دماغ نہ خراب کریں۔“ وہ سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھتے پہلے سے بھی زیادہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

کنعان نے کلائی سہلاتے غصے سے سوار کو دیکھا۔

”میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔“ دو قدم پیچھے ہوتے اب اس نے رُخ پھیر لیا تھا۔ آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ ”آپ کو کوئی حق

نہیں پہنچتا مجھ سے اس طرح سوال کرنے کا۔"

"جانتا ہوں۔" اُس نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔ ایک ہی جملے نے تنے اعصاب کو ڈھیلا کیا۔

"حق سے پوچھ بھی کون رہا ہے۔ رفیق سر نے آپ کا خیال رکھنے کا نہ کہا ہوتا تو بھاڑ میں جھونکتا آپ جیسی لڑکی کو، آپ کی ان حرکتوں سمیت......" اس کا بس نہیں چل رہا تھا آگے بڑھ کر کنعان کو دو تھپڑ جڑ دیتا۔

"ابو نے......؟" کنعان حیرت زدہ سی واپس پلٹی۔ "وہ آپ سے کیوں کہنے لگے میرا خیال رکھنے کو؟"

"شک مت کریں۔ انہوں نے محض اکیلے پن اور دوری کی وجہ سے کہا تھا کہ آتے جاتے آپ کے ساتھ رہا کروں۔"

"باقی جہاں آپ جانا جانا چاہیں، شوق سے جائیں۔ میری بلا سے۔" وہ اب روکھے لہجے میں کہتے باقاعدہ واپسی کے لیے مُڑ گیا تھا۔

"وہ باسط بھائی تھے۔ دیا کے منگیتر......" کنعان نے اطلاع دینے کے انداز میں پیچھے سے کہا۔ سوار کے قدم ذرا دیر کو وہیں رکے۔ مُڑ کر البتہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

"آج ان کی منگنی کی سالگرہ تھی۔ وہ بڑے دنوں سے اس دن کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ باسط بھائی کا گفٹ بھی وہ آج ہی انہیں دینا چاہتی تھی۔ لیکن تیز بخار کی وجہ سے اس کے ابو نے اسے اکیڈمی آنے کی اجازت نہیں دی۔ مجھ سے اس نے بس اتنی فیور مانگی کہ یہ گفٹ کسی طرح باسط کو دے دوں۔" کنعان کا صفائی دیتا لہجہ خوب ہی جتانے جیسا تھا۔ طنز کی کاٹ کو محسوس کرتے سوار اس کی طرف مڑا۔

"رفیق سر کو بتا کر آئی تھیں؟" سوار نے اس بار ٹھنڈے ٹھنڈے استفسار کیا تو کنعان کی رفتار سے چلتی زبان کو ایک دم بریک لگی۔ سر بھی بے اختیاری جھک گیا۔

"آپ کو یہ زیب دیتا ہے کنعان؟" گمبھیر سنجیدہ لہجے میں جانے ایسا کیا تھا، کنعان کا دل ڈوبنے لگا۔ سوار ایک مرتبہ پھر سیڑھیاں اترنے لگا تھا بنا اس کی طرف دیکھے اور اسے بلائے۔

"مجھ جیسی لڑکی کو شاید یہی زیب دیتا ہے۔" کاٹ دار لہجے میں کہتے وہ اس سے پہلے تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر گئی۔ سوار کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اسے کچھ دیر پہلے کے اس کے اپنے کہے الفاظ یاد دلا گئی تھی۔ پیشانی مسلتے اس نے سخت ندامت سے لب چبائے۔ ساری سوجھ بوجھ کا ستیاناس کر بیٹھتا تھا وہ کنعان سے بولتے۔ ایک مرتبہ پھر وہ ایک بہت غلط جملہ بول گیا تھا۔

"چوتھی مرتبہ کچھ بھی غلط بولنے سے پہلے سوچ لینا سوار علی۔" خود کو سرزنش کرتے وہ تھکے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

کنعان ہجوم کو چیرتے اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر اُتارتی بیک وقت کئی محاذوں پہ خود اپنے آپ سے نبرد آزما تھی۔ انکشاف کی طرح یہ سچ ابھی ابھی اس پر عیاں ہوا تھا کہ اپنا راز کسی کے ہاتھوں میں دینا اپنی ذات کی آپ دھجیاں اُڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ وہ دیا جو جانتی تھی کہ کنعان کبھی کسی غیر لڑکے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا نہیں کرتی، اور باسط کو سرِ راہ دیکھ کر جس نے بلا سوچے کالج کو دوڑ لگا دی تھی وہ ایک اتنا بڑا کام کیونکر اسے اتنے مان سے سونپ سکتی ہے۔

کنعان کی سمجھ میں اب اس کیوں کا جواب آرہا تھا۔ اپنی عزتِ نفس کا گلا تو وہ اپنے ہاتھوں گھونٹ ہی چکی جب سوار سے محبت کا کھلے بندوں دیا سے اقرار کیا تھا۔ افسوس کہ دوست آپ کو یوں بھی استعمال کر جاتے ہیں اور صد افسوس کہ آپ خود اپنے راز دوسروں کو دے کر "اِس" طرح بلیک میل ہوتے ہیں۔

دیا نے بنا زیادہ منت سماجت اور درخواست کے انداز میں بات کرنے کے باسط کا گفٹ اس کے ہاتھوں پہ دھرتے اتنا کہا تھا کہ وہ ذیلی راستے کے دائیں طرف پندرہ بیس قدم پر خود ہی اس سے یہ

پارسل وصول کرلے گا۔ اور وہ پارسل ہاتھوں میں لیے چپ کی چپ کھڑی رہ گئی تھی۔

اس وقت کنعان کو یہ لگا تھا کہ دیا اتنے مان سے کام بتا رہی ہے۔ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ لیکن دوستی کا یہ مان خود دیا نے کس بری طرح مجروح کیا تھا اور...... اور سوار...... دل ایک دوسرے خیال سے سکڑ کر مٹھی میں آیا۔ وہ تو آج بھی پہلے دن کی طرح اُسے غلط سمجھتا تھا۔ اوپر سے ابو نے اس کا خیال رکھنے کو بھی کہہ دیا۔ آج کے واقعے نے سوار کو یقین دلا دیا کہ باپ کا بیٹی پہ نظر رکھنا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں تھا۔ سوار کا غصہ، اس کی نفرت، چیخنا چلانا اس پہ برسنا اب سب سمجھ میں آرہے تھے۔ رفیق سر جیسے آدمی کی بیٹی کو بے راہ روی اختیار کرتے دیکھ کر وہ تھپڑ بھی رسید کر دیتا تو جائز تھا غالباً۔

☆☆☆

سکینہ کی آمد نے اُن دنوں خوب ہی بیٹری بھر رکھی تھی شازمہ کے اندر۔ رُکا ہوا نظام بڑے بھرپور انداز میں چل پڑا تھا۔ ذہن پرسکون ہوا تو وہ کئی کام دھندے نکال کر بیٹھ گئی۔ بوجھل سست اعصاب کو اب سے پہلے تو وہ بمشکل گھسیٹے ہوئے تھی۔ سکینہ آئی تو اب وہ بنا تھکے اور رُکے اپنے التوا میں پڑے کاموں کو نمٹانے میں لگی تھی۔ مارکیٹ جانا بھی انہی چند ضروری کاموں میں سے ایک تھا۔ اپنی شاپنگ تو اس نے کرنی ہی تھی۔ اب اس میں سکینہ کی شاپنگ بھی شامل ہوگئی۔ جس قسم کے حلیے میں وہ بے چاری آئی تھی اور جس قسم کے کپڑے وہ پہنے ہوئے تھی۔ جلد از جلد کچھ اچھے کپڑوں جوتوں کی شاپنگ تو بہت ہی ضروری تھی۔

''شازمہ باجی گول گپے۔'' سکینہ نے اس کا بازو ہلایا۔

''اوہ......'' وہ اس کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھ کر ہنسی۔ ''پیک کروالوں؟'' اس نے سکینہ سے تائید چاہی لیکن جواباً اس نے منہ بسورا۔ گھر تک انتظار نہایت صبر آزما تھا۔ شازمہ ہنس پڑی۔

''جھلی ہے بالکل۔'' وہ ہاتھ پکڑ کر اسے گول گپوں کی ریڑھی تک لے آئی اپنے لیے پیک کروانے کا کہہ کر سکینہ کے لیے پلیٹ بنانے کا آرڈر دیا۔

سکینہ کے گول گپے کھانے کے دوران وہ شاپنگ بیگز کو جانچنے لگی تاکہ کہیں کوئی سامان رہ نہ گیا ہو۔

''باجی۔ وہ دیکھیں وقاص بھیا۔'' سکینہ نے اس کی آستین کھینچی۔

''وقاص......'' شازمہ نے دل کی مدھر لے پہ مسکراتے بے چین نگاہیں آس پاس پہ دوڑائیں۔

''ارے کہاں ہیں؟''

''وہ دیکھیں باجی۔ اُدھر...... گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔'' اس بار شازمہ نے ہاتھ کے تعاقب میں دیکھا۔ بلو شلوار قمیص میں پیٹھ کیے وہ شخص دو بچوں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے دو تین شاپنگ بیگ اس نے اگلی سیٹ پر ڈالے اور پچھلا دروازہ بند کر کے سامنے رُخ کرتے فرنٹ ڈور کھولا۔ شازمہ کے سامنے پہلی مرتبہ اس کا چہرا آیا۔ بلاشبہ وہ اس کا شوہر وقاص ہی تھا۔ درمیانی فاصلہ اگرچہ کچھ زیادہ تھا لیکن وہ اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہی تھی۔ نمایاں اُونچی ناک اور دھوپ میں سنہری لگتے اس کے بھورے بال اور کلین شیو چہرا۔ وہ اس کا اپنا وقاص ہی تھا۔ سوائے اس کے بلو ڈریس کے جو شازمہ کے لیے قطعی طور پر نیا تھا۔

گاڑی وہیں سے ٹرن لے کر مخالف سمت کو مڑ گئی تھی۔ شازمہ نے ایک نظر سامنے جاتی گاڑی اور دوسری ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ڈالی اور پھر کچھ طے کرتے وقاص کا نمبر ڈائل کر دیا۔ یہ شام پانچ بجے کا وقت تھا جس میں بقول وقاص وہ کبھی بھی کارخانے کو خالی نہیں چھوڑتا تھا۔ بیل بجنا شروع ہوئی جسے بجائے پک کر لینے کے دوسری جانب سے کاٹ دیا گیا۔ شازمہ کے دماغ میں کھولن سی اُٹھی، بڑی مشکل سے خود پہ ضبط کر کے چند منٹ کے وقفے سے

دوبارہ نمبر ملایا۔ اِس مرتبہ چوتھی یا غالباً پانچویں گھنٹی پر جیسے بہت سوچ بچار کے بعد کال اٹینڈ کرلی گئی۔

"ہیلو۔" بنا اسے مخاطب کیے قدرے محتاط انداز میں فقط اتنا ہی کہا گیا۔

"کیسے ہیں وقاص۔" شازمہ نے بڑی مشکل سے رویہ معمول کا رکھا۔

"ہاں ٹھیک...... کہو سب خیریت ہے ناں؟"

اس نے ایک بار پھر نام لینے سے گریز کیا تھا۔

"ہاں، بس یونہی بات کرنے کو دل کررہا تھا۔"

"اچھا، میں کچھ دیر میں خود کال کرتا ہوں۔ فی الحال کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔" وقاص نے فی الفور معذرت کی۔

"کہاں...... کارخانے میں؟" شازمہ نے پوچھنے میں عجلت دکھائی۔

"ہاں بھئی...... اور کہاں ہونا ہے۔" اس نے جان چھڑا کر کال ہی آف کردی۔

بند اسکرین کو گھورتے شازمہ کے دماغ میں اُس عورت کی باتیں گونجنے لگیں۔

"تمہیں اُس گھر کا ایک چکر تو لگانا ہی چاہیے......" اور پھر وہیں کھڑے کھڑے شازمہ نے فیصلہ کیا کہ اسے اب جلد ہی فیاض بھائی کے گھر جانا ہے۔ وہ گھر جس کے بارے میں آج تک صرف وقاص سے سنا تھا۔ کہیں اس کی حقیقت بھی اِس جھوٹ جیسی نہ ہو جو ابھی وقاص نے بولا تھا۔

☆☆☆

"بڑے نصیب والے ہو یار۔ بس اللہ کا شکر ادا کرتے رہا کرو۔ اس کی مہربانی، اس کا کرم شامل حال رہے تو آگے ہی آگے بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔" سوار نے مٹھائی کا ڈبا میاں جی کے سامنے رکھ کر نئی جاب کی خوش خبری سنائی تو حسب عادت میاں جی سمجھانے لگے۔

"سب آپ کی دعاؤں کے طفیل ہے میاں جی۔ نصیب نے تو نرے چکر ہی دیے ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرا کر اندر ڈھابے کی طرف بڑھ گیا جہاں رب نواز کھڑا معمول کے کام انجام دے رہا تھا۔ اُس کے سامنے مٹھائی رکھ کر اس سے مبارک باد وصول کرکے وہ میاں جی کے پاس واپس آبیٹھا۔ ثمامہ ابراہیم نے آج صبح انٹرویو کے دوران ہی سوار کو مطلع کردیا تھا کہ اسے اسسٹنٹ منیجر منتخب کرلیا گیا ہے۔ سیلری بھی نہایت پرکشش تھی۔ رہائش کے لیے اسے ہوٹل کے اندر ایک روم دے دیا گیا تھا۔ بلکہ اس مرتبہ وہ اپنے کمرے کا اکیلا مالک تھا۔

"کیا بات ہے سوار! کچھ چپ چپ سے لگ رہے ہو؟" خاموشی تو میاں جی نے رات بھی اس کی محسوس کی تھی جب وہ اکیڈمی سے واپس آیا تھا۔ لیکن آج اتنی بڑی خوشی کی خبر کے بعد بھی وہی عالم۔ کچھ اچنبھے کا باعث تھا۔

"کچھ نہیں میاں جی۔" سوار کی پیشانی پر الجھن بھری لکیر سی واضح ہوکر معدوم ہوئی۔

"بتادو سوار۔ شاید میں کچھ مدد کرسکوں۔ باقی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میاں جی صرف لفظوں سے ہی مدد کرسکتے ہیں۔" وہ خود ہی اپنی بات پر ہنس دیے۔

"دل توڑ بیٹھا ہوں کسی کا۔"

"کسی کا یا اپنا؟" بڑا ہی بے ساختہ بولے تھے میاں جی۔ سوار کو ہنسی آگئی۔

"آپ بھی بادشاہ ہیں میاں جی۔ خیرات کی طرح سچ بانٹتے ہیں۔ ویسے صحیح سمجھے آپ بھی۔" "کسی اپنے کا۔"

"کون ہے بے چاری، جو تمہارے عتاب کا شکار ہوگئی۔" میاں جی اب لطف لے رہے تھے۔ سوار کی خاموشی کی وجہ قدرے دلچسپ نکلی تھی۔ وہ کچھ ذہنی طور پر ریلیکس ہوئے۔ متاثرہ شخص کو "بے چاری" کہنے میں بھی ذرا تامل نہیں کیا۔

"رفیق سر کی بیٹی ہے۔ پہلے ازمیر ہوٹل کے دوران تھوڑا بہت تعارف تھا اب اکیڈمی میں ساتھ ہے۔"

"ہوں...... تو......" میاں جی سمجھ نہیں

پائے۔ ''وہ دل؟''

''شروع دن سے کچھ نہ کچھ ایسا غلط کہہ بیٹھتا ہوں اسے کہ بعد میں نرا پچھتاوا ہوتا ہے۔ وہ سچ مچ ایک اچھی لڑکی ہے۔ خاموش طبع، شریف اور بہت معصوم۔ پھر پتا نہیں کیسے......'' وہ سخت تاسف سے ہلا رہا تھا۔ ''میرا ہی دماغ خراب ہے۔''

''کیا کہہ بیٹھے ہو یہ بھی بتا دو۔'' میاں جی کا تجسس بھی پوری طرح ابھرا تھا۔ سوار نے پہلے دن اس کے کاؤنٹر پر چابی دینے والی لڑائی، اس کے بعد کنعان کی نام کے ساتھ بی بی نہ لگانے اور اپنے بھائی والی کنفیوژن اور اب دیا کے منگیتر کو پارسل دینے والی بات کی پوری تفصیل سنا دی۔ وہ کچھ دیر تک پرسوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔

''یہ افسوس صرف اسے غلط سمجھنے تک کا ہے۔ بس؟''

''جی؟'' سوار نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

''پسند کرتے ہو اسے؟'' میاں جی مسکرائے۔ سوار نے ایک سرد آہ کھینچ کر دور چناروں کو دیکھا۔

''پہلے دن سے۔''

''ہائیں؟'' میاں جی سچ مچ بدکے۔ ''اوئے تو تو بڑا گھنا ہے۔'' وہ آنکھیں پھیلا کر اسے سخت تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ سوار کی سنجیدگی پھر بھی نہیں ٹوٹی۔

''گھنا نہیں میاں جی۔ برا ہوں...... بہت برا......''

''ارے اب ایسا بھی کچھ نہیں ہوا کہ......''

''خود سے کچھ عہد کیے تھے میاں جی۔ گھر سے نکالے جانے کے بعد۔ پنیاں کے میدانوں میں چکراتے ان سات دنوں میں۔ جب میں بالکل کورے کاغذ جیسا تھا جس پر اب ہر تحریر نئے قلم سے نئے بالکل انجان لفظوں سے لکھی جاتی تھی۔ وہ تحریر جس کے کچھ مندرجات میں نے خود ترتیب دیے تھے۔ سوار علی ''کیا'' تھا اسے بھول کر۔ سوار علی کو ''کیسا'' ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر۔ لیکن کچھ بھی ویسا نہیں ہو رہا، جیسا میں چاہتا تھا۔''

''لیکن کسی کا اچھا لگنا تو کوئی بری بات نہیں ہے۔''

''میں اپنے وعدوں میں دیر تک ثابت قدم رہنا چاہتا تھا۔ ایسے میں جب پہلے ہی مرحلے پر عہد شکنی کرنی پڑے تو اپنی نظر میں اپنا آپ بے اعتبار ہونے لگتا ہے...... دوستی، بھروسا، محبت...... میں شدید خائف ہوں ان تین الفاظ سے...... کنعان سے وہ اول روز کی لڑائی شام ہوتے میری نسوں میں اتر کر سوئیوں سا چبھنے لگی۔ میں کاؤنٹر پر آنے والی اس لڑکی کو برا سمجھ کر جانے اپنے کس شیطانی خیال کی تسکین پا رہا تھا۔ دل نے مضحکہ اڑایا کہ دیکھو دنیا میں ایک تم ہی برے نہیں ہو۔ غلط راستے پر تو سبھی کے قدم بہک جاتے ہیں۔ اٹھارہ، بیس سال کی اس بظاہر معصوم صورت لڑکی کو دیکھو۔ کس دھڑلے سے ہوٹل میں کمرا بک کروانے آئی کھڑی ہے۔ اور جب حقیقت کھلی تو ساری رات وہ معصوم شکوہ بھری آنکھیں میرے اندر پیوست ہوتی رہیں۔ میرے دل میں زہر بجھے خنجر سا اترتی وہ نگاہ جتنی نفرت آمیز تھی، میرے اندر کو توڑنے میں اسی قدر شدید بھی تھی۔ اگلی صبح سیڑھیاں اترتے جب میری نظر اس پر پڑی وہ پیٹھ کیے شیشے کے دروازے سے باہر جانے کو تھی۔ دل میں آیا، ہینڈل پہ دھرے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف موڑوں اور اس کی آنکھوں میں دیکھوں۔ کیا سچ مچ وہ زہر اب بھی بھرا ہے ان آنکھوں میں جس نے رات بھر مجھے ایک بھی پل سونے نہیں دیا تھا۔''

''کبھی اظہار بھی کیا اس سے؟''

''ہرگز نہیں میاں جی۔'' سوار نے بے ساختہ سر نفی میں ہلانا شروع کیا۔ ''نہ کبھی سوچ سکتا ہوں۔''

''پر کیوں؟'' وہ حیران ہوئے۔ ''اتنی سختی کس لیے۔ جبکہ وہ اچھے گھر......''

''الٹی پٹیاں نہ پڑھائیں میاں جی۔'' سوار نے سخت خفگی سے گھورا۔ ''میں ناراض ہو کر چلا جاؤں گا۔''

"ارے پر کیوں؟" ان کی تان حیرت بھری کیوں پہ اٹکی تھی۔

"کیونکہ آپ کچھ نہیں جانتے۔" وہ ہنوز نروٹھا ساتھا۔ میاں جی ہنس پڑے۔

"اچھا ٹھیک ہے، مجھے جاننا بھی نہیں ہے۔ لیکن اُس سے یہ میاں بیوی والے جھگڑے تو چھوڑ دو۔ پیار نہیں تو تکرار بھی آخر کیوں۔" اس بار میاں جی زچ ہوئے تو سوار کا پہلی مرتبہ قہقہہ بلند ہوا۔ دور کھڑے رب نواز نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا۔ میاں جی اپنے لاڈلے کو ہنسانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

"بات ایسی کریں گے بندہ اندر تک توانا ہو جائے۔" کنعان کے حوالے سے "میاں بیوی کے جھگڑے والی بات نے سوار کے لبوں پر بے ساختہ ہنسی بکھیر دی تھی۔

"کرنا توں فیروی کجھ نئیں کھوتیا۔" میاں جی اب منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ سوار ہنستا چلا گیا۔

"پہلے "اپنی" من مانی کر کے شہر سے نکالا گیا تھا۔ مری سے لگتا ہے آپ کے مشورے نکلوائیں گے۔"

"اچھا بس یہ لڑنا جھگڑنا چھوڑ دے اس سے۔ یہ بتاؤ کوکنگ کلاس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"کوکنگ کلاس۔" سوار کو اچنبھا ہوا ان کے سوال پر۔ "جاری رہے گی اور کیا۔"

"میرا مطلب ہے اُن نئی میڈم سے بات ہوئی اس بارے میں؟"

"باقاعدہ بات تو نہیں ہوئی لیکن وہ جانتی ہیں اس بارے میں۔ بلکہ میڈم سے پہلی ملاقات وہیں تو ہوئی تھی۔"

"لیکن اب ضرورت کیا ہے کوکنگ شوکنگ سیکھنے کی۔ اتنی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ بلاوجہ وقت کا زیاں۔"

"اچھا۔" سوار نے پہلی مرتبہ سوچنے والے انداز میں ابرو چڑھائے۔ اب سے پہلے واقعی اس نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ پھر ثمامہ میڈم نے بھی کلاس کے دو گھنٹوں کو موضوع نہیں بنایا تھا۔ ٹھوڑی کو ناخن سے کھجاتے اب وہ غور و غوص کرنے لگا تھا۔

"اتنی ہی الجھن ہے تو مشورہ کرلو اوروں سے۔" میاں جی نے اپنی طرف سے سادہ حل بتایا۔ سوار ہنس پڑا۔

"اوروں میں کون...... لے دے کہ آپ ہی ہیں جن سے ہر بات شیئر کر لیتا ہوں...... یا پھر میڈم سے پوچھ سکتا ہوں۔"

"بس اور کوئی نہیں؟" میاں جی کے سوال میں واضح شرارت چھپی تھی۔ سوار نے جتانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے میاں جی۔ تین لوگوں کی رائے لے لیتے ہیں۔ فیصلہ اکثریت سے کرلیں گے۔"

"اپنے آپ کو ساتھ شامل کرلو تو دو، دو کے گروپوں میں میچ تمہارا پھر بھی ٹائی ہو جانا ہے۔" وہ بھی میاں جی تھے۔ سوار کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔ دو، دو کے گروپوں میں ایک میاں جی اور ثمامہ کا تھا جو کوکنگ کی مخالفت میں بولنے والے تھے اور دوسرا یقیناً اس کا اور کنعان کا۔

"کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ نہ دیں میاں جی۔ اس کے ہاتھ آ گیا تو کچا چبا جائے گی۔ صورت پہ لکھا ہے کہ کتنا برا سوچتی ہے میرے بارے میں۔"

"چل فیر رہن دے۔" میاں جی نے مصنوعی مایوسی ظاہر کی۔ اور سوار جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بس......؟"

"ثمامہ میڈم نے بنا میرے کہے ہی آدھی سیلری ایڈوانس میں دے دی ہے۔ سب سے پہلے مشتاق بھائی کی طرف جاؤں گا۔ اُن کا اُدھار لوٹانا ہے۔" پھر بٹوہ نکال کر کچھ نوٹ میاں جی کی طرف بڑھائے۔ "یہ وہ رقم جو آپ نے اکیڈمی کی فیس کے لیے دی تھی۔ اس کے علاوہ تو کچھ کپڑوں کی شاپنگ ہے۔"

‘‘یار ایک موبائل بھی خرید لو اب۔ تم سے رابطہ کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ غائب ہو جاؤ تو بندہ خیر خبر بھی معلوم نہیں کرسکتا۔’’

‘‘جی بالکل۔ وہ بھی ہے ذہن میں۔ میڈم سے رابطے کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ تو چلیں چھوٹا موٹا ہی سہی۔ ایک موبائل بھی آج ہی خرید لیتا ہوں۔’’

‘‘میں بھی نماز پڑھ لیتا ہوں۔ مغرب کی اذان کب کی ہو گئی۔’’ وہ اپنا صافہ سنبھالتے خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے

‘‘دعا کیجیے گا میاں جی۔ آسانی کی...... بہتری کی......’’ وہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

‘‘میں تو کرتا ہی ہوں۔ تم بھی نماز پڑھا کرو۔ عمر نہیں ہے تمہیں سمجھانے کی۔ اب تو اندر سے خواہش جاگنی چاہیے۔’’ وہ نصیحت کرنے سے نہیں چوکے۔ سوار نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆

‘‘باسط کو گفٹ بہت پسند آیا تھا۔ کہنے لگا بہت جلدی تم میری پسند کو سمجھنے لگی ہو۔’’ ریسیپشن پر چابی دے کر نکلتے ہی دیا شروع ہو گئی۔ کنعان بنا کچھ کہے چلتی رہی۔

‘‘میں تو ویسے سخت ناراض تھی باسط سے۔ سچی بات ہے میں جوابی تحفے کی امید لگائے بیٹھی تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا بڑے مورکھ ہو باسط۔ پتا بھی تھا میں گفٹ بھجوا رہی ہوں۔ تم کچھ نہیں بھیج سکتے تھے میرے لیے۔’’

‘‘چپ رہو دیا۔’’ کنعان کا چہرا سرخ ہونے لگا۔ ‘‘اُس’’ ذکر پہ۔ دیا کو بھی یک لخت بریک لگی۔

‘‘کیا ہوا کنعان؟’’ وہ کچھ نروس ہوئی۔

‘‘تم نے میری بساط سے بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا مجھ پر۔ میں اس دکھ سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی۔’’ کنعان کی پلکیں نم ہونے لگی تھیں۔ دیا سخت گھبرا گئی۔

‘‘کیا ہوا کنعان۔’’

‘‘تم پوچھ رہی ہو دیا کہ کیا ہوا؟’’ وہ بیچ راہ میں رُک گئی۔ ویک اینڈ کے بعد ان کی آج ملاقات ہو رہی تھی۔ اور یہ وقت کنعان نے کیسے گزارا تھا ایک وہی جانتی تھی۔ ‘‘تم...... جو یہ جانتی تھیں کہ غیر مردوں کے ساتھ بات کرنا میرے لیے ہمیشہ سے کتنا دشوار رہا ہے۔ تم نے مجھے اکیلے باسط کو گفٹ دینے بھیج دیا اور میں......’’ وہ سسک پڑی۔ ‘‘کتنی بڑی بے وقوف ہوں، تمہیں بخار میں مبتلا دیکھ کر دوستی نبھانے چلی تھی۔’’

‘‘کچھ ہوا ہے کیا؟’’ دیا کا چہرا ہلدی پڑ گیا۔ جانے کیسے کیسے وہم دامن گیر ہونے لگے۔

‘‘شک مت کرو۔’’ کنعان اب خود کو سنبھال کر دوبارہ چلنے لگی تھی۔ نم آنکھیں بھی اس نے ہتھیلی سے رگڑ ڈالیں۔ ‘‘ایک ہی بات اس پورے قصے میں اچھی ہے کہ منگیتر تمہیں بہت نائس اور وفادار ملا ہے۔ خوش قسمت ہو۔’’ وہ جبراً خود کو مسکرانے کے لیے آمادہ کرسکی۔ جان گئی تھی کہ دیا کن وہموں میں پڑنے لگی ہے۔ اس کے خدشے دور کرنا بھی ضروری تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ باسط نے بہت سلجھے انداز میں بڑی عزت کے ساتھ بات کی تھی۔ لیکن اس کے بعد...... کنعان کا دل بری طرح سکڑا۔ مڑتے ہی سامنے کا منظر۔ سینے پر ہاتھ باندھے نفرت اور غصے بھری نگاہ سے دیکھتا۔

‘‘آئی ایم سوری کنعان۔’’ دیا سخت شرمندہ نظر آنے لگی۔ ‘‘باسط سے جب میں نے گفٹ نہ بھیجنے کا شکوہ کیا تو اُس نے بھی مجھے یہی کہا تھا کہ دوستوں کو پیغام رساں بنانا اچھی بات نہیں ہے۔ وہ میرا گفٹ لے چکا تھا لیکن تمہارے ہاتھ بھیجنا اسے مناسب نہیں لگا۔’’

‘‘چلو۔’’ کنعان ہلکا سا مسکرائی۔ ‘‘اتنی قدر پر بھی شکر گزار ہوں۔’’

‘‘مجھے معاف کردو کنعان۔ میں وقتی طور پر واقعی سیلفش ہو گئی تھی۔ آئندہ کے لیے کان پکڑ کر توبہ۔’’ وہ سخت شرمندگی سے باقاعدہ کان پکڑے ہوئے تھی۔ کنعان نے مسکرا کر ایک نظر اس کی حالت

دیکھی۔

”دل تو چاہتا ہے کالج تک تمہیں کان پکڑوائے رکھوں۔ پھر تمہیں سمجھ میں آئے کہ دوستوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔“

”میں تیار ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟“ دیا ایپ کان پکڑے سر ٹیڑھا کیے اسے دیکھنے کی کوشش میں تھی۔ کنعان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کانوں سے الگ کیے۔

”کچھ نہیں ہوا تھا۔ بس مجھے اچھا نہیں لگا۔“ وہ جان بوجھ کر کنی کترا گئی۔

”سوار نہیں نکلا تھا تمہارے ساتھ؟“ دیا کو یہ خیال تو آنا ہی تھا۔

”نہیں۔ وہ ناظمہ میم کے آفس میں تھا۔ میں جان بوجھ کر جلدی نکل آئی تھی۔“ وہ اعتماد بحال کرتی صاف اس موضوع سے بچ نکلی۔ دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ آئندہ دیا سے بھی ہر بات سوچ سمجھ کر شیئر کیا کرے گی۔

☆☆☆

گلاس وال کے پار آج بھی رم جھم ایک تسلسل سے جاری تھی۔ دوپہر کے وقت بھی منہ اندھیرے کا سا گمان ہو رہا تھا۔ پیٹرا اِن کے سامنے والی سڑک پر عام طور پر اکا دکا سیاح دکھائی دیتے تھے۔ بارش کے باعث تو وہ بالکل خالی نظر آنے لگی تھی۔ سڑک پار کے منظر میں چلغوزے اور چیل کے درخت دُور تک ایک قطار میں دکھائی دیتے۔ سوار ٹاپ فلور کی چھت پر بنے کافی ہاؤس کی طرف روم سروس کے عطا اللہ اور خوشی محمد کے ساتھ گیا تھا۔ کافی ہاؤس کا افتتاح آنے والے چند روز کے دوران ہونا تھا۔ فی الحال یہاں بھی ڈیکور کا کام ہو رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے وہ تینوں ہی اچھے خاصے بھیگ گئے تھے۔

سوار اپنے کمرے سے نئی ڈریس تبدیل کر کے نکلا تو گلاس وال پر گرتے شفاف بارش کے قطرے عجیب ہی خوب صورت نظارہ پیش کرنے لگے۔ وہ گھنی مونچھوں پر دائیں بائیں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی پھیرتے پھیکی مسکان کے ساتھ کچھ دیر اس سین منظر کو دیکھتا رہا۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں ثمامہ میڈم ابھی آئی تھیں کہ نہیں۔ نہ اسے ریسپشنسٹ سے پوچھنے کا موقع ملا تھا نہ ہی آفس کے اندر جانے کا۔ ثمامہ اور اس کا مشترکہ آفس تھا۔ لیکن اس کی موجودگی میں وہ زیادہ وقت ریسیپشن ایریا میں گزارتا تھا۔ یوں بھی اس کی آمد دن بھر کے دوران دو تین گھنٹوں کے لیے ہی ہوتی تھی۔

”سر، میڈم آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“ وہ ریسیپشن کی طرف آیا تو آصف مؤدب سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ سوار سر ہلاتے سیدھا آفس کی طرف بڑھ گیا۔

”آیئے سوار۔ آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی۔“ ثمامہ نے مسکرا کر آغاز لیتے بغور سوار کو سر سے پیر تک دیکھا۔ بلیک فل شرٹ اور فان کلر کی ڈریس پینٹ میں وہ کس قدر شان دار لگ رہا تھا۔ بال ہلکے بھیگے سے تھے جسے ہاتھوں سے پورا پیچھے کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہ جیل جیسے سیٹ نظر آتے اسے کسی ایڈ ماڈل دکھا رہے تھے۔ وہ اب کرسی سنبھالتے اس کے مقابل بیٹھ چکا تھا۔

”یہ اُن بارہ لوگوں کے رابطہ نمبر ہیں سوار۔ ج آپ ہی ناظمہ میڈم سے لائے تھے۔“ اس نے ایک پیپر سوار کی جانب بڑھایا۔ ”میری فون پر مسز ناظمہ سے ابھی بات ہوئی ہے۔ اُن کے مطابق نمبرز صرف ان ہی افراد کے ہیں جو اکیڈمی سے فارغ ہو کے بعد جاب کی خواہش رکھتے تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ ان میں سے کتنے انٹرویو کی حامی بھر ہیں۔“

”جی میم۔“ سوار نے لسٹ ہاتھ میں لیتے ایک نظر پیپر پہ دوڑائی۔

”آپ انہیں انٹرویو کے لیے کنوینس کریں او اگر وہ اپنی جاب کے متعلق مزید تفصیل جاننا چاہیں یہ.....“ اس نے ایک دوسرا پیپر سوار کے آگے کیا۔ اس میں ہوٹل کے متعلق تمام تفصیل ہے۔ آپ خو بھی ایک بار پڑھ لیں گے تو ہر قسم کے سوال کا جوا

دینا آسان ہو جائے گا۔"

"جی۔ اور انٹرویو کا دن اور وقت؟" اس نے اپنے خم دار ابرو ذرا سا اٹھاتے اس بار ثمامہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"سنڈے ٹھیک رہے گا۔ یعنی کہ پرسوں۔ صبح دس سے بارہ ایک کا کہہ دیں۔ ہمیں انٹرویو کے بعد ڈیمو بھی لینا ہوگا۔"

"جی میم۔ اور آپ نے روم سروس کے لیے کچھ اور لڑکے بھی فائنل کیے تھے۔ کسی کامران احمد کا فون آیا تھا صبح۔"

"اوہاں۔" ثمامہ کو خیال آیا۔ "اُسے بھی بلا لیں کل۔ ماہ رمضان کی آمد سے پہلے پہلے باقی ماندہ عملہ پورا کرنا ہے۔ روم سروس کے لیے ابھی بھی لڑکے بہت کم ہیں۔ اس کامران احمد کے جوائن کرتے ہی ہم ایک انٹرویو اور کریں گے۔ اور ریسیپشن کے لیے بھی ایک بندہ اور رکھ لیتے ہیں۔ باقی کلیننگ وغیرہ کے عملے کے لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ آپ کچھ دنوں کی آبزرویشن کے بعد مجھے رپورٹ دیں کہ کہاں کہاں کمی ہے۔"

"جی۔" سوار نے سر ہلایا۔ "میرے ذہن میں آل ریڈی کچھ باتیں ہیں۔ میں کل آپ کو فائنل رپورٹ دیتا ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ جس روز سارا اسٹاف موجود ہو، ایک چھوٹی سی میٹنگ بھی کر لیں گے۔ ماہ رمضان کے افتتاح کی خوشی میں ایک گرینڈ افطار پارٹی کا ارادہ ہے۔ اس کو بھی ڈسکس کر لیں گے۔ باقی خالد رضا کی غیر موجودگی میں آپ کی حیثیت منیجر کی ہے۔ یہاں سب کو یہ باور کرانا بہت ضروری ہے کہ بنا آپ سے مشورہ کیے یہاں کوئی اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔"

"جی۔" وہ سعادت مندی سے سر ہلاتے اب ہاتھ میں پکڑے پیپرز کو ارینج کر رہا تھا۔ ثمامہ نے انگلیوں میں پین گھماتے دوسری مرتبہ بھرپوری توجہ سے اسے دیکھا۔ وہ اُلٹی مانگ نکالتا تھا۔ اُس کے بال نہ گھنگھریالے تھے نہ بہت سلکی۔ البتہ اس کی پرسنالٹی کی طرح بالوں میں بھی ایک طرح کی مردانہ تختی تھی۔ جہاں کنگھی کرو وہیں ٹھہر جانے والے اُٹھے اُٹھے سے۔ کسی ہیرو جیسے بال۔ اور ہیرو تو وہ تھا ہی۔ سرتاپا۔ کشادہ پیشانی پر دور تک کمان بناتے گھنے اور نمایاں ابرو۔ بھاری غلاف والی شفاف روشن آنکھیں، کالی لیکن ہلکی گھنی نفیس داڑھی، کتابی چہرا اور چہرے کے ساتھ ہر لحاظ سے مناسبت رکھتے ہونٹ اور مونچھیں، مناسب اونچی ناک، صاف رنگت۔

ثمامہ کا ویران، تنہا دل جیسے بھرنے سا لگا۔ ایک اجنبی چہرے کو یانوس نظروں سے دیکھنے کی یہ کوشش اگرچہ پہلی نہیں تھی لیکن بہرحال برسوں بعد پھر ویسی کیفیت بہت بھلی بڑا گدگداتا سا احساس لیے ہوئے تھی۔ برسوں سے قید من کا پرندہ بڑی بے تابی سے پھڑپھڑانے لگا۔

"آپ کے گھر میں کون کون ہے؟" وہ بنا سوچے پوچھ بیٹھی تھی، حالانکہ جس "کون" کے متعلق جاننے کی خواہش سوال بن کر لبوں پر مچلی تھی۔ وہ سوال ابھی دماغ کے کسی گوشے سے محض اُبھرا ہی تھا کہ زبان پھسل گئی۔ سوار نے بہت چونک کر اپنے بھاری پپوٹوں کو اوپر اُٹھانے کی زحمت دی تھی، محض خاموش کچھ جتاتی ہوئی نگاہ۔

ثمامہ لمحے کو گڑبڑا سی گئی۔ بھلے وہ اس کا ماتحت اور وہ اس کی باس تھی، لیکن اُس کمزور لمحے میں وہ صرف ایک عورت تھی جو توجہ سے اپنی جانب دیکھتے مرد کی بھرپور نگاہوں کی تاب نہ لاتے جھک جایا کرتی ہے۔ وہ بلاوجہ پیپر ویٹ کو دائیں بائیں کرنے لگی۔

سوار نے اپنی سوفٹ سی مسکراہٹ کو لبوں کے اندر ہی کہیں دبا لیا۔ وہ ایک ذہین زمانہ شناس مرد تھا۔ سامنے بیٹھے بندے کی پل میں بدلتی کیفیت کو سیکنڈز میں جانچ لینے کے فن سے آگاہ۔

"سب ہی ہیں۔" اُس نے مبہم جواب سے جیسے ثمامہ کو چڑا کر مزا لیا۔ وہ اب کسی حد تک اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔ بڑا مصنوعی سا مسکرائی۔

"اچھا۔ ماشاء اللہ۔ کیا یہیں ہوتے ہیں سب۔ مری میں؟"

"جی نہیں۔ یہاں صرف میں ہوں، باقی سب ہری پور میں ہیں۔"

"تو پھر کب بلائیں گے فیملی کو؟" وہ شاید بات بڑھانے کے موڈ میں تھی۔ "اب تو آپ پکی جاب والے ہوگئے ہیں۔"

"جب "اپنی" فیملی والے ہوجائیں گے تب بلا بھی لیں گے۔" وہ کھل کر مسکراتے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ثمامہ نے بھی بوجھ سے آزاد ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"چلیں۔ اللہ آپ کو جلد فیملی والا کرے۔" اور سوار نے جواباً بڑے جتاتے اور زبردست انداز میں "آمین" کہا۔

"مجھے اب اجازت میم۔"

"ٹھیک ہے سوار۔ گھنٹہ بھر میں اور یہاں ہوں۔ اس کے بعد آپ آفس سے سب کو کالز وغیرہ کرلیں۔"

"جی۔" اس بار وہ مڑ کر باہر چلا گیا اور ثمامہ نے ایک سکون بھری گہری سانس باہر نکالی۔ جو وہ سوچ رہی تھی جواب بھی حسب توقع ہی ملا تھا۔

☆☆☆

اکیڈمی کے پچھلے لان میں اُس وقت صرف عمران اور دلیر بھائی بیٹھے تھے۔ سوار قدرے بے چینی محسوس کرتا گیٹ سے واپس پلٹا تھا۔ دیا اور کنعان کی آج پارسل بنانے کی باری تھی، وہ بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے شاید کام میں مصروف ہوچکی تھیں۔ سوار کا اکیلے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا تبھی پلٹ آیا تھا۔ تقریباً سب ہی اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ دلیر بھائی اور عمران چونکہ مسجد میں پارسل دیتے ہوئے گھروں کو جاتے تھے اس لیے پارسل تیار ہونے تک لان میں بیٹھنا ان کی روٹین تھی۔ آنسہ اور ندرت کو برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھا دیکھ کر وہ ان کی طرف آ گیا۔

"خیریت۔ بچا ہوا پاستا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے؟" مسکرا کر چھیڑتے اس نے ستون سے ٹیک لگائی۔ ندرت نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"تمہیں بھی ندیدوں کی طرح پاستے پہ ٹوٹتے دیکھا تھا آج۔"

"بس یہی دیکھا؟" اس نے استہزائیہ کہتے ہاتھ آگے کیا۔ "آج تو میں پارسل بھی گھر لے جا رہا ہوں۔"

"معصوم بچوں کے منہ سے نوالہ چھینتے شرم تو نہیں آتی۔" ندرت کو ابھی تک افسوس تھا اس کے جملے پر۔ آنسہ ہنسے جا رہی تھی۔

"بس کرو بھئی۔" اس نے سوار کی طرف دیکھا۔ "آج دیا اور کنعان کے ساتھ انعم کی باری ہے پارسل بنانے کی۔ ہم اسی کا ویٹ کر رہے ہیں۔"

"اچھا؟" سوار ایک دم اچنبھے سے سیدھا کھڑا ہوا۔ "کون کرتا ہے اس قسم کی گروپنگ۔ جب انعم کا رُوٹ ہی نہیں ہے دیا کنعان والا تو بلاوجہ نہ صرف وہ بلکہ تم دونوں بھی سفر کر رہی ہو۔ ایک منٹ۔"

وہ ماتھے پہ گہرا بل ڈالے اندر بڑے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کھانے کی میز پر سبھی اپنی اپنی ٹیبل کے کھانے رکھ کر جاتی تھیں۔ دیا کنعان اور انعم کام میں جتی تھیں۔ سوار نے ایک گہری بھرپور نگاہ کے حصار میں کنعان کو لیا جس نے اندر داخل ہوتے سوار پر ایک سرسری نظر ڈالی، پر نگاہوں کے تبادلے پر سخت گڑبڑاتے دوبارہ کام میں لگ گئی۔

"انعم آپ گھر جائیں۔ آپ کا کام میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"ارے نہیں سوار میں کرلوں گی۔"

"چھوڑیں بھئی۔" وہ مزید آگے آیا۔ "آپ کی وجہ سے بلاوجہ ندرت اور آنسہ کا ٹائم ویسٹ ہور ہے۔ کل میں خود ہی گروپس ارینج کروں گا۔ ایک رُوٹ والوں کو ایک ساتھ کام کرنا چاہیے۔ آپ جائیں۔ ہم لوگ تو ویسے بھی ساتھ نکلنے وا ہیں۔"

"اوکے۔" وہ بھی سر ہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

تھینکس سوار۔ گھر پہ آج کچھ ضروری کام بھی تھا۔" وہ مسکرا کر ہاتھ ہلاتی آگے بڑھ گئی۔ سوار خود کو خدمت کے لیے پیش کرتے انعم والی کرسی گھسیٹ کر خود ہی سہولت سے بیٹھ گیا۔

"ہم ابھی یہی بات کر رہے تھے سوار بھائی کہ گروپس بنانے والے نے باریکیوں کا خیال نہیں رکھا۔" دیا نے کچھ خالی باؤل اس کے آگے کیے۔

"صرف آپس میں بات کرلینا کافی نہیں۔ اسٹینڈ لینا آنا چاہیے۔" وہ رسان سے مسکرایا۔

"اُس کے لیے آپ ہیں ناں سوار بھائی۔" دیا نے مسکراتے ہوئے اس کی ذات پر بھرپور اعتماد ظاہر کیا۔ سوار نے حسبِ معمول خاموش بیٹھی کنعان پر ایک چور نظر ڈالتے کچھ سوچنا شروع کیا۔ اور جو وہ سوچ رہا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے کچھ تو ہیرا پھیری ضروری تھی۔

"کھانے کے حساب سے برتن کچھ کم نہیں ہیں دیا جی؟"

"جی سوار بھائی۔ ڈسپوزبل برتن مس مومنہ کی الماری میں رکھے ہیں۔" وہ چابی مجھے دے گئی ہیں۔ اس نے ٹیبل پر دور رکھی چابیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بس اتنے ہی لائیے جتنے ابھی کے لیے چاہئیں۔" سوار نے اگلے جملے کے اضافے سے یہ بھی جتا دیا کہ اس کام کے لیے وہ خود ہی جائے گی۔ اامحالہ کچھ دیر بعد دیا کو اُٹھنا ہی پڑا کیونکہ پیچھے اب دو تین باؤل ہی رہ گئے تھے۔ چابیاں ہاتھ میں لے کر وہ کمرے سے باہر گئی اور سوار نے کام میں مصروف لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتی کنعان کو دیکھا۔

"فرینڈز؟" انداز دھیما ہلکی منت لیے ہوا تھا۔

"ہوں؟" غش کھانے کی حد تک حیران ہوتے کنعان نے سر اُٹھایا۔ کیا واقعی سوار نے وہی کہا جو اس کے کانوں نے سُنا۔ وہ نرم دوستانہ مسکراہٹ لیے سادگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کنعان جھٹکے سے نکل آئی تھی۔ دوبارہ سر جھکا کر کام کرنے لگی۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔ میں اس دن بہت کچھ غلط بول گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنوز سر نیچے کیے ہوئے تھی۔ "میری غلطی بھی تھی۔"

"ہوں۔ اور دوستی؟" وہ پھر مطلب کی بات پر آیا۔ کنعان مسکراہٹ چھپانے میں ناکام رہی، سر پھر بھی نہیں اُٹھایا۔

"یہاں بہت لوگ ہیں دوستی کرنے کے لیے۔" وہ سادگی سے کہتی ہنوز کام میں لگی تھی۔

"میں نے کیا دوستی پیکیج متعارف کروایا ہے۔" سوار کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔ کنعان مسکرادی۔

"تو پھر......"

"بہت جھگڑا ہو گیا۔ اب اچھے بچوں کی طرح رہنا چاہیے۔"

"لیکن "دوستی" ضروری ہے کیا؟" وہ بھی آہستہ آواز میں بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ جیسے خود بھی ماحول کے زیرِ اثر ہو۔

"نہیں۔" سوار نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ کنعان نے اس کی بدلتی کیفیت کو ذرا سا پلکیں اُٹھا کر دیکھا جب سوار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "بہت ضروری ہے۔"

"اچھا۔ وہ کیوں؟" کنعان کا دل اس گہرے جملے سے بری طرح اُچھل پتھل ہوا لیکن بظاہر اس نے لہجے سے خود کو بااعتماد اور نارمل ظاہر کیا۔

"بھئی، ان جھگڑوں کی ہیٹ ٹرک نے میرا امپریشن اتنا خراب کر دیا ہے کہ اب اپنی نظروں میں امن پسند بننا ضروری ہو گیا ہے۔" سوار نے اس سے زیادہ سادگی سے نارمل انداز میں وضاحت دی، اور کنعان ہنسی نہ روک سکی۔

"اور ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا یہاں سب بہت دوستانہ انداز میں رہتے ہیں۔" سوار نے مزید اضافہ کیا۔

"جی صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ دراصل کچھ دنوں سے میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ یہاں کا ماحول بہت اچھا بہت دوستانہ ہے۔ مجھے عام انسانی رویوں کے متعلق بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔"

وہ اب بہت نارمل لہجے میں بات کر رہی تھی۔ سوار نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا، کیونکہ بات کو خاص رنگ دینے کا اس کا بھی قطعی ارادہ نہ تھا اور سوری کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ کنعان نے بات کو اسی انداز میں ہی لیا تھا جیسا وہ چاہ رہا تھا۔ دیا کی واپسی اب کسی بھی وقت متوقع تھی وہ بنا مزید کچھ کہے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

خدشات اور وہم پوری طاقت کے ساتھ آپ کے وجود سے لپٹنے لگیں اور دھیرے دھیرے رسیوں کی طرح آپ کو کستے چلے جائیں تو دفاع اور مزاحمت حق بن جایا کرتا ہے۔

شازمہ بھی کچھ دنوں سے ایسی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر تھی۔ وقاص کا کردار۔ پہلے محبوب کا سا تھا۔ اب معمہ اور مسٹری لگنے لگا۔ دھیان ہٹا لو تو سب اچھا...... اور مکمل توجہ کے احاطے میں لو تو ہر نوالے میں کنکر۔ وہ اب سنجیدگی سے اُس کے بیک گراونڈ کے متعلق خود اپنی تحقیق کے بعد یقین کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب تک صرف وقاص سے سنا اور اس پہ یقین کیا تھا۔ ذہن میں بہت سارے آئیڈیاز تھے لیکن عمل کسی ایک پر کرنا تھا وہ بھی ایسے کہ حقیقت بھی کھل جائے اور وہ خود بھی پسِ پردہ رہے۔ دل میں اب بھی یہی گمان خوش فہمی بن کر دھڑک رہا تھا کہ وقاص اُس سے جھوٹ نہیں بول سکتا اور جو نظر آیا اس کی وجہ بڑی معمولی اور بے کار سی ہو گی۔ اتنی بے کار کہ وہ خود ہی اپنے خدشات پر شرمندہ ہو کر ہنس پڑے گی۔

"لیکن......" وہ چلتے چلتے رُکی۔ بنا معلوم کیے تو چین کا حصول بھی ناممکن ہے۔ جی بھر کے خوش ہونے کے لیے بھی یقین دہانی تو ضروری تھی۔ تو پھر...... گھر کے صحن میں اکیلے واک کرتے وہ ممکنات پر غور کرنے لگی۔ وقاص سے صاف پوچھنا تو سراسر بے وقوفی تھی۔ اب تک کا سفر بھی تو اسی پہ یقین کے سہارے بسر کیا تھا۔ وہ یقین جو، اب پل پل متزلزل ہونے لگا تھا۔ نگاہوں میں وہ دو بچے گھومنے لگے۔ کام کی تلاش میں آنے والی عورت کے منہ سے صرف "سُنا" تھا لیکن اب یہ آنکھوں دیکھا۔

چاندنی رات میں یہاں سے وہاں ٹہلتے اب کوئی سایہ لہراتا دکھائی دیتا تھا۔ نہ کسی آہٹ کا خوف وجود میں سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ نہ کھٹکا، ن سرگوشی۔ دُور لیٹی سکینہ نے ڈر خوف اپنی ننھی بانہوں میں سمیٹ لیے تو ایک اس سے بھی بڑا عفریت سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

نہ وہ اس معاملے میں کسی کی مدد لے سکتی تھی ن اتنے نازک معاملات کسی سے شیئر کرنے وا ہوتے ہیں۔ اب تو جو کرنا تھا خود اسی کو کرنا تھا۔ پہل مرحلے میں اسے کسی طرح کارخانے کا پتا اور فیاض بھائی کے گھر کا ایڈریس معلوم کرنا تھا وہ بھی وقاص کے علم میں لائے بغیر...... اور اس کے لیے تو ذہن میں بار بار ایک ہی خیال تقویت پا رہا تھا۔ اب تو اسے وقاص کی آمد کا انتظار تھا۔ یعنی تین د اور......

☆☆☆

دیا اور کنعان جس وقت اکیڈمی میں داخل ہوئیں۔ سبھی کلاس روم میں بیٹھے خوش گپیوں می مصروف تھے۔

"ارے۔ آج تو فرصت ہی فرصت دکھا دے رہی ہے۔" کنعان نے سیما باجی سے مصاف کرتے مسکرا کر باری باری سب کو دیکھا۔

"بالکل۔" سیما باجی نے اسے اپنے قری بیٹھنے کی جگہ دی۔ "میم ناظمہ کے کچھ گیسٹ آ ہیں اور مومنہ میم آج ذرا لیٹ آئیں گی۔"

"او...... تب تو واپسی پر بھی آج ہم لیٹ ہو جائیں گے۔ دیا کو جانے کیوں تشویش ہوئی۔

''نہیں۔ ناظمہ میم کہہ گئی ہیں کہ آج مس مومنہ صرف سوئٹ ڈش بنوائیں گی۔ اور فی الحال مومنہ میم کے آنے تک ہم بالکل فارغ ہیں۔تم لوگ بھی جوائن کرو۔''

''مکھیاں مارنے کی مہم۔'' مہک نے مغربی کونے سے اضافہ کیا۔سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

''اور کیا۔'' عمران نے دہائی دی۔ ''پچھلے پندرہ منٹوں سے یہاں یہی ہو رہا ہے۔''

''پھر تو آپ کو باہر کی ٹھنڈی ہوا کھانے کی اشد ضرورت ہے۔'' شاید دماغ کے تالے کھولنے میں مددگار ثابت ہو۔ کنعان نے ذہن کو تازگی بخشتا مشورہ دیا تو سب سے پہلے عمران نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔

''یس۔ یہ ہوئی نا بات۔'' وہ باقاعدہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو کنعان۔ باقی سب بھی آجائیں گے۔''

''ہاں بھائی۔ اَم بی بار (باہر) جاتا ہے۔ اِدر کِڑکی (کھڑکی) سے دیکو۔ کتنا بادل برا (بھرا) ہے۔ دلیر بھائی بھی ٹوپی سنبھالتے فوراً اُٹھ گئے۔ بشریٰ باجی نے ابرو اُٹھا کر خواتین سے تائید چاہی تو سب ہی حامی بھرتے اُٹھ کھڑے ہوئے، کنعان نے بیگ کرسی پر رکھتے قدرے تشویش سے اب تک کی گفتگو میں بالکل چپ بیٹھے سوار کو دیکھا۔ آخری کرسی پر اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے جو کسی کتاب کے مطالعے میں غرق نظر آیا۔ وہ حیرت دبائی باہر نکل گئی۔

''تم بھی آؤ سوار۔'' آخر میں باہر نکلتی سیما باجی نے مڑ کر سوار کو دیکھا۔

''جی۔'' اُس نے جھٹکے سے کتاب بند کرتے کھڑکی کے پار دیکھا۔ ''آنا ہی پڑے گا۔ بڑبڑا کر جملہ ادا کرتے وہ خود بھی اُٹھ گیا۔ عمران کی شوخیاں کبھی کبھی اس کا بڑا دماغ خراب کرتی تھیں۔ اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر لان میں نکلتے سامنے نظر پڑی تو دماغ کچھ اور سلگ اُٹھا۔ لان میں وہ سب ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے، اور عمران میاں کنعان کے ساتھ براجمان تھے۔

''کیوں بھئی قوالی گانے لگے ہو؟'' اندر کی ناگواری کو اس نے لہجے کی خوش خلقی میں چھپا کر ان کے دائرے پر تنقید کی۔

''قوالی نہیں تو کوئی راگ ملہار ضرور چھیڑ سکتے ہیں۔ شاید ان بادلوں سے بوندیں ٹپکنے لگیں۔'' دیا شوخی سے ہنسی۔

''پھر تو آج ضرور کوئی نیا تان سین دریافت ہونے والا ہے کیونکہ بادل تو آل ریڈی برسنے کو تیار کھڑے ہیں۔'' اُس نے ایک نظر گھرے کالے بادلوں پر ڈالی۔

''تو کون ہے یہاں آواز کا ترنم جگانے والا؟'' ندرت نے سب کو دیکھا۔

''ہم تو بھئی بڑے بے سُرے ہیں۔ معاف رکھو۔'' آنسہ نے ہاتھ جوڑے۔

''پھر بھی کوئی تو ہوگا۔'' سوار نے ایک اچٹتی نگاہ کنعان پر سے ہوتے آگے تک دوڑائی۔ دل کہنے کو خوب مچلا کہ کچھ سُریلے لوگ چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ ''جوگی ہم تو لُٹ گئے تیرے پیار میں۔'' کا مدھر سریلا مصرعہ اس نے دروازے کے پار سے پورا سننے کے بعد ہی رفیق سر کے گھر کی بیل بجائی تھی۔

''اپنی سعدیہ ہے ناں۔'' مریم نے بروقت مطلع کر کے بحث ہی سمیٹ دی۔ کالج میں نعتوں اور ملی نغموں کے کئی مقابلے جیت چکی ہے۔

''یہ ہوئی ناں بات۔'' سوار نے گھوم کر بطور خاص سعدیہ اور انعم کے درمیان آلتی پالتی مار کر جگہ بنائی۔

''تو بھئی سعدیہ خاتون۔ کوئی بھٹکتی ہوئی غزل عنایت فرمائیں۔''

''غزل؟'' سعدیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بڑے ہی باذوق لوگوں میں پھنسی ہیں محترمہ۔'' اس نے کالر اُٹھا کر اطلاع دی۔

''اور یہ بھٹکتی غزل کیا چیز ہے سوار؟'' سیما باجی تب سے ہنسے جا رہی تھیں۔ ''ہم نے تو پھڑکتی غزل سنا تھا۔''

''بھٹکتی غزل وہ جو عین موقع محل کی مناسبت سے اچانک آن وارد ہو۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

"پھر تو غزل بھی آپ کی طرف سے آنی چاہیے سوار۔" پاس بیٹھی انعم نے دھیمے سے فرمائش کی۔

کنعان منہ ہی منہ میں کچھ نامناسب بول کر رہ گئی۔

سوار نے مشورہ طلب قسم کی کھسر پھسر سعدیہ کے ساتھ شروع کر دی۔ کبھی سر نفی میں ہلتے، کبھی نیم رضامندی اور فائنل ڈسکشن کے نتیجے میں جانے کیا طے پایا کہ سوار نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا پیپر اور پین نکال کر کچھ لکھنا شروع کیا۔ سعدیہ ساتھ ساتھ ریڈ کرتے اثبات میں سر ہلاتی جا رہی تھی۔ غالباً مصرعے لکھوائے جا رہے تھے جو صاف لگتا تھا کہ سوار کو ازبر ہیں۔ دو ہی منٹ میں پیپر اس نے سعدیہ کی طرف بڑھایا۔ سعدیہ نے پیپر سامنے رکھ کر گلا کھنکارا۔

بہار آئی......
تو جیسے یک بار لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے،
جو مٹ کے ہر بار پھر جیے تھے
نکھر گئے ہیں
گلاب سارے،
جو تیری یادوں سے مشک بو ہے
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
بہار آئی۔۔۔
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے،
ملال احوال دوستاں بھی،
خمار آغوش مہوشاں بھی،
غبار خاطر کے باب سارے۔
تیرے ہمارے سوال سارے جواب سارے
بہار آئی......
تو کھل گئے ہیں نئے سرے سے حساب سارے
نئے سرے سے نصاب سارے
بہار آئی...... بہار آئی......

سوار الفاظ اور آواز میں گم، اچانک ہی بہت اُداس بہت غیر حاضر سا لگنے لگا تھا۔ کنعان نے اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرتا محسوس کیا جانے اور بھی کسی نے دیکھا کہ نہیں۔ اس نے بہت جلدی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ کانوں میں سوار کے الفاظ گونجنے لگے۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔" کنعان کا دل اس کے لیے درد سے بھر گیا۔

"بھئی واہ۔ بہت خوب۔" ٹینا ثانی کی اس خوب صورت غزل سے شاید سبھی وہاں واقف تھے۔ سعدیہ نے بھی سُر تال خوب اونچے اٹھا کر حق ادا کیا تھا۔

"سعدیہ کی آواز تو ہے لاجواب۔" سوار کے نفیس ذوق کی بھی داد دینی پڑے گی۔ بشریٰ باجی نے دونوں کو باری باری دیکھا۔ تبھی اچانک ہی بادل برس پڑے۔ عجلت میں محفل برخاست ہوئی۔ ہنستے کھلکھلاتے بھاگ کر سبھی برآمدے میں آئے۔

"مان گئے تمہیں تان سین کی سسٹر۔" کنعان تیز بھاگ کر آئی تھی۔ اب ایک ہاتھ سے ستون کو تھامے دوسرا کمر پہ رکھے ہنسے جا رہی تھی۔

آج ایک بار پھر وہ سرخ ڈریس میں تھی۔ دو چھوٹی چٹیوں اور ماتھے پر گرے ہلکے بھیگے بالوں کے ساتھ وہ کسی اسکول گرل جیسی معصوم و حسین لگ رہی تھی۔ اس کے بے فکرے مست انداز میں آس پاس سے بالکل بے دھیانی جھلک رہی تھی۔ لیکن سوار نہ بے دھیان تھا نہ اس سے غافل۔ وہ بے خیالی میں پھر عمران کے نزدیک کھڑی تھی۔ برآمدے میں سبھی بے ترتیبی سے یہاں وہاں پھیلے تھے۔ سوار کی بھرپور توجہ اور دھیان کا محور بھلے سے وہ ہی تھی لیکن کھڑا وہ اس سے کچھ دُور تھا۔ عمران نے خود کو کنعان کے نزدیک پایا تو غیر محسوس انداز میں دو قدم مزید قریب ہوا۔ کنعان پہلی مرتبہ کسی انہونی کے احساس سے بائیں مڑی اور جب تک عمران کی قربت اور نظروں کا مفہوم اس کی سمجھ میں آتا۔ کوئی بالکل ہی اچانک اُن دونوں کے درمیان آیا اور بازو سے پکڑ کر عمران کو دُور کھینچا۔ سوار کے مضبوط ہاتھوں میں عمران کی کلائی تھی۔ کنعان کا سانس رُکا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

عنبرین ابدال

اُف یہ موسم

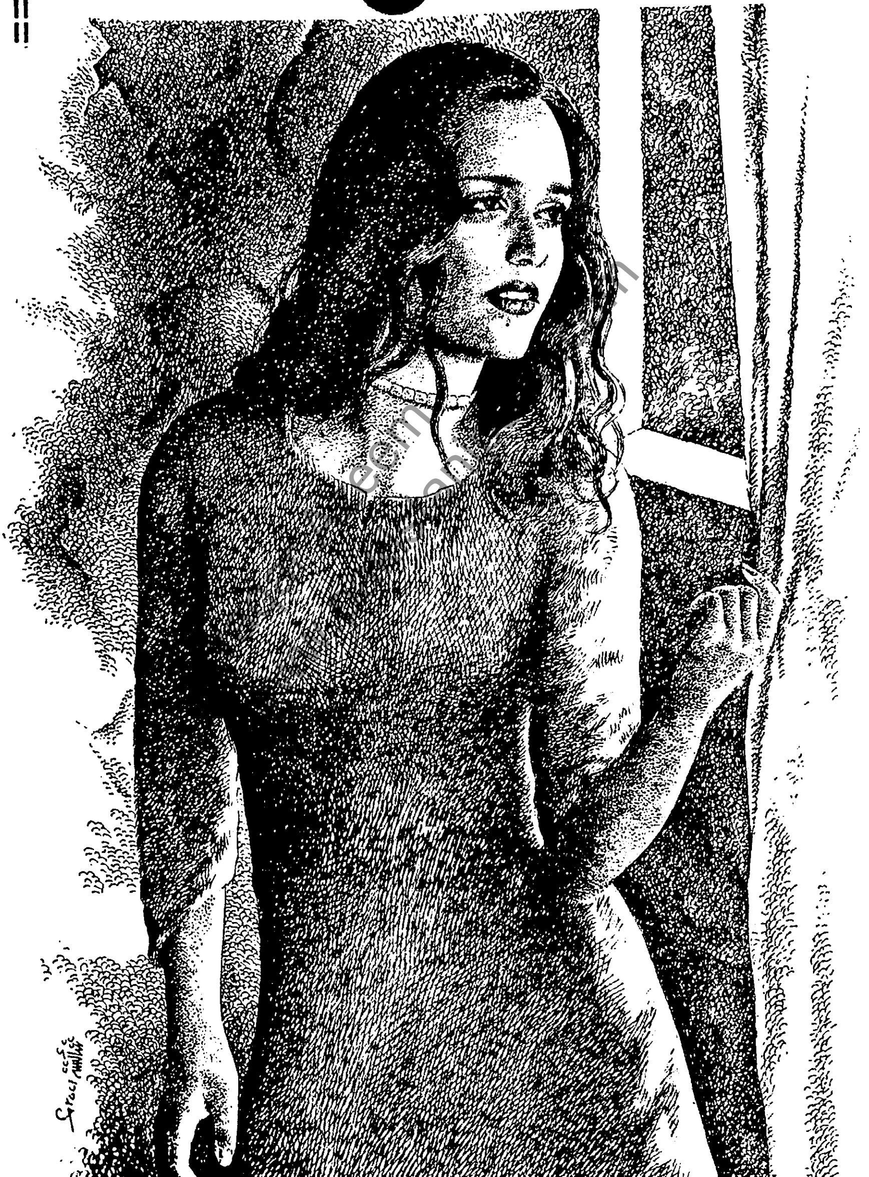

"عفان۔ آپ عالی کو سمجھا لیجیے اس کی شادی ہوگی تو صرف اور صرف سیمی سے۔ اس میں کیا برائی ہے؟ جو یہ اس کا نام سنتے ہی بدک جاتا ہے۔ خوب صورت ہے پڑھی لکھی ہے۔ اور سب سے بڑی بات گھر کی لڑکی ہے۔"

فائزہ نے غصے سے عفان کو سیماب کا بائیو ڈیٹا یوں بتایا جیسے وہ اسے جانتا ہی نہیں تھا۔

عفان نے سوالیہ نظروں سے عالیان حیدر کی طرف دیکھا۔

"پاپا میں اپنی کلاس فیلو سے......" عالی نے ڈرتے ڈرتے کچھ بتانا چاہا۔

"خبردار...... جو کسی غیر لڑکی کا نام لیا تو ورنہ......" فائزہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"ارے بابا اس کی بات تو سن لینے دو۔" اس کے بعد ہی کچھ کہنا۔ عفان نے فائزہ سے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں کسی صورت بھی کسی غیر لڑکی کا نام نہیں سنوں گی۔" فائزہ نے کہا۔ تو عالی پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے ہی نہیں۔ گھر سے ہی باہر نکل گیا۔

عالی کے انداز کو عفان نے چونک کر دیکھا۔ اور کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگا۔

"عفان۔" فائزہ نے سرزنش نظروں سے عفان کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی مسکراہٹ پر چڑ سی گئی تھی۔ اور غصے میں واک آؤٹ کر گئی۔

عفان کے چہرے پر مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ ماضی اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ جب وہ خود عالی کی عمر کا تھا۔

☆☆☆

عفان فائل پر سر جھکائے آفس کے کام میں مصروف تھا کہ شگفتہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔

"عفان......" تھوڑی دیر کے بعد شگفتہ بیگم کی آواز پر اس نے فائل سے سر اٹھایا۔ اور استفہامیہ نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"تمہاری دادی تمہاری شادی نعیمہ سے کروانا چاہتی ہیں۔" انہوں نے بڑی پھوپھو کی بیٹی کا نام لیا۔

"تو......" عفان نے نہ سمجھنے کے سے انداز سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ "اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟" اور نہ جانے کیسے یہ جملہ اس کے ہونٹوں سے نکل کر ماں کے کانوں میں گھس گیا۔

"کیا یہ پریشان ہونے والی بات نہیں؟" شگفتہ بیگم نے غصہ سے اسے دیکھا۔ "ساری عمر ان لوگوں کی چاکری کی اب جا کر ذرا سا سکون نصیب ہوا ہے۔ تو وہ بھی ان لوگوں کو چبھنے لگا ہے۔ میں پاگل تھوڑی ہوں اپنے لائق فائق اکلوتے بچے کے لیے وہ سڑی مرچ اٹھا لاؤں۔ میں تو شجاعت بھائی سے بات کروں گی انم کے رشتے کے لیے...... تمہیں منظور ہے نا۔" شگفتہ بیگم نے بات کرتے کرتے عفان سے سوال کیا تو وہ یک دم گڑبڑا گیا۔

"وہ میں......" عفان اٹکا۔

"دیکھو عفان...... میری بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے نعیمہ کے لیے ہاں کی نا تو یاد رکھنا اسی دن میرا مرا منہ دیکھو گے۔" شگفتہ بیگم نے باقاعدہ انگلی اٹھا کر عفان کو دھمکی دی۔

"فار گاڈ سیک امی۔ آپ بھی جذبات میں آ کر نہ جانے کیا کیا دھمکیاں دینے لگ جاتی ہیں۔" عفان اٹھ کر شگفتہ بیگم کے پاس صوفے پر بیٹھا۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تو تم انم کے لیے راضی ہو؟" شگفتہ بیگم نے خوشی سے عفان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"امی ابھی میں اور......" عفان نے کوئی بہانہ گھڑنا چاہا۔ لیکن شاید شگفتہ بیگم نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔ تم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے اور میں خود بھی ابھی یہی چاہتی ہوں کہ تم اچھی طرح سے سیٹ ہو جاؤ اور ویسے بھی میں سب کو خاص طور پر تمہاری دادی اور پھوپھو کو اچھی طرح جلا کر پھر تمہاری دلہن لے کر آؤں گی۔ اللہ تمہاری زندگی دراز کرے۔" شگفتہ بیگم نے محبت سے کہہ کر عفان کی پیشانی چوم لی۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

عفان ہکا بکا انہیں کچن کی طرف جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر گہرا سانس لے کر گود میں دھری فائل بند کر کے صوفے کی بیک پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

"برخوردار بات سنو۔"

اگلے دن سنڈے ہونے کی وجہ سے عفان ذرا لیٹ ہی اٹھا تھا۔ وہ ماں کو ناشتے کا کہہ کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ جہاں صفدر بیگ اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ عفان کو دیکھ کر انہوں نے اخبار ایک طرف رکھا اور اسے مخاطب کیا۔

"جی بابا۔" عفان نے تابعداری سے کہہ کر ان کی سمت دیکھا۔

"میں اور تمہاری دادی، تمہاری شادی نعیمہ سے کروانا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ میں کل اماں کے ساتھ جا کر امینہ سے بات کرلوں گا۔ نعیمہ کے سلسلے میں...... ٹھیک ہے۔"

صفدر بیگ نے تائیدی نظروں سے عفان کی طرف دیکھا۔

"یا خدا! کل امی ...... آج بابا۔ خدا کے لیے شادی مجھے ایک ہی کرنی ہے۔ دو نہیں۔" عفان دل میں کراہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ شگفتہ بیگم کچن سے باہر نکلیں اور ٹرے عفان کے سامنے میز پر پٹختے شوہر نامدار کی طرف مڑیں۔

"میری بات سنیں جی۔ میں نے عفان سے کل ہی بات کرلی ہے، وہ نعیمہ سے نہیں بلکہ انم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" شگفتہ بیگم نے مبالغہ آرائی کی حد کردی۔

"میں نے کب کہا؟" عفان سٹپٹا کر رہ گیا اور حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہاں تو بات ہوئی ہے شادی تو نہیں نہ ہوئی۔ شادی تو عفان کی نعیمہ سے ہی ہوگی۔" صفدر بیگ نے لاپروائی سے کہا۔

"میری بات سن لیں۔ جتنا بھی ہنگامہ برپا کر لیں۔ عفان کی شادی ہوگی تو صرف اور صرف انم سے۔" شگفتہ بیگم کے لہجے میں ضد تھی۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے عفان۔ اگر تمہاری شادی نعیمہ سے نا ہوئی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

صفدر بیگ نے انگلی اٹھا کر عفان کو دھمکی دی اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"تمہیں ذرا بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلے جائیں ویسے بھی یہ دھمکی اور بلیک میلنگ ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔" شگفتہ بیگم نے عفان کے کندھے پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"امی آپ اور ابو مل کر فیصلہ نہیں کر سکتے۔" عفان بے چارگی سے کہا۔

"میں نے بیٹا، تمہارے بابا کو بہت منایا ہے۔ مگر بہن کی محبت نے جیسے انہیں اندھا کردیا ہے۔ اگر انہیں اپنی بہن سے اتنی محبت ہے۔ تو مجھے بھی اپنی بھائی سے بہت محبت ہے۔ لیکن تم وہی یاد رکھنا جو میں نے تمہیں کہا تھا اگر تم نے میری بات نہ مانی۔ تم میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔" شگفتہ بیگم نے بات کرتے کرتے آبدیدہ ہوگئیں۔

عفان غصے سے اٹھا اور گھر سے ہی نکل گیا۔

☆☆☆

"ارے یار تم؟" عمران عفان کو دیکھ کر حیران ہوا۔ کیونکہ وہ سنڈے کو گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔

عفان منہ بناتا اس کے کمرے میں آ گیا۔

وہ اور عمران بچپن کے دوست تھے۔ اس کے لیے اس کے گھر آنے جانے میں عفان کو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں میں بیٹھتے ہوئے ساری بات عمران کے گوش گزار کی۔

عفان کی بات سن کر عمران زور سے ہنسنے لگا۔

"یار تو بہت ہی لکی ہے۔" عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

"اس میں کیا میری خوش قسمتی ہے۔ یہاں میں سخت پریشان ہوں۔ اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ امی اور بابا کا پتا ہے نا تمہیں۔ وہ دونوں ہی ضد کے پکے ہیں۔ بیچ میں پھنس تو میں گیا ہوں۔ ایک کی بات مانوں گا تو دوسرا ناراض...... دوسرے کی مانو تو پہلا ناراض...... میں کیا کرو یار؟" عفان نے اپنے سر کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے عمران کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"یار اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے دونوں کی چار دن کی ضد ہے۔ خود ہی ہٹ جائیں گے۔ ورنہ یوں کرنا کسی تیسری لڑکی کو لے جا کر کہہ دینا یہ رہی آپ کی بہو اور میری دلہن۔"

عمران نے اتنے اسٹائل سے کہا کہ عفان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اور جھٹ سے ایک سراپا اس کی نظروں کے سامنے آٹھہرا۔

ایک پیاری معصوم سی لڑکی اسے اچھی تو لگتی تھی پر اس نے کبھی اظہار کی کوشش ہی نہیں کی۔ ویسے اسے لگتا تھا جیسے وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر دھیرے دھیرے ہنسنا۔ اور اگر کسی دن ان کے گھر نہ جاؤں۔ تو شرما کر نہ آنے کا سبب پوچھنا۔

عفان کا دل چاہا جلدی سے اس لڑکی کا نام لے دے۔ مگر کیا کرتا اس کی پسند کے ساتھ اس کی دوستی کا بھی تو سوال تھا۔ کیونکہ وہ عمران کی بہن کو پسند کرتا تھا۔ مگر دوستی ٹوٹ جانے کے ڈر کی وجہ سے کبھی کہہ نہیں پایا۔

اس نے سوچا تھا کہ سیدھی طرح اپنے والدین کو فائزہ کا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیجے گا۔ مگر اس سے پہلے ہی بیچ میں نعیمہ اور رانم کی انٹری ہو چکی تھی اور اب تو شگفتہ بیگم اور صفدر بیگ میں سے کوئی بھی اس کی بات سننے کے لیے راضی نہیں تھا۔

اس نے سر جھٹک کر گہرا سانس لے کر اپنے اندر کی گھٹن کو باہر نکالا اور خود کو ریلیکس کیا اور عمران کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔

☆☆☆

عفان کو لگا تھا چند ہی دنوں میں دونوں میں ضد ختم ہو جائے گی اور سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر بات کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

شگفتہ اور صفدر بیگ دونوں ہی اپنی ضد سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے راضی نہیں تھے۔ اور یہ ضد کب اتنی کشیدگی بنی کہ عفان چکرا کر رہ گیا۔

شگفتہ بیگم اور صفدر بیگ ایک دوسرے سے اتنا ناراض تھے کہ کمرے بھی الگ الگ کر لیے تھے۔ صفدر بیگ اپنے کام خود کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ کبھی کپڑے پریس کر رہے ہیں تو کبھی کھانا گرم۔

عفان شرمندہ ہوتا پھر رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

سنڈے کو شگفتہ بیگم نے اپنی فیملی اور صفدر بیگ نے اپنی فیملی کو گھر میں انوائٹ کر لیا تھا۔ یعنی ایک بڑے معرکے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ دونوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک بڑا معرکہ ہو ہی جائے۔ تا کہ ایک ہی بار اس ٹینشن سے نجات حاصل ہو جائے۔

اور اس سے پہلے کچھ نہ کچھ عفان کو ہی کرنا تھا۔

دل کڑا کر عمران سے اس کی بہن کی بات کی۔

پہلے تو عمران نے غصے بھری ناراضی سے عفان کو دیکھا۔

اور پھر پانی کا ایک گلاس پی کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کیا۔

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" عمران نے عفان سے استفسار کیا۔

"عمران۔ میں فائزہ کو صرف میں پسند کرتا ہوں۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔ میں سیدھے طریقے سے بابا اور امی کو بھیج کر بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ دونوں میری بات سننا ہی نہیں چاہتے۔" اس نے بے چینی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

عمران جانتا تھا عفان نے کبھی کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے۔ سو تھوڑی دیر کے بعد وہ راضی ہو گیا اور اس کے بعد کا مرحلہ عمران کی امی کو راضی کرنا تھا اور خود فائزہ کو بھی۔

خیر جیسے تیسے یہ مرحلہ بھی طے ہو ہی گیا۔ اور جس وقت عفان فائزہ کے ساتھ نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے کر آیا تو ہلکے ہلکے سرمئی بادلوں نے آسمان پر ڈیرہ ڈالا ہوا تھا اور دھیمی دھیمی چلتی ہوا نے ان کا استقبال کیا۔

سب لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ اور زور و شور سے لڑائی نما بحث جاری تھی۔

"السلام علیکم!"

عفان کے سلام کرنے پر سب نے مل کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی فائزہ کو کھڑا دیکھ کر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔

''یہ کون ہے؟'' سب سے پہلے پھوپھو نے کھڑے ہوتے ہوئے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ عفان کوئی جواب دیتا۔ شگفتہ بیگم کھڑی ہوئیں۔

''ارے فائزہ تم آؤ نا وہاں کیوں کھڑی ہو۔'' شگفتہ بیگم فائزہ کو جانتی تھی۔ تبھی آگے بڑھیں۔ مگر اس سے پہلے ہی عفان بول اٹھا۔

''یہ فائزہ ہے۔ میری بیوی۔'' عفان نے گھبرائی ہوئی فائزہ کا ہاتھ پکڑ کر بلند آواز میں کہا تو شگفتہ بیگم تو اپنی جگہ ساکت ہی کھڑی رہ گئیں اور باقی سب حیرت سے گنگ ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عفان کے پیچھے چھپی فائزہ کو دیکھنے لگے۔

''میں آپ کو فائزہ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا بابا امی۔ لیکن آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا اور فضول کی لڑائی شروع کر دی۔ مجھے نہ انم سے اور نہ ہی نعیمہ سے شادی کرنی تھی۔ مجھے صرف فائزہ سے شادی کرنی تھی۔'' عفان نے کہا۔ تو پھوپھو، دادی ماموں اور ممانی غصے سے فوراً ہی واک آؤٹ کر گئے۔

اب لاؤنج میں شگفتہ بیگم، صفدر بیگ، عفان اور فائزہ ہی رہ گئے تھے۔

''سوری بابا۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔'' عفان نے ان سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ مگر وہ دونوں خاموشی سے فائزہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد صفدر بیگ اٹھے اور فائزہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شگفتہ بیگم بھی عفان کو گھورتے ہوئے فائزہ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''یہ بہت نالائق ہے۔ سیدھی طرح ہمیں کہہ دیتا۔ یہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت کیا تھی؟'' شگفتہ بیگم نے فائزہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

عفان کھل کر مسکرا دیا۔

وہ دونوں صرف ایک دوسرے کی ضد میں انم اور نعیمہ کو میرے سر پر ڈالنا چاہتے تھے۔ شکر ہے میں بچ گیا۔ عفان نے دل میں سوچا۔ اور فائزہ کی طرف دیکھا۔

فائزہ نے ڈرتے ڈرتے صفدر اور شگفتہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ انہیں مسکراتا دیکھ کر۔ فائزہ نے بھی اپنی اٹکی ہوئی سانس سینے سے باہر نکالی۔

فائزہ تھی ہی بہت پیاری اور من موہنی سی کہ شگفتہ اور صفدر بیگ نے عفان کی غلطی کو معاف کر دیا۔ انہوں نے سب کو راضی کیا۔ پھوپھو، دادی، ماموں، ممانی سبھی عفان کی شادی میں خوشی خوشی شریک ہوئے۔ اور یوں وہ سب چند ماہ کے بعد ہی فائزہ کو دھوم دھام سے بیاہ کر اپنے گھر لے آئے تھے۔

☆☆☆

فائزہ کچن میں کام کر رہی تھی۔ عفان نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور فائزہ کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔

''فائزہ۔ یہ نہ ہو عالیان بھی شادی کر کے گھر آ جائے۔'' عفان نے اپنے لہجے میں لاپروائی سمو کر کہا۔ اور فریج میں سے پانی کی بوتل نکال لی۔

عفان کی بات سن کر فائزہ تھوڑا سا سٹپٹائی۔

''ایک بار سکون سے اس کی بات سن تو لو۔ ہو سکتا ہے۔ لڑکی واقعی میں اچھی ہو اور اگر تمہیں اچھی نہیں لگی تو پیار سے سمجھا دیں گے ورنہ دیکھ لو موسم بھی آج ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہر طرف سرمئی بدل آسمان پر گھومتے پھر رہے ہیں اور ساتھ میں ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے۔''

عفان نے فائزہ کو ڈرایا۔

''عفان۔ پلیز ......بس بھی کیجیے۔'' فائزہ کہہ کر جھٹ سے عالی کو فون کرنے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے جو وہ لڑکی کہہ رہا ہے میں دیکھتی ہوں۔ لیکن لڑکی اگر اچھی ہو گی تبھی عالی کی دلہن بنے گی۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں۔'' فائزہ نے انگلی اٹھا کر عفان کی طرف دیکھ کر کہا۔ عفان نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

فائزہ نے چند لمحے خشمگیں نظروں سے عفان کی سمت دیکھا اور پھر خود بھی مسکرا دی۔

☆☆

ناولٹ

مصباح علی سیّد

کانچ سے سائباں

وقت اتنا بھی زیادہ نہیں ہوا تھا جس تیزی سے اندھیرا اپھیل چکا تھا، باقی سب کا تو خیر رکنے کا ارادہ تھا مگر مما تو کہہ رہی تھیں وہ ہر صورت ماموں کے ساتھ واپس آجائیں گی، اس نے انہیں جاتے جاتے بھی کئی بار یاد کروایا تھا۔

”پلیز آپ جلد آجانا......پلیز، پلیز مما!“

”کہا تو ہے آجاؤں گی......اور ویسے بھی اب تم بچی نہیں رہیں، اپنے گھر سے کون ڈرتا ہے بھلا۔“

اس نے بے یقین سی نگاہ اٹھا کر مما کو دیکھا۔

کمال ہے یہ وہ ہی کہہ رہی ہیں...... اپنا گھر......کون سا گھر، لڑکی کا گھر۔ اچھا، ابھی تک مما کا کوئی گھر نہیں بنا تھا، اس کا کہاں سے بن جاتا، لیکن وہ گھر میں رہ رہی تھی۔

ہاں اس کا گھر، جس میں اب مغرب کا بعد ہو چکا تھا لیکن ابھی تک کسی کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے، گھنٹے ڈیڑھ کا ہی فاصلہ تھا اب تک تو انہیں آجانا چاہیے تھا، دو بار مما کے نمبر پر کال کر چکی تھی مگر سگنل نہ ہونے کے سبب رابطہ ممکن ہی نہیں ہو رہا تھا، نانو دوا کھائے ایسی بے فکری کی نیند سوئیں جیسے اس سے بہترین دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔

رات کے اترتے سناٹے میں اسے عجیب سی وحشت اور تنہائی کا احساس بڑھنے لگا، دیواروں پر ابھرتے سائے اس کے اندر کے خوف کو ہوا دے رہے تھے، خود اپنے لیے پھیکا سا مسکرا کر وہ اندر کے خوف کو سہلانے لگی، کچھ دن سے اس کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا، وہ پروگرام تو روٹین کی طرح چینل سرچنگ میں لگ گیا تھا، نانو کو ویسے ہی اس طرح کے مذہبی پروگرام پسند تھے، انہوں نے چینل آگے کرنے ہی نہیں دیا، ساتھ دینے کو نا چاہتے ہوئے بھی اسے پاس بیٹھنا ہی پڑا، اور پھر جیسے جیسے وہ سنتی رہی آنکھیں تو اسکرین پر ٹھہری ہی تھیں، سانس بھی اندر ہی کہیں تھم گئی تھی، سوچیں کہیں دور کلبلانے لگیں۔

”کیا واقعی ایسا ہے۔“

اس نے ٹرانس کی صورت نانو کو دیکھا، ان کا ماتھا بلوں سے بھر گیا، ناگواری سے رخ دوسری جانب پھیر لیا ”بتائیں ناں، نانو......“

وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے قدموں میں ج بیٹھی۔

”مجھے نہیں پتا، میں بڑی عالم فاضل ہوں؟“

نانو کے یوں بیزاری سے اٹھ جانے پر اس کی حیرت سوا تھی، دن رات تو لیکچر دیتی تھیں۔

”ایسے رہا کرو، ایسے بیٹھا اٹھا کرو، اچھی لڑکیاں کیسے بولتی ہیں، کھاتی پیتی سوتی جاگتی ہیں لڑکیوں کے کہیں آنے جانے، اٹھنے بیٹھنے، میل ملاپ کے سارے قاعدے قانون نانو کو ازبر تھے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے اس بات کی تحقیق نہ کی گئی ہو۔

وہ تنگ آگئی تھی، ان کی آئیڈیل اچھی لڑکی سن سن کر، اور اگر بس چلتا وہ تمام ایسی لڑکیوں کو ایک جیل میں بند کر دیتی جن کی وجہ سے اس پر سانس کی بھی پابندی عائد رہتی تھی، اور اب جب وہ خود ا سے کچھ پوچھ رہی تھی تو کیسے اٹھ کر سونے کے چلتی بنیں، وہ ان کے پیچھے پیچھے آئی۔

Waqar Azeem
www.paksitanipoint.com

"مجھے پوری بات شروع سے بتائیں آخر ہوا کیا تھا، کیوں چھپاتی ہیں مجھ سے۔"

"کیا بتاؤں...... مجھے نہیں یاد۔"

"نانو۔ انسان سب بھول جاتا ہے لیکن جو حادثات زندگی کے رخ پلٹتے ہوں، وہ کبھی نہیں بھولتا، یاد تو آپ کو ہوگا آپ جان کر نہیں بتاتیں۔" وہ آج اگلوا لینا چاہتی تھی۔

"مجھے تنگ نہ کر، اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں، پرانی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔"

"خیر۔ آپ اتنی بھی بوڑھی نہیں ہوئیں، ویسے بھی تحقیق کہتی ہے بڑھاپے میں انسان کل کی بات تو بھول سکتا ہے لیکن برسوں پرانی بات اس کی میموری میں فکس رہتی ہے، اس لیے بہانے مت بنائیں، بتائیں مجھے۔"

"تمہاری ماں آئے گی تو اس سے ہی پوچھ لینا، اسے یاد ہوگا، کیا، کیوں اور کیسے ہوا تھا۔"

"وہ بتاتیں تو آپ سے پوچھتی......؟" اس

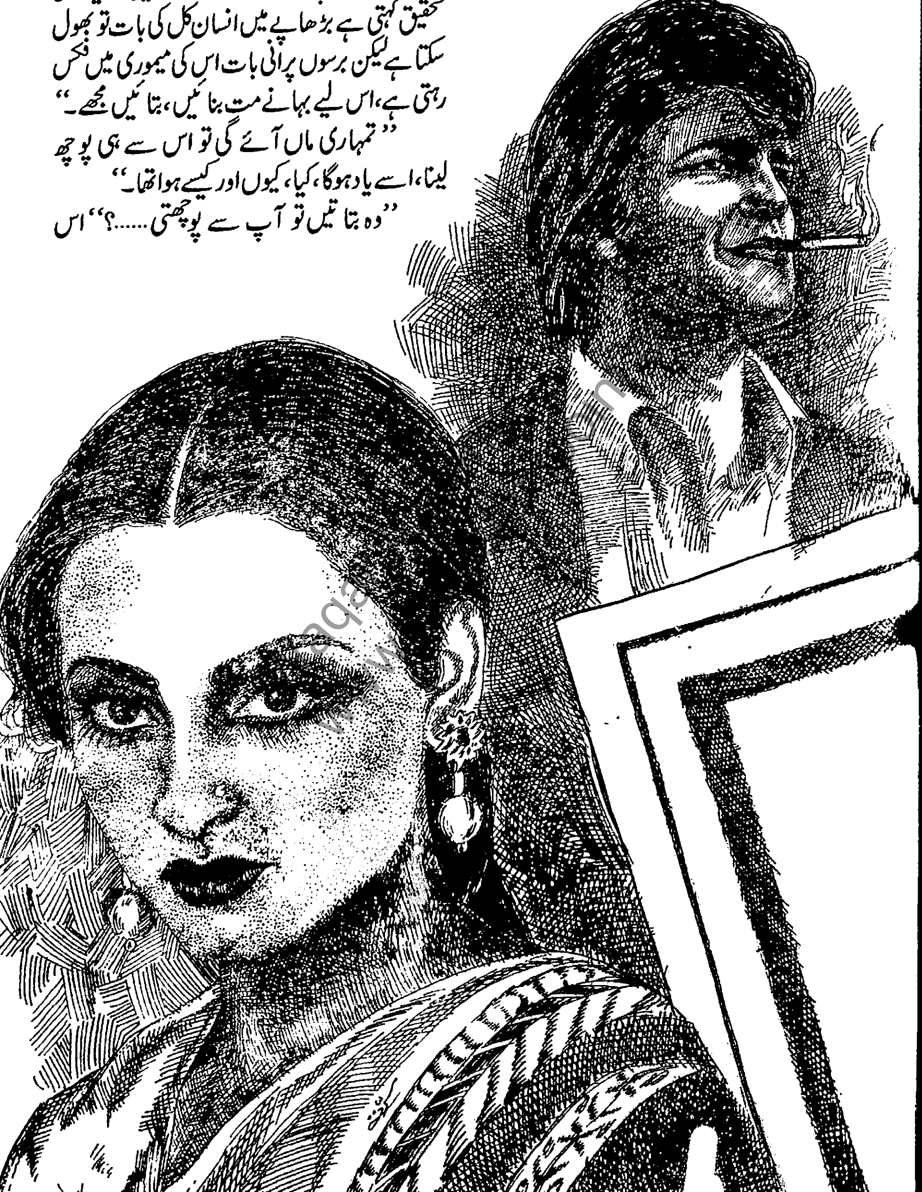

کے انداز میں خفگی امڈ آئی نانو کا ناگواری لیے ماتھا دوسری جانب ہوگیا۔

”ٹھیک ہے نا بتائیں۔ میں بھی ایک ایک سے پوچھوں گی، مسجد میں اعلان کروادوں گی۔ اہل محلہ نے کوئی تو جانتا ہوگا۔“

”کیوں گڑھے مردے اکھیڑنا چاہ رہی ہے، سوائے دھول مٹی کے کچھ بھی نہیں نکلنے والا۔“

”نہیں نانو، اب ایسا بھی نہیں۔ کچھ نہ کچھ بقایا جات نکل ہی آتے ہیں، بس وقت کی دھول مٹی کو اڑانے سے ہم ڈرتے ہیں، کہیں نتھنوں میں گھس کر سانس دشوار نہ بنائے۔“

”پھر سانس کو کیوں دشوار بنانا چاہ رہی ہو، جو وقت کی گرد میں دب گیا، سو دب گیا۔“

نانو کے چہرے پر ہی نہیں انداز میں بھی چبھن تھی، وہ مزید کرید کر انہیں ماضی کی ٹیس دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر دل میں ٹھان سی لی تھی، اگر ایسا ہے تو ہے پھر میں چپ کیوں بیٹھوں، جہاں تک تحقیق کرسکتی ہوں وہ تو حق سمجھ کر کروں گی۔

نانو کو سوتا بنتا دیکھ کر وہ اٹھ گئی اور اسی وقت وہ اپنے بہت سے ممکنہ رابطے استعمال میں لائی تھی۔ نیٹ پر بہت کچھ تھا لیکن یہ کیسے پتا چلے یہ سب صحیح ہے اس نے مستند لوگوں سے خود رابطہ کیا تھا۔ بہت سے ایسے گروپ جوائن کر لیے تھے جہاں کمینٹ سے ہی معلومات مل رہی تھیں، اور آگہی دماغ پر روز نیا ہتھوڑا بن کر پڑتی۔ روز ملنے والی معلومات اگر ماں سے شیئر کرتی تو عین ممکن ہے وہی ہتھوڑے اس کے سر پر ٹھاہ ٹھاہ برستے۔ ایک ذیاج ہی پوری دنیا میں ایسا تھا جس سے وہ کچھ بھی کبھی بھی شیئر کرسکتی تھی۔ ایک ہمدرد، ایک غم خوار، جو شکل دیکھ کر ہی دل کا حال پڑھ لیا کرتا تھا۔ کتنی دیر اس کی پوری تفصیل سنتا رہا۔

”لیکن اب کیا ہوسکتا ہے...... وقت بہت بیت گیا، یار۔ کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں خود کو الجھاتی ہو۔“

”چلتی سانسوں کا نام وقت ہے زیاج...... اور ابھی دونوں کی سانسیں چل رہی ہیں۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو وقت بیت گیا۔ وقت تو ابھی چل رہا ہے۔“

وہ چاہتی تھی بس کوئی چراغ رگڑ کر اس مسئلہ کا بہتر سلوشن نکال دے، یا پھر چھڑی گھومے اور وقت کی سوئیاں یک دم بہت پیچھے ہوجائیں، جہاں سب ٹھیک ہو، جہاں سب ٹھیک تھا۔ لیکن ذیاج اسے سمجھا رہا تھا۔

”بعض اوقات چلتی سانسوں والے جسم کو ہم لاش تصور کر لیتے ہیں، اور لاشوں پر صرف ماتم اور بین ہوتے ہیں ڈیئر۔ مت تکلیف دو ان لاشوں کو، چلتی رہنے دو ان کی بچی سانسیں۔“

”میرا دکھ کوئی نہیں سمجھ رہا ذیاج، تم بھی نہیں، جسٹ ایمیجین، جو رشتے تعلق میرے ساتھ ہیں میں انہی کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ میں اجنبی چہروں کی اس دنیا میں اپنے ہی چہرے ڈھونڈتی رہی۔ پلیز۔ سمجھنے کی کوشش کرو، میری بات سمجھو۔“

”اچھا بولو، میں سن رہا ہوں۔“

دلفریب سے لہجے میں کہہ کر ذیاج کا یوں ہتھیار پھینک دینا ”بولو، سن رہا ہوں“ اسے آج بھی یاد تھا۔ ذیاج کے اُسی ادائے بے نیازی میں وہ جب پہلی بار بھی آگئی تھی۔

☆☆☆

سفید ہائی ایس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور سب بچے اس سے باری باری اترنے لگے، امان نے اُسے دیکھتے ہوئے نخوت بھری شکل بنائی اور ذیاج کو کہا تھا۔

”قسم سے یار اس لڑکی نے آج پکا دیا۔“

اپنے بارے میں ایسا جملہ آسانی سے اسے بھی ہضم ہونے والا نہیں تھا۔ وہ باقاعدہ لڑنے والے انداز میں اُسے نظروں سے تولتے ہوئے قریب ہوئی۔

”کیا کہا پکا دیا، خیر سے جس طرح سے تم بے ڈھنگے بڑے ہوئے ہو، کسی برتن میں آسانی سے آ نہیں سکتے کہ تمہیں کوئی پکا سکے۔“

لڑکی کے ہاتھوں ہونے والی اس عزت افزائی پر ذیاج منہ بھینچے مبہم سے انداز میں ہنس رہا تھا، جس پر امان تلملا گیا۔

‘‘بڑی ہنسی چھوٹ رہی ہے۔ بتاؤ انہیں، پکانا کسے کہتے ہیں...... میڈم دماغ پلپلا ہوگیا۔ پیں پیں بج رہا ہے جیسے خالی پیپا سحری میں اٹھانے والے کے ہاتھ آگیا ہو۔’’

وہ ناک چڑھائے اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ پلے نہ پڑا ہو۔ امان نے مزید وضاحت دی۔

‘‘بی بی۔ آپ کا اجازت نامہ سن کر مجھے اب تک ازبر ہوچکا ہے۔’’ امان اسے دیکھتے ہوئے کسی کورس کی کتاب کی طرح سنانے لگا تھا ‘‘بڑی ممانی کو جیسے ہی پتا چلا یونی کا ٹرپ جارہا ہے، تو ماموں کے سامنے اخراجات کی لمبی لسٹ رکھ دی، اور بجٹ کی طرح شروع ہوئیں، جس کے سبب ماموں تو فضول خرچی کی اجازت دینے سے رہے، سونانو کی منتیں کی گئیں، بس پاؤں پکڑنے، ناک کی لکیریں کھینچنے کی کمی تھی۔ جب اِدھر سے بھی آسرا نہ ہوا تو اماں کو ایموشنلی بلیک میل کیا۔ اگر آج ابا یہاں ہوتے تو کوئی مجھے ٹرپ میں جانے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بس اماں کا دل پسیجا اور آپ کو ٹرپ پر آنے کی اجازت بمعہ اچھی خاصی رقم دے دی......’’

‘‘سارے راستے یہی کہانی سناتی آئی ہیں ناں آپ۔’’

امان کے انداز اور جملوں پر اس کی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں جو کم از کم ذیاج کو اس وقت بہت بھلی لگ رہی تھیں، امان نے تائیداً اس کی جانب دیکھا۔

‘‘بتایئے۔ داستان امیر حمزہ۔ جو آپ پورے راستے اپنی سہیلی کو سناتی آئی ہیں، اس میں کچھ غلط کہا میں نے۔ کوئی مبالغہ آرائی ہوئی ہو تو بندہ حاضر ہے۔’’

وہ تحیر سے اسے دیکھ رہی تھی غصے سے ناک پھولنے پچکنے لگی اور ذیاج کو دیکھ کر کچکچائی۔

‘‘مجھے اندازہ نہیں تھا، آپ کے دوست میں اتنی زنانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، سفر کو انجوائے کرنے کے بجائے اپنے کان لڑکیوں کی باتوں میں لگا رکھے ہیں۔’’

‘‘محترمہ! مجھے کان لگانے نہیں پڑے، ماءشاءاللہ آپ کا والیم اتنا تھا، جو خود آ آکر کان میں گر رہا تھا...... کیوں ذیاج۔ اور تو کیا گونگے کا گڑ حلق میں پھنسائے بس ہنسے جارہا ہے۔ بتا، تو بھی اپنے کمنٹ، جو ہر جملے پر دے رہا تھا۔’’

امان نے ان کے بیچ سے ہٹتے ہوئے ذیاج کو بھی سنائی تھیں، مگر ذیاج چپ تھا۔ امان کے ہٹتے ہی وہ اس کے قریب ہوگیا، اور سمجھانے والے مدھم لہجے میں کہنے لگا۔

‘‘چپ کیوں کر گئیں آپ...... بولیے، بولتے ہوئے آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔’’

اس نے کھا جانے والی شرر بار نگاہ سے اسے دیکھا تھا، اگلے دانت خود بخود جم گئے۔

‘‘دیکھے مسٹر ذیاج! میں یہاں ٹرپ پر انجوائے کرنے آئی ہوں، آپ کو انٹرٹین کرنے نہیں۔ اس لیے اپنی اوقات میں رہیے۔’’

وہ کہہ کر مڑی تھی مگر ذیاج کے پکارنے ‘‘پلیز بات سنیے’’ پر پلٹ کر دیکھا تھا، اور بولنے کے بجائے سوالیہ بھنویں اچکائیں۔ ‘‘ایک مخلصانہ مشورہ دوں۔’’ وہ اسے مسلسل دیکھتی رہی۔ ‘‘جس وقت آپ گفتگو کررہی ہوتی ہیں، تو پلیز زحمت کرکے انہیں......’’ ذیاج نے اس کے کانوں میں اڑسے ہینڈز فری کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ‘‘انہیں باہر نکال لیا کریں، تاکہ آپ اپنے والیم کو خود صحیح جج کرسکیں۔’’

اس نے جھٹکے سے اپنے کان سے ہینڈز فری نکالے قدرے شرمندہ بھی ہوئی تھی۔

‘‘کیا واقعی! میں بہت اونچا بول رہی تھی؟’’

ذیاج نے اپنے سینے پر ہاتھ لپیٹتے بہت آرام سے کہا۔

‘‘صرف آپ ہی نہیں، بلکہ آپ کی تمام فرینڈز بھی۔’’

‘‘ایم سوری۔’’ وہ اچھی خاصی کھسیانی ہوگئی تھی، اور یہ ایسا معاملہ تھا جس پر اسے تصدیق کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اکثر و بیشتر مما، نانو بھی پیچھے سے آکر اس کے کانوں سے ہینڈز فری نکالتیں، اور اکثر

تو تھپڑ بھی رسید کرتی تھیں۔

"سن نہیں رہیں کب سے آوازیں دے رہے ہیں...... آہستہ بولو، ہم بہرے نہیں۔" ایسے جملے کم و بیش دن میں کئی بار سنتی تھی۔

وہ معذرت کر کے وہاں سے جانے لگی، ذیاج نے ایک بار پھر سے کہا۔

"اگر مزید کچھ کہنا ہے...... بولیے، میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

ذیاج کی ادا پل بھر کو اسے ساکت کر گئی۔ پھر گردن جھٹک آگے بڑھ گئی تھی۔

کچھ تھا ذیاج کی آنکھوں میں۔ اس کی آنکھوں کی بناوٹ کسی سے ملتی تھی یا دیکھنے کا انداز۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اور اس نے تفریح کا سارا دن ذیاج کی نگاہیں خود پر محسوس کیں۔ ٹرپ غارت ہوا تھا مگر دل لگتا تھا آباد ہو گیا ہے۔ جب بھی دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں ذیاج بات کرنے کے لیے بہانہ اس کے ہینڈز فری کا بناتا۔ دور سے ہی اپنے کان کی جانب انگلی بجا کر ایسے اشارہ کرتا، جیسے کہہ رہا ہو "ہینڈز فری نکال کر بات کرو" اتنا تو کبھی اس کی اماں نے اس کے ہینڈز فری کا پہرہ انہیں دیا تھا جتنا وہ بڑا ابنا ساتھ ساتھ یاددہانی کرواتا رہا۔

☆☆☆

ذیاج چپ کر کے بہت دیر اس کی بات سنتا رہا، پھر حل نکالنے کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

"اچھا میں اپنے طور پر کچھ سراغ لگاتا ہوں۔ مگر پلیز۔ تم اتنی جلدی پریشان مت ہو جایا کرو۔ یار، چھوٹی سی جان ہے تمہاری، کیوں ان خرافات میں ہلکان کر رہی ہو۔"

"تمہیں یہ خرافات لگ رہی ہیں، لیکن ذیاج یہ میرے وجود کی جڑیں ہیں۔ بنیاد ہیں میری۔ جو وقت نے اس قدر کھوکھلی کر دیں اب کھڑے رہنا دشوار لگتا ہے۔"

ذیاج کے دل میں کہیں اندر تک وہ کب سے بس چکی تھی۔ وہ فون پر بھی اس کے منہ سے ادا ہوئے لفظوں کی کیفیت بھانپ گیا اور پیار سے بہت دیر تسلی دیتا رہا، جس سے اسے اچھا خاصا آسرا مل جاتا تھا۔

اور آج تنہا اترتی شام میں جب بالکل دل اوب گیا، اور ان دیکھے خوف کے سائے ہر طرف سے اس پر اترنے لگے، اس نے حسب معمول ذیاج کو کال ملائی۔ پہلی ہی ٹون پر کال ایسے ریسیو ہوئی۔ جیسے وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

"خیریت...... ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو بات ہوئی ہے۔"

اس کے تحیر پر وہ روہانسی ہو گئی۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"ایک تو میں تمہارے دل سے تنگ آ گیا ہوں یار۔ اسے کہو خون بنائے، دھڑکے، جو اس کا کام ہے، گھبراتا کیوں ہے، کہو تو کسی کارڈیالوجسٹ سے ٹائم لوں۔"

"ذیاج......" وہ ڈپٹ کر بولی۔ "آئی ایم سیریس...... پلیز بی سیریس......"

"اوکے۔" ذیاج بہت ہمدردی سے بولا۔ "آنٹی آئیں نہیں ابھی تک۔"

"نہیں...... کیا تم کچھ دیر کے لیے آ سکتے ہو......؟"

اس کے ملتجی انداز پر وہ بے بس لگا۔

"آ تو سکتا ہوں یار، لیکن...... تمہیں پتا تو ہے، مجھے دیکھتے ہی آنٹی تم پر بگڑنے لگتی ہیں، ایسے ہی ان کا موڈ خراب ہوگا، وہ کس کڑی کو کس سے جوڑ دیتی ہیں۔"

"اب کون سا وہ گھر پر ہیں۔ اور نانو سو رہی ہیں۔ میں اکیلی، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے...... پلیز۔"

"وہ آنے ہی والی ہوں گی۔" پھر اس نے کلاک پر ٹائم دیکھا۔ "اچھا ٹھیک ہے مجھے چاچو کو لے کر ایک جگہ جانا ہے، انہیں ڈراپ کر کے واپسی پر آتا ہوں۔"

"ڈراپ کر کے کیوں...... کیا واقعی وہ یہاں آنا نہیں چاہتے......؟ تم نے کبھی پوچھا نہیں، ان کا دل نہیں کرتا، کبھی وہ آمنے سامنے بیٹھیں، بھلے ماضی

میں گرد ہی سہی، مگر اس گرد کو صاف تو کریں۔"

"مجھے صاف بتاؤ، میں آؤں یا چا جاؤں......؟"

"کوئی بھی نہ آئے، کسی کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ سنا تم نے۔"

اس کے انداز سے ذیاج کو دور بیٹھے لگا تھا جیسے اس کے حلق میں بے بس اور بے گناہ آنسوؤں کا پھندہ آ گرا ہو۔ پھر وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ کتنی دیر ذیاج نے اسے بہلانے کی کوشش کی، وہ "ہوں ہوں...... اوکے۔" مدھم سا کہتی رہی۔

"تم رو رہی ہو؟"

"نہیں۔" ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑتے پچھلے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"ڈونٹ وری...... میں آتا ہوں، اور پلیز یہ رویا مت کرو۔" اس نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔

☆☆☆

مانا موسم بھی خاصا حبس زدہ تھا، صبح سے سارے ماحول کو گھٹن نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اس نے کھڑکی کے آگے ٹنگا سفید ریشمی جالی کا پردہ جو صبح سے بے جان ہستی کی طرح سولی پر لٹکا تھا، سرکا کر باہر کی جانب جھانکا، سیاہ آسمان کے کنارے گرد میں لپٹی زردی سے اچھے خاصے ہولناک لگ رہے تھے، سوکھی گرد کی دھانس نتھنوں میں محسوس ہوتے ہی تنہائی اور حشت پر ذمہ داری چھا گئی، چھت پر باندھی تاروں پر ڈالے گئے کپڑے جھولنے شروع ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے آندھی آنے والی ہے۔"

آندھی کے سبب آ جانے والے گرد سے بچاؤ کے لیے اس نے جلدی جلدی کمروں کے کھڑکیاں اروازے بند کیے اور پچھلے صحن کی جانب دوڑ لگائی تا کہ کپڑے اتار لائے۔ ایک بھی کپڑا اڑ گیا، ممانی اں کی جان کو آ جائیں گی۔ پھر کتنے ہی دن اس کی ہت اور مہنگائی کا رونا اخراجات کی نہ ختم ہونے والی ٹ سننا پڑے گی۔ جب تک وہ بھاگتی دوڑتی ماربل ے برآمدے سے نکل کر پچھلے صحن کی جانب بڑھی تب تک پہنچی آندھی اپنی تمام گرد و غبار کے ساتھ تار پر ٹنگے کپڑوں کو آپس میں جھٹکوں سے الجھاتی ہوا، اس کے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ کچھ کپڑے زمین پر مٹی میں لوٹنیاں لگا رہے تھے۔ ایک آدھ یقیناً کہیں اڑ بھی گیا ہوگا، پاگل ہوتی ہوا میں سوکھے پتوں اور خالی شاپروں کی سنسناہٹ، تنہائی اندھیرا، ہوا کے تیز جھونکوں کے دھکے، بہت سے کپڑے بازوؤں میں دبوچے ابھی وہ زمین پر جھکی ایک چادر اٹھا رہی تھی، اسے کسی کے چھت پر کودنے کا گمان ہوا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے جھکے جھکے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا یک دم سانس تھم گئی تھی آنکھیں ہرنی کی طرح وحشت آمیز پھیلے جا رہی تھیں۔ اس کی شربتی آنکھوں میں وہ خوف تھا جو آج تک وہ کسی سے کہہ ہی نہیں پائی تھی۔ کہتی بھی کیا۔ اور اگر کہہ دیتی تو پھر کہاں جاتی۔ یہاں تک کہ ذیاج سے بھی کبھی یہ بات نہ کہہ پائی تھی...... وہ ذیاج جو اسے اب زندگی سے زیادہ اپنی روح کا کوئی حصہ لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ سیاہ لیدر کی ریوالونگ چیئر پر جما بیٹھا تھا، شیشے کی بڑی سی آفس میز پر رکھیں فائلز الٹ پلٹ کرتے وہ خاصا مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ میز کے ایک جانب پلاسٹک کی آفس باسکٹ رکھی تھی جس میں چند فائلز، اٹیمپس تھیں۔ ان کے ساتھ ٹیبل کلینڈر کے آگے پین ہولڈر نصب تھا، سامنے اس کا لیپ ٹاپ روشن، جس کی اسکرین پر بار بار نظر دوڑاتے سامنے بچھی فائل پر مختلف نشان لگاتا رہا۔

دفعتاً انٹرکام بجا، اتنی مصروفیت میں یہ مداخلت خاصی ناگوار گزری تھی اور جیسے ہی انٹرکام پر اعظم لیاقت کے آنے کا پتا چلا ناگواریت ماتھے سے لہجے میں بھی در آئی لیکن اس نے مروت میں منع نہیں کیا۔

"بھیج دیں۔" کہہ کر اپنے کام پر متوجہ ہو گیا، گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوتے اعظم لیاقت سے مصافحہ کے لیے اٹھنا بھی اسے کوفت میں مبتلا کر گیا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہی خود بھی نشست

سنبھال لی اور دوسری فائل اپنے سامنے کھسکائی۔

''اور سنائیں کیسے آنا ہوا۔''

''بس یہاں سے گزر رہا تھا، تمہاری محبت کھینچ لائی۔''

اس کا رخسار استہزاً پھیلا، اعظم کی نگاہیں اِدھر اُدھر چیزوں پر ہوتی اس کی شخصیت پر جم گئیں، اکتیس بتیس سال کا خوبرو نوجوان، کھڑے نقوش، صاف رنگت پر مطمئن چہرا، توانا مضبوط کسرتی جسم، سیدھی کمر، اٹھی گردن، نظریں فائل پر جمی وہ پوری توجہ سے فائل چیک کرتے اپنے کمنٹ ایک کونے میں لکھ رہا تھا، ساتھ دستخط بھی۔ اعظم کی بے سروپا باتوں کا ''ہوں ہاں'' میں جواب دینا اُس کی اُس سے بیزاری ظاہر کرتا تھا مگر اعظم سمجھے تب نا، اعظم جتنا خوش اخلاق بننے کی اداکاری کررہا تھا اتنا تھا نہیں، اُس کرسی کے چھن جانے کی چبھن اسے کہیں اندر تک کاٹ کے رکھتی تھی۔

''ہائم صاحب۔ اب تو آپ کام کو کچھ سمجھ گئے ہوں گے یقیناً۔''

اس کے چبھتے لہجے پر دستخط کرتی ہائم کی انگلیاں لمحہ بھر کو رکیں، پھر سائن کے نیچے اسٹیمپ لگاتے اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''جی جی اعظم بھائی...... کام زیادہ ضرور ہے، بٹ انٹرسٹنگ۔'' اس نے فائل مکمل کر کے ایک جانب رکھی پھر دوسری اٹھالی۔ پیون کے کافی سرو کرنے کے دوران اس نے سائڈ ڈرا سے چند اور فائلز نکال کر اپنے سامنے بچھالیں۔ جن میں سے چند ایک آج ہی چیک آؤٹ کرنا تھیں۔ بھورے کور کی فائل کو اس نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ ہائم انصراب اسے ہی چیک کررہا تھا۔

''یہ ارضا فارما کی فائل ہے؟''

استفسار پر اس نے زبان کے بجائے سر ہاں میں ہلا کر جواب دیا تھا، کپ لبوں تک لگاتے اعظم لیاقت نے فائل کا اچھا خاصا مشاہدہ کرلیا تھا۔ پھر خالی کپ میز پر رکھتے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''عابس صاحب ٹھیک ہیں، آفس میں دکھائی نہیں دیے۔''

''ہوں ٹھیک ہیں، ایکچوئلی وہ جاپان گئے ہوئے ہیں۔'' ایک میٹنگ کے سلسلے میں'' ہائم نے فائل بند کرتے ایک نظر اسے دیکھا۔ ''خیریت کوئی کام تھا؟''

''ہاں...... ایک کام تھا...... خیر......'' اس نے جان کر بات ادھوری چھوڑی کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''اب اجازت دو یار بہت دیر ہوگئی۔'' دروازے سے باہر نکلتے وہ پرفیکٹ کا انگوٹھا دکھا کر کہنا نہیں بھولا تھا۔

''ٹیک کیئر۔''

☆☆☆

شیشے کی میز پر اس کے سیل کی تھرتھراہٹ گونجی، نگاہوں کا رخ چمکتی اسکرین پر گیا۔

''احمد بھائی۔'' خفیف سی بھنویں سمیٹتے ہائم نے اسکرین ٹچ کر کے کان سے لگائی پہلے جملے پر ہی اس کے ہونٹ ''اوہ'' کرتے گولائی میں سمٹ گئے۔

''کب...... اب کہاں ہیں آپ۔''

اس کے چہرے پر متفکر سایہ لہرایا۔ ''پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا، میں ابھی آتا ہوں...... جی جی آپ فکر نہ کریں، رداب کو میں بتادوں گا۔ اللہ حافظ۔''

بات کرنے کے دوران اس کی نگاہ شیشے کی کھڑکی کے آگے لگے سلائڈنگ بار سے اعظم لیاقت پر گئی تھی اب وہ مس رابعہ کے کیبن میں داخل ہورہا۔

''عجیب خبطی ویلا ہے۔۔ ابھی اِسے دیر ہو رہی تھی، اب اُدھر بھی پہنچ گیا سلامیاں دینے۔'' بڑبڑاتے ہوئے ہائم نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا دراز میں تالا لگایا۔ اسٹینڈ سے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنا، چابیاں، موبائل، گلاسز اٹھا کر باہر نکل آیا۔ وہ مس رابعہ کے کیبن میں بہت عجلت میں داخل ہوا تھا۔

''مس پلیز، مجھے ایک ایمرجنسی میں جانا ہے، میرا کام دیکھ لیجیے گا، اینڈ......'' اس نے ایک کی چین اس کی جانب بڑھائی۔ ''یہ ڈرا کیز (چابیاں) ہیں ایک دو فائل چیک کرنی ہے، پلیز آپ دیکھ لیں، ہوسک ہے مجھے ایک دو لیو (چھٹیاں) لینی پڑ جائیں۔''

''کیوں خیریت بھی ہے......؟'' رابعہ پوچھتے ہوئے آگے کو ہوتی کرسی کے پنجوں پر جھکی۔

''ہاں بس خیریت ہے۔ میں فون پر بتا دوں گا آپ کو...... اوکے۔'' چابیاں اس کے پاس رکھ وہ اشارۃً اللہ حافظ کرتا تیزی سے باہر کی جانب پلٹا۔

☆☆☆

الحمیدز لیگلی ملٹی نیشنل کمپنی تھی جو تائیوان، جاپان سے Albuman (انڈے کی سفیدی کا مصنوعی کیمیکل) اور گلیکٹوز خرید کر یہاں مختلف فوڈ اینڈ میڈیسن فیکٹریوں کو سپلائی کر رہی تھی، دورِ حاضر کا بہترین کاروبار تھا، الحمیدز کو ایک ملٹی نیشنل ادویاتی کمپنی کی جانب سے پہلی بار بہت بڑی سپلائی کا پروجیکٹ ملا تھا، جس میں مارجن بہت زیادہ تھا، اعظم لیاقت الحمیدز میں فنانس منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا، عابس حمید اپنے والد کے رکھے اس ملازم سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہوئے تھے، وہ تھا بھی ایسا چرب زبان، غیر سنجیدہ رویہ، کام سے غفلت، بلا وجہ چھٹیاں، اور پھر ہر کسی کے آگے اپنی تعریفیں دوسرے کی برائیاں، ایک مکمل چغل خور انسان، اُسے کتنی بار عابس نے کہا تھا۔

''اعظم۔ ہم کاروبار کر رہے ہیں، کوئی سیاست نہیں۔ کاروبار میں ایک دوسرے کے نقائص نظر انداز کیے جاتے ہیں، تشہیر نہیں کی جاتی۔ ان کے نقائص سے ہمیں کیسے فائدہ اٹھانا ہے، یہ پتا ہونا چاہیے اور تم اعلان کر کے دشمنیاں بڑھا رہے ہو۔''

مجال ہے جو اس پر اثر ہوا ہو، ایک بار ایک کمپنی کے ملازم کے سامنے دوسری کمپنی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیں بات عابس تک پہنچی، وہ تلملا کر رہ گیا اور باپ سے دوٹوک کہا تھا۔

''اسے اپنے انداز سے سمجھا دیں ورنہ میں تو پھر اپنے طریقے سے سمجھاؤں گا، پھر آپ گلہ مت کیجیے گا۔''

''اوہو یار، تم اعظم کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔''

حمید صاحب نے بات ٹال دی۔ لیکن جب جاپان کے پروجیکٹ پر سائن ہوئے تو اُس کے فنانس معاملات اعظم کے حوالے کرنا انتہائی بے وقوفی تھی، جو کم از کم عابس نے نہیں کرنی تھی۔ اس نے جونیئر فنانس کلکٹر ہائم انصر کو ترقی دینے کا تذکرہ خصوصاً اعظم لیاقت سے کیا۔ مقصد اس کے تاثرات جانچنا تھا، اعظم ذات کی نفی برداشت کرنے والوں سے تو تھا نہیں، فوراً اسے کہہ دیا۔

''مجھے تو ایک اور کمپنی سے بہت اچھی آفر آ رہی ہے، یہاں تو میں صرف حمید انکل کی وجہ سے رکا ہوا تھا...... آپ ہائم کو مستقل کر لیں۔''

عابس کو کیا چاہیے تھا۔ اس نے اعظم سے جان چھٹنے کو غنیمت جانا۔ حمید چند دن بیٹے سے خفا ضرور رہے مگر ہائم انصر کے کام نے انہیں متاثر کیا تھا کہ وہ اکثر بیٹے کے فیصلے کو سراہنے لگے۔ دوسری جانب اعظم نے کمپنی چھوڑ دینے کے بعد بھی الحمیدز آنا ترک نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھار چکر لگا لیتا۔ تمام کولیگز کے ساتھ اچھی شناسائی تھی، پھر سب جانتے بھی تھے۔ اسے حمید صاحب کی فیور بھی حاصل ہے، اچھے طریقے سے ہی ملتے تھے۔

اس دن بھی معمول کی طرح فارغ البال بیٹھا مس رابعہ کو مفت مشوروں سے نوازتا رہا، اور وہ ناچار سنتی رہی، یہ آنے والے وقت نے طے کرنا تھا اس کا یہاں بے کار بیٹھنا کتنی خوشیاں پل میں ہڑپ کر جائے گا۔

☆☆☆

تپتی آگ کا سنہرا گولا ٹھنڈا ہوتے ہی نارنجی رنگ میں ڈھلتے ڈھلتے آسمان کے کناروں پر اٹک سا گیا تھا۔ اوپر کی جانب نارنجی سرخ شعاعیں تھیں، نیچے دھوئیں کے مانند سرمئی سیاہ بادل، وہ وقت جب دو مختلف لمحے معانقہ کرتے ہوں، پل جھوم کر مسکراتے ہوں، ہر چیز مدغم ہونے کو بے قرار و بے چین، عصر قضا ہو چکی تھی، مغرب کی اذان تاریخ بدلنے کو بے قرار ہوا چاہتی تھی، تاریخِ آدم بتاتی ہے پہلے رات بنائی گئی۔ نہیں نہیں...... سزا کے لیے نہیں، اور نہ ہی بھٹکنے کے لیے، بلکہ خاموشی میں غور و فکر کے لیے، معاملات کو سمجھنے کے لیے، اندھیرے سے امیدِ سحر کی

خواہش بیدار کرنے کے لیے، گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پو پھوٹ ہی پڑتی ہے، مگر تب جب ہم اس کے لیے خود کو تیار کرلیں، نہ کہ خود کو اندھیروں کی نظر کردیں۔

وہ ہر آنے والے پل میں یہی سوچتی تھی کہ اب اس کی زندگی میں کوئی پل ایسا نہیں ہوگا جو جگمگاتا ہوگا، روشنی کی کرن ہوگئی، اس کا دل بھی تو رات کی مانند سیاہ ہو چکا تھا اس کی سیاہی کسی طور اترنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ زندگی تھی کہ ایک کٹہرے میں آن کھڑی تھی۔ اس کٹہرے سے نہ وہ خود نکلنا چاہتی تھی، نہ زندگی نکالتی تھی۔ دائرے پھر دائرے گھومتی، پھر انہی میں آرکتی۔ وہ نارنجی دھاریوں میں پھنسے آگ کے گولے کو دیکھے گئی، دیکھے گئی، دیکھے گئی اور بس دیکھے ہی گئی، کانوں میں کوئی مدھر بازگشت کسی گرم سیال کی طرح انڈیل رہا تھا، وہ سیال تپ کر آنکھوں میں جلتے آنسو کی طرح اٹکا تھا۔

☆☆☆

”یہ پتا نہیں ڈوبے گا یا نہیں، لیکن ہائم مجھے اتنا یقین ہے یہ، مجھے ضرور لے ڈوبے گا۔“ اس کے لہجے کی بیزاریت بالآخر زبان پر آہی گئی۔ اور ہائم انصر اس کے بیزار انداز پر اندر تک محظوظ ہوا۔

”ڈبونے کے لیے نہیں آپ کو تیرا کر لایا تھا مائی سوئیٹ ہارٹ بیگم صاحبہ۔ کھڑی رہو کچھ دیر، کہیں نہیں تمہارا کچھ مس ہوتا۔“

”جی......“ وہ چبا کر بولی۔ ”میرا کچھ مس ہو نہ ہو، آپ کی اماں کا ضرور کچھ مس ہوجائے گا۔“

ہائم نے بھنویں سمیٹتے اُسے ہلکی سی سرزنش کی تھی۔

”ہونہہ......یار بڑوں کو ایسے تو نہیں کہتے ناں۔“

”بڑوں کو بھی تو بڑا بننا آئے ......ابھی ان کی ہانک آجانی ہے، کپڑے اتارنے گئی تھی یا سورج کو ترپال باندھنے۔“

ماں کی انتہائی نقل اتارنے پر نا چاہتے ہوئے بھی ہائم کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

ردابہ خشک کپڑوں کو تار سے اتار کر بازو پر ڈالے کوفت میں مبتلا تھی، ابھی یہ ڈھیر تہہ لگا کر الماریوں میں بھی رکھنا تھا، استری والے استری کرنے، پھر کوکنگ، کچن کا پھیلاؤ اور اس سب میں اس کا پسندیدہ سیریل مِس ہونے کا قلق تو کبھی شادی کے بعد زبان پر آیا ہی نہیں تھا۔ وہ فارغ ہونے کے لیے جلد کام سمیٹنا چاہ رہی تھی۔ کبھی اتنی دیر چھت پر نہ لگتی اگر ہائم دبے پاؤں چھت پر نہ آتا، اوپر سے بضد۔

”کھڑی رہو تمہارا کیا جارہا ہے، اتنی اچھی ہوا چل رہی ہے، سورج کے رنگ بدل رہے ہیں۔“

قدرتی تبدیلی دیکھنے کا ہائم میں الگ ہی جنون تھا۔ یہ دیکھے بنا ردابہ کے چہرے کے کتنے رنگ اب تک تبدیل ہوچکے تھے۔ ردابہ کا بس نہیں چل رہا تھا ہاتھ اتنا اونچا کر کے سورج کو پکڑ نیچے کردے یا لاؤنج میں لگے کلاک کو قدرے پیچھے۔ اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔

اپنی ماں کی نقل اتارنے پر ہائم مسکراتا ہوا ذرا قریب ہوا۔

”رادبہ! یار۔ یہ کام وام چھوڑدو۔ تم پیروڈی شروع کردو، قسم سے کیا ہٹ جاؤ گی۔“

رادبہ نے انگشت سے اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔

”پیچھے پیچھے، یہ چھت ہے۔“

ہائم کی کھل کر مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے ردابہ کی بازو پر رکھے کپڑوں کی جانب اشارہ کرتے کہا۔

”میں تو یہ لینے کے لیے آگے ہورہا ہوں، تم پتا نہیں کیا سمجھتی رہتی ہو۔ اچھا بھلا شریف شوہر ملا ہے تمہیں۔ قدر ہی نہیں۔“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں اس کی تمام شرافتیں۔“ کہتے ہوئے نے اپنی بازو پر لٹکتے کپڑوں کا ڈھیر اس کی بازو پر منتقل کیا۔

”بس اب تو وزن نہیں رہا۔ اب تو شکل اچھی بنالو۔“ کپڑے دبوچتے وہ ہنسا۔

”بہت اچھے لگتے ہو ہائم۔ جب تم وزن بانٹنے کی بات کرتے ہو، پلیز بدل مت جانا۔“

”میرا خیال ہے جتنا ٹائم بدلنے میں لگے گا، میری ساری ہیئت بدل جائے گی۔ اور پھر کسی نے

منہ بھی نہیں لگاتا، بڑھے پیٹ کے کھانستے بابے کو۔’’

ردابہ کا اس کے معصوم تجزیے پر قہقہہ چھوٹا۔ ہنسی میں پھیلتے رخسار کی گرم لالی ہائم کی توجہ کا مرکز تھی۔ ردابہ کو جیسے ہی اس کی نگاہ کی تپش محسوس ہوئی وہ یک دم سنبھلی اور وہاں سے ہٹنے لگی، ہائم نے کلائی پکڑ لی۔

‘‘کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ چند پل بھی میرے ساتھ نہیں کھڑی رہ سکتیں، شوہر ہوں تمہارا۔’’

جتنی محبت وخواہش سے وہ روک رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو تاحیات کھڑی رہتی۔ لیکن جو کچھ اس کے ساتھ نیچے جا کر ہونا تھا اس سے کہیں بہتر تھا عزت سے چلی جائے۔ اس دن وہ ہائم کے پاس رکنا نہیں چاہ رہی تھی، اور آج زندگی رُک گئی تھی۔

ہر کام سے فارغ سارا دھیان بادلوں سے الجھتے گرم گولے پر تھا۔ دماغ میں عجیب دھمکا چوکڑی مچی تھی، نیچے جائے نہ جائے۔ اس وقت اس سے خود بھی فیصلہ کرنا دشوار تھا، مرضی تو یقیناً پوری ہو چکی تھی لیکن پھر بھی جانے وہ کس قسم کی معافی، تلافی چاہ رہی تھی۔ غصہ تھا جو ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر چھوٹی سی منہل اپنی گڑیا لیے زمین پر بیٹھی تھی، لاپروا معصوم، بھورے بھورے بال برائے نام، چھوٹی سی پونی میں جکڑے، ماتھے کے کٹے بال اپنی ننھی سی ہتھیلی سے بار بار پیچھے کرتی ایک خفگی بھری نگاہ ماں پر ڈال پھر سے گڑیا کی ساڑھی باندھنے لگ جاتی، نیچے سے کوئی چوتھی بار فریدہ کی نقاہت زدہ آواز آئی تھی۔

‘‘اب آ جاؤ نیچے...... وہ کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔’’

اس کے دیکھنے میں ذرا برابر فرق نہیں آیا، گولے کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

‘‘منہل جاؤ، تمہارے بابا آئے ہیں...... ان کے ساتھ جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔’’

باپ کی آمد کا سنتے ہی معصوم نگاہیں یک دم جگمگائیں، اپنی فراک جھاڑتے ہوئے اٹھی۔

‘‘آپ نہیں جائیں گی؟’’

‘‘نہیں۔’’

‘‘کیوں......؟’’

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ بالکل اپنی ماں کا پرتو تھی، اور آنکھیں پٹپٹاتے اسے دیکھنے لگی۔

‘‘وہ آپ کا پوچھیں گے، پھر کیا کہوں گی؟’’

اس نے بھنویں میکانکی انداز میں سکیڑیں نگاہ آگ سے پھسل کر اس پر آ گری۔

‘‘کہہ دینا وہ نیچے آنا نہیں چاہتیں؟’’

‘‘لیکن کیوں مما...... وہ میرے بابا ہیں...... ہمیں لینے آئے ہوں گے پلیز۔’’

وہ ردابہ کی قمیص کا دامن پکڑے ضد کرنے لگی جس پر اس نے سرزنش کر دی۔

‘‘وہ تمہارے باپ ہیں، تمہیں ملنا ہے مل لو...... اگر نہیں ملنا، تو بتا آؤ...... مجھے تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں۔’’

ردابہ نے اُسے ڈپٹتے جھٹکے سے رخ پھیر لیا۔ اب سورج اس کی پشت پر شعاعیں برساتا نیچے ہو رہا تھا۔ منہل نے منہ بناتے خفگی سے ماں کو ایسے دیکھا جیسے ماں کی بات سے بالکل اتفاق نہ کرتی ہو۔ پھر منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے نیچے کو بھاگی۔

منہل کو گئے کچھ پل ہی گزرے تھے اُسے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کا احساس ہوا تھا، وہ لمبے ڈگ بھرتا چند پل میں اوپر آ گیا تھا۔ تاسف میں گھلی اک ‘‘آہ’’ سی دونوں کے خون میں رینگتی چہروں پر دھاڑ مار کر رونے لگی تھی۔

جل سے جمے بال، سیاہ پینٹ، ایش گرے کوٹ جس کی آستین کہنیوں تک سمیٹ رکھی تھیں، کھلے بٹنوں سے آج بھی اس کی وائٹ ٹی شرٹ جھانک رہی تھی، وہ گھنی سیاہ بھنویں سمیٹے اسے تحیر سے دیکھ رہا تھا۔ کتنے دنوں بعد یہ چہرا دیکھا تھا، تھکا تھکا، زردی میں کملایا چہرا، بے رونق حلقوں میں گھری آنکھیں، اُسے پھر سے شرمساری نے آ گھیرا، اور کتنے دن سے وہ دل میں تمنا کر رہی تھی کہ کسی صورت

وہ اُس کے رو برو ہوتا کہ اس سے کچھ پوچھے، اس سے لڑے۔ مگر اب سامنے دیکھتے ہی جانے اس کے اندر کون سی انا عود کر آئی تھی اسے یکسر نظر انداز کر کے پہلو بچاتی تیزی سے نیچے جانے کو لپکی۔ اُس نے اس کی کہنی تھام لی، نا چاہتے ہوئے بھی اک ناگوار ایت اس کے سارے جسم میں پھیلی۔ وہ اس سے کہنی چھڑا کر نیچے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی گرفت کلائی پر بہت مضبوط تھی۔ اس کے لفظوں پر ردابہ کی آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں، جن میں چار سال پرانا سفر تیر نے سے دھندلا کا بنا تھا۔

☆☆☆

یونی گراونڈ ٹولیوں کی صورت قہقہوں سے آباد تھا۔ کہیں کہیں پڑھائی کے متوالے کتابیں جھولی میں رکھے جھوم جھوم کر پڑھنے میں مصروف تو کوئی لیپ ٹاپ لمبی پھیلائی ٹانگوں پر رکھے اپنی دنیا میں مگن سے تھے۔ اور وہ سفیدے کے درختوں سے گھری وسطی سڑک پر بہت تیزی سے مین گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی، اس کی آج پھر بس چھوٹ جانے کے سبب اسے اچھا خاصا غصہ تھا۔

اللہ کی پناہ جب پروفیسر رئیس لیکچر دینے پر آتے تھے سوائے پہلی لائن کے پچھلے تمام اسٹوڈنٹس سونے کا شغف پورا کر لیتے، کچھ اسٹوڈنٹس تو اس پریڈ میں آتے ہی سونے کے لیے تھے۔ کچھ برابر والے کی کہنی کھا کر ہڑ بڑا کر اٹھتے۔ اور کوئی بے قابو ہوتی کتاب پھسلنے سے ڈسٹرب ہو کر۔ بس ایک پہلی قطار والے ہی شامت کے مارے اس طرح سوتے تھے کے مسافروں کی طرح گردن نہ جھولے، کھلی کتاب گود میں قابو میں اور ان سب سے قطع نظر سفید بورڈ کو کالا کرنے پر تلے پروفیسر رئیس، اپنی ہلکی بھنبھناہٹ کے ساتھ لگے رہتے۔ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا تھا جیسے کسی کو سمجھانے کے بجائے خود سمجھ رہے ہوں۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ گھنٹے کی کلاس اکثر ہی دو سے اوپر ہو جاتی۔ کچھ اسٹوڈنٹس کا خیال تھا ان کی بھی اپنی بیوی سے نہیں بنی ہوگی، اس لیے گھر جانا نہیں چاہتے۔ بیشتر یہ کہتے پائے جاتے گھر والے ہی نہیں چاہتے وہ گھر آئیں۔ اور طلبہ چاہتے تھے وہ یونی ہی نہ آئیں ان کا لیکچر پلے تو پڑتا نہیں البتہ لیٹ ہونے کے سبب بس چھوٹ جاتی تھی۔

ردابہ کے ساتھ بھی آج یہی ہوا تھا۔ وہ پروفیسر صاحب کے لیے دعائے مغفرت مانگتی تیز تیز چل رہی تھی، کہ عقب سے وہ یوں سامنے آ کھڑا ہوا، اور وہ اسے دیکھ کر خوف سے ایسے اچھلی جیسے کوئی چیز شاخ سے ٹوٹ اس کے پاس گری ہو۔ اس نے بغور اسے دیکھا تھا، نہ وہ کسی پھل کے مشابہہ تھا نہ ہی بندر، اچھا بھلا انسان مگر ایسی حرکت......؟

”میم مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر ناگواری سے اسے دیکھا، وہ دو سالوں سے اسے دیکھ رہی تھی اچھا خاصا خوب صورت بندہ تھا، پھر اکثر ٹیچرز طلبہ اس کی ذہانت، شرافت کی تعریف کرتے پائے جاتے، دیکھنے میں بھی معقول لگتا تھا، مگر جانے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کس خوش فہمی کا شکار تھا۔ کتنے دنوں سے اس کے پیچھے پڑا تھا، اگر وہ کسی کو بتاتی، ٹیچر تو کیا اس کی اپنی بیسٹ فرینڈ ہانیہ نے یقین نہیں کیا تھا۔

”ہائے انصر اور تمہارے آگے پیچھے...... پاگل ہو گئی ہو یار۔ وہ اچھی بھلی کو لفٹ نہ کروائے، بڑی آئی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، میں اندھی کانی ہوں، یا لولی لنگڑی......؟ آگے پیچھے پھر رہا ہے، میرا ایڈریس مانگتا، دو تین ذرائع سے بھی پتا چلا ہے۔ میری کھوج میں لگا ہے۔

”یقیناً پھر تم نے اس کا قرض دینا ہوگا یا کچھ چرایا ہوگا، ورنہ وہ اور ایڈریس مانگے۔ لڑکیاں جان دینے کو بیٹھی ہیں بس ایک اشارے کی منتظر۔ بی بی دنیا میں واپس آ جاؤ۔“

پکی سہیلی کے بے لاگ تبصرے پر ردابہ کا جی چاہا اس کے اگلے پچھلے سارے دانت توڑ دے۔

”اچھا۔ چلو پھر لکھ رکھو۔ تم دیکھنا، کسی دن بیچ یونی میں پٹے گا وہ مجھ سے۔ پھر دیکھنا اس کا تماشا، کیا مداری

بندر نچاتا ہوگا، جو وہ ناچے گا میرے ہاتھوں۔"

"ارے رہنے دو یار۔ بس کرو خواب دیکھنے۔"

دونوں ہاتھ سے تالی بجاتے، ہانیہ ہنستے ہوئے دہری ہوئی۔ وہ ردابہ کی ڈری سہمی، اپنے آپ میں سمٹی شخصیت سے بہت اچھی طرح واقف تھی، کوئی اسٹوڈنٹ کام کرے نہ کرے وہ پورا کر کے رکھتی تھی۔ بالکل پرائمری اسکول کے بچوں کی طرح۔ اس خوف سے کلاس میں ڈانٹ نہ پڑے۔ چار اسٹوڈنٹس کھڑے اونچا بولیں، وہاں وہ مڑ کر نہ دیکھے۔ کبھی یونی کے کسی پروٹیسٹ، یا ہڑتال میں حصہ نہیں لیا، یہاں تک کہ یونی کے یونین الیکشن میں ان کے گروپ کی اور اچھی خاصی سہیلی کی الیکشن کمپین میں یہ کہہ کر حصہ نہیں لیا تھا۔

"یار نہیں۔ بھائیوں کو پتا چل گیا، تو یونی سے بھی جاؤں گی۔ امی بہت مشکل سے مجھے بھیج رہی ہیں۔"

"لو جی، یونی کی باتیں انہیں کون بتائے گا۔" ہانیہ نے احتجاج کیا۔

"پتا چل ہی جاتا ہے...... میڈیا کتنا فاسٹ ہے، اگر کوئی گڑ بڑ ہوگئی گولی ہی چل گئی، اور بھاگتے ہوئے کیمرے نے مجھے ہی دکھا دیا، تو......"

اس کے خوف ناک "تو" اور دور اندیشی پر ہانیہ نے اپنا رجسٹر اس کے سر پر مارا۔

"تو...... ہمیشہ دبو ہی رہنا۔"

"ہاں مجھے دبو ہی رہنے دو۔"

وہ ردابہ جو اپنے دبو ہونے پر شاکر تھی اور خود کو ڈر پر فخر سے بتاتی تھی، آج وہ کہہ رہی ہے، ہائم انصر اس بیچ یونی پٹے گا۔ بات تو مضحکہ خیز تھی ہی، ہانیہ ہنس رہی تھی، اس لیے دوبارہ ردابہ نے اسے بتایا ہی نہیں ہائم کو اچھا خاصا نظر انداز کیا۔ گھور کر دیکھا مگر اپنے خاندان کا بڑا ہی کوئی ڈھیٹ پیس تھا بھئی، بار بار اس کے راستے میں آ کر ایک ہی بات۔

"پلیز ردابہ میم...... میں خود کو بہت کوشش کے بھی روکنے سے ناکام رہا ہوں، میں نہیں جانتا یہ صحیح یا غلط طریقہ...... مگر پلیز، مجھے آپ کا، یا کسی فیملی ممبر کا کانٹیکٹ دے دیں، میری والدہ کو چاہیے۔" وہ تند نگاہ سے دیکھ کر آگے نکل جاتی۔

اس دن پھر اسے کوئی دورہ پڑا تھا سامنے آ ٹپکا، وہ خاموش چلتی رہی۔

"پلیز میری بات سنیں...... آخر آپ ٹرسٹ کیوں نہیں کرتیں۔ کسی ٹیچر کی سفارش لاؤں۔" وہ چپ رہی۔ "میم۔" ترچھی کٹی بھنوؤں میں شدید غصہ لہرایا۔ ہونٹ بھنچ گئے۔

"آپ، سن رہی ہیں نا...... میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں۔"

"جی فرمایئے......" اب وہ رک کر قدرے غصے سے بولی۔

"یعنی کہ آپ نے سنا ہی نہیں......"

"جی نہیں...... بولیے۔"

ردابہ نے جرنل والے ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے اور بہت سرد انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"ایکچوئلی میم۔ آپ میرے، میری فیملی کے بارے میں کسی سے بھی، کوئی بھی انفارمیشن لے سکتی ہیں، آپ مایوس نہیں ہوں گی۔ لیکن پلیز، اس طرح اگنور (نظر انداز) تو مت کریں۔"

"کیا اگنور نہ کروں، چاہتے کیا ہیں آپ۔"

"آپ کا ایڈریس، میری فیملی آنا چاہتی ہے آپ کی طرف۔ اور مجھے پتا ہے آپ کسی سے کمیٹڈ نہیں ہیں...... تو پھر؟" وہ کچھ رکا۔ "میں آپ...... سے......؟"

اس کی شربتی کانچ جیسی آنکھوں میں اتنی تندی دیکھ کر اس کے مزید لفظ رک گئے۔ اگر ردابہ کے بس میں ہوتا وہ درخت اکھاڑ کر اس کے سر میں دے مارتی۔ اکھڑی جگہ پہ ہائم کو دفن کرتی مگر سوائے اپنا خون جلانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ بعد میں تو ہائم کو بھی بہت عرصے تک اپنے اتنے فضول طریقے سے پرپوز کرنے پر ساری زندگی پچھتاوا ہی ہوا تھا۔ لیکن فی الوقت اسے اندازہ ہی نہ ہو پایا وہ کتنی بڑی بات کس آسانی سے کہہ گیا۔ اس وقت تو اس کے خیال میں وہ سب صحیح تھا نہ تو وہ مذاق کر رہا تھا نہ ہی فلرٹ۔

سیدھی سی بات سیدھے طریقے سے پوچھی تھی توقع نہیں تھی وہ اسے بلبلا کر دیکھے گی۔

"کہہ چکے جو کچھ کہنا تھا...... ہٹیں اب راستے سے۔"

ہائم کا تو آنکھوں کے ساتھ منہ بھی کھل گیا۔

جب وہ تحقیر سے اسے دیکھ کر سائڈ سے ہوتی آگے بڑھ گئی، سڑک سے ٹکراتی اس کی ہیل کی ٹک ٹک ہائم کو کانوں پر چابک کی طرح لگی۔

اتنی بے توجہی، اتنی بے وقعتی۔ ہائم انصر کو حیرت سی حیرت تھی، ایک ہاتھ پینٹ پاکٹ میں دوسرا بالوں کے سروں پر سرکتا رہ گیا۔ یوں آسانی سے رد کر دینے والی شخصیت تو نہیں تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ دانت کی زد میں آ گیا، قریب سے گزرتے کچھ طلبا نے تمسخر سے دیکھا، اکثریت نے توجہ ہی نہیں دی۔ کچھ نے معمول کی بات سمجھی یا شاید کسی نے بھی خاص توجہ نہیں دی لیکن اسے ایسے ہی محسوس ہوا تھا۔ ایک سبکی تھی جو سرد آہ کی صورت برآمد ہوئی۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے تھے، کتنی بار ردابہ اسے نظر آئی۔ لائبریری میں، کیفے ٹیریا میں، کلاس، گروپ اور جونیئر سینئر پریزینٹیشن میں بھی۔ ایک دوسرے کو ایسے نظر انداز کیا تھا جیسے کبھی ملے نہ ہوں۔

اس بات کو تقریباً دو ماہ گزر گئے تھے، جب وہ اسٹوڈنٹس ڈیجیٹل لائبریری میں بیٹھی تھی۔ اس کا لیپ ٹاپ سامنے کھلا پڑا تھا۔ لائبریری کے مونیٹر سے ڈیٹا کیبل لگائے وہ کچھ چیزیں اپنے لیپ ٹاپ میں منتقل کر رہی تھی، میز پر اس کے جرنل بھی کھلے پڑے تھے ان پر بھی کہیں کہیں کلر پنسل سے ہائی لائٹ کر لیتی تب ہی وہ "ایکسوزمی" کہتا کرسی کھینچ مقابل بیٹھ گیا، ردابہ نے چہرے کی ناگواریت کو قابو میں کرتے اپنی چیزیں جلد جلد سمیٹیں۔

"میم۔ اس دن میں نے آپ سے کوئی جوک نہیں کیا تھا، شاید میرا ایک دم ایسا کہہ دینا آپ کو برا لگا تو معذرت...... بٹ ایم سیریس۔"

اس کی جرأت پر ردابہ کے بدن میں پھر سے انگارے بھر گئے۔ اپنے دونوں بازوں سمٹی ہوئی چیزوں پر اوپر تلے رکھے، کٹیلی نگاہ اس پر گاڑھ دی۔ وہ بھی قدرے آگے کو ہو کر بیٹھا اور بہت ہموار لہجے میں ایسے اعتماد سے بولا جیسے وہ سن کر اسے تمغے پہنا دے گی۔

"میرا ایم فل کمپلیٹ ہونے والا ہے، ففٹی تھاوزنڈ سیلری کی آفر آ چکی ہے، ایک دو روز میں جوائننگ دے دوں گا۔ جلد پروموشن ہو جائے گی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں، جوہر ٹاؤن بارہ مرلہ اسکیم میں ذاتی شاندار گھر ہے......"

اس سے پہلے وہ مزید کچھ بتاتا ردابہ نے ایک طائرانہ نگاہ اس سارے پر ڈالی۔

"اور یہ کہ آپ کوٹ کے نیچے ٹی شرٹ پہنتے ہیں، ہیر جل لگاتے ہیں۔ ہنڈا بائیک ہے، کھانے میں بھنڈی یا آلو گوشت پسند ہے۔ بس ہو گیا آپ کا تعارف...... اب یہ بتائیں آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے، خواہ مخواہ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں۔"

ہائم کو اُس سے اِس طرح کے جملوں کی قطعاً امید نہیں تھی لمحہ بھر تو وہ سٹپٹایا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"ایکچوئلی۔ میری والدہ آج کل ایک مہم پر نکلی ہیں...... میں نے آپ کا ذکر کیا تو انہیں آنے کے لیے آپ کا ایڈریس درکار......"

اب تو عین ممکن تھا وہ ایک ایک کر کے ساری چیزیں اس کے سر پر مارتی، لیکن گھر تک بات پہنچ جانے یا صرف یہاں تماشا بننے کے خوف سے اس نے جبڑوں میں اپنا غصہ کنٹرول کیا، مونیٹر سے ڈیٹا کیبل کھینچ کر نکال بیگ میں رکھی، ہاتھ مار کر لیپ ٹاپ بند کیا اور کاغذ سمیٹتے ہوئے اٹھی۔

"جن سے آپ نے یہ معلوم کیا، میں کمیٹڈ نہیں، ان سے ایڈریس بھی معلوم کر لیجیے...... اینڈ......"

لیپ ٹاپ اٹھا کر فائل پر رکھا اپنے ساتھ لگایا۔

"فار کائنڈ انفارمیشن، میں یہاں پڑھنے آتی ہوں، اشتہارات پر توجہ دینے نہیں۔ مجھے آپ کی بائیوگرافی سے یا آپ کی والدہ کی مہم جوئی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"اور ہاں......" وہ جانے کے لیے مڑی تھی کچھ یاد آنے پر انگشت اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "آئندہ مجھ سے بات کرنے سے پہلے سو بار سوچ لینا، میں آسانی سے معاف نہیں کرتی۔ انڈر اسٹینڈ۔"

اس قدر صاف گوئی، ٹکا سا جواب وہ تحیرزدہ تھا، کیا یہ وہی لڑکی ہے جو کلاس سے باہر اکثر روتی ہوئی دیکھی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا بیشتر پیپرز میں وہ بے حد پریشان ہوتی تھی۔ سہیلیاں پاس کھڑی تسلی دے رہی ہوتیں اور پریزنٹیشن میں کبھی اسے سوال کرتے نہیں دیکھا تھا یہاں تک کہ اگر پروفیسر اُسے اٹھا لیتے تو ہونقوں کی طرح منہ دیکھنے لگتی اور زیادہ پرانا قصہ نہیں تھا جب آرٹ گیلری والوں نے پچھلے سال ایگزبیشن کی تھی، ہائم انصر کو اچھی طرح وہ بات یاد آگئی، بالکل اس کی آنکھوں کے آگے کسی فلم کی طرح چلنے لگی۔

فائن آرٹس والوں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کو خوب سجا رکھا تھا، تین دن سے کلاسیکل ایگزبیشن لگی تھی، وہ بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ دیکھنے چلی گئی۔ کلاسیکل ابسٹریکٹ کی بہت سی پینٹنگ ایک لائن میں لگی ہوئی تھیں، آخر میں ایک موٹا سا کپڑا نہایت بے ڈھنگے رنگوں کے جال سے بھرا ایزل پر چڑھا تھا، اور استعمال شدہ برش تمام اس کے ساتھ لگا رکھے تھے۔ وہ چلتے ہوئے اس کے پاس رک گئی، ہانیہ کو بھی روک لیا اور زمین آسمان کے قلابے ملانے لگی۔

"یار یہ کینوس پینٹنگ دیکھو۔" تحیر سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں، اس کی کھنکتی آواز نکلی۔ "جسٹ امیجن" (تصور کرو) آرٹسٹ کیا گہرائی میں اوبا ہے۔" اس کی آواز پر کچھ فاصلے پر سعد کے ساتھ ٹھے ہائم انصر نے مڑ کر دیکھا۔ "جب فرسٹریشن ہوتی ہے انسان ایسے رنگوں میں الجھ جاتا ہے، یہاں سے ہی خیل ابھرتا ہے......کیا بات ہے یار۔"

اس کی پوری بات سن کر ہائم کی پتھریلی نگاہ استہزا یں سعد کی جانب گھومی، وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آرٹسٹ نہیں ڈوبا، اس بے چارے کے رش ڈوبے تھے۔"

صرف لوگوں کی خاطر ہانیہ ہاں میں ہاں ملا رہی تھی ورنہ اس کا تو سر چکرانے لگا تھا اتنے تیز رنگ، اور ساتھ گندے بُرش دیکھ کر۔

ہائم کا دوست فائن آرٹس اسٹوڈنٹ تھا، سعد نے جیسے ہی ان کی پوری بات سنی ہائم کو ٹہوکا دیا۔

"جا۔ ذرا ان ننھی منی کا کیوں کو واضح کر کے آ، یہ پینٹنگ نہیں ہیں، اس کپڑے پر ہم بُرش صاف کرتے ہیں۔ جسٹ کلچرل پیدا کرنے کو ٹانگا ہے۔ ایزل پر......احمق کہیں کی۔"

"ٹھہر ذرا۔ انجوائے اِٹ یار۔"

ہائم مسکراہٹ دباتے اعتماد سے اٹھا۔

"آپ اسے خریدنے میں انٹرسٹڈ ہیں......؟"

ہائم قریب جا کر بولا، ہانیہ نے تھوک نگلا، پھر ردابہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی ہم مشورہ کر رہے ہیں۔" مگر ردابہ نے فوراً ہی پُرجوش سر ہلاتے کہا تھا۔ "جی جی کیوں نہیں' اتنا زبردست شاہکار ہے کہ آرٹسٹ کی تعریف کرنے کو جی چاہ رہا ہے......"

"اچھا!!!!......" وہ حیران رہ گیا۔

"کیا آپ نے بنائی ہے؟" ردابہ نے پوچھا۔

"نہیں میرے دوست نے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے پھر سے اس میں غرق لگتی تھیں۔

"کیا پوچھ سکتا ہوں میم، آپ کو اس میں کیا سمجھ میں آ رہا ہے۔ مجھے سمجھانا پسند کریں گی آپ۔"

"ہانیہ نے ردابہ کو کہنی ماری کہ اب جواب دے۔ وہ اچھی خاصی گھبرا گئی، سمجھ میں تو اسے کچھ نہیں آ رہی تھی صرف لوگوں پر یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہمیں بھی آرٹ کی زبان سمجھ میں آتی ہے۔ جو سب سے مختلف لگی آ کے کھڑی ہو گئی تھیں، انہیں کیا پتا تھا یہ کینوس پینٹنگ نہیں برش صاف کرنے والا کپڑا ہے۔ اس نے خود کو پوز کرتے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔

"کیوں بتاؤں میں آپ کو......اور آرٹ معمولی زبان تھوڑی ہے، سمجھانے سے سمجھ میں آ جائے، اس

کے لیے خداداد صلاحیت ہونا ضروری ہے، میں تو بچپن سے آرٹ گیلری میں آتی رہی ہوں۔“

وہ کہہ کر پھر رکی نہیں تھی، ہانیہ کا بازو کھینچتے تیزی سے باہر کی جانب نکلی۔ ان کے نکلتے ہی ہائم اور سعد نے قہقہہ لگایا۔

”آئی بڑی خداداد صلاحیت، جیسے آرٹ گیلری میں ہی پیدا ہوئی ہوں...... صفائی والے کپڑے سے متاثر ہوگئیں۔“

اور یہ ہی نہیں اس کے بعد بھی اس کے دو چار مظاہرے ہائم اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

یونی میں بک فیئر تھا شاید جہاں، علم وادب کے شیدائی اسٹوڈنٹس کی کثیر تعداد اسے اسٹالز بھرے پڑے تھے وہاں خواہ مخواہ رش بڑھانے کو کچھ ایسے طلبا بھی اپنی قابلیت اور ادب سے لگاؤ جھاڑتے دکھائی دے رہے تھے، جو ادب سے بے بہرہ ہوں۔ ان ہی میں پکی سہیلیاں ہانیہ اور ردابہ ہاتھ تھامے پیش پیش تھیں۔ وہ ادب کی دقیق کتابوں کا اسٹال تھا۔ وہ دونوں ایک کے بعد ایک کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے میں محو تھیں، ہائم مختلف کتابیں دیکھتا اس کے پاس ہی آ کھڑا ہوا۔ اسے اشفاق احمد کی زاویہ چاہیے تھی۔ اسٹال پر اس کی ایک ہی کاپی بچی تھی جو اس وقت ردابہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے قدرے قریب ہوتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”آپ کو سمجھ میں آرہی ہے یہ......؟“

اس نے تند نگاہ سکیڑتے ہوئے کہا تھا۔

”دیکھ رہے ہیں نا، پڑھ رہی ہوں۔ کیا مطلب ہے اس کا۔“

”اوہ سوری۔ ایکچوئلی میں یہ خریدنا چاہ رہا تھا...... کوئی بات نہیں، پڑھنے کے لیے میں آپ کو دے دوں گا، کیا میں پے منٹ کردوں۔“

لمحے میں ہی ردابہ نے جھوٹ گھڑا اور جم کر بولی۔

”پڑھ رہی ہوں، اس کا مطلب ہے مجھے پسند ہے، اور خریدنی بھی ہے...... کچھ اور دیکھ لیں آپ۔“

وہ ناگواری سے رخ پھیر کر پھر صفحے پلٹنے لگی ساتھ کھڑی ہانیہ کی سرگوشی ہائم کو بھی سنائی دے گئی۔

”رکھ دے واپس۔ اسٹال والے سے کیا دشمنی ہے۔ تیری...... تجھے املا سمجھ میں نہیں آتی، جملے آئیں گے......“

”میں اپنی املا ہی درست کررہی تھی پر پلے ہی کچھ نہیں پڑا۔“

کچھ دیر بعد ہی ہائم نے دیکھا تھا کتاب واپس اپنی جگہ رکھی تھی اور وہ دونوں کھلکھلاتے ہوئے باہر نکل رہی تھیں۔

”ہونہہ...... شوخی۔“ ہائم نے کتاب اٹھاتے جبڑے جما کر کہا تھا۔

اور اب لائبریری میں بیٹھی کتنے وثوق سے کہہ کر گئی تھی پڑھنے آتی ہوں، اشتہار پر توجہ دینے نہیں۔

”چاہے ڈیٹا کیبل سے گیمز انسٹال کررہی ہو...... آسانی سے معاف نہیں کرتی...... سو بار سوچوں۔ نالائق۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ اس کے پیچھے باہر نکل آیا تب تک وہ خاصی دور جا چکی تھی، اور عین یقین تھا کینٹین پر بیٹھی کُرکُرے کھا رہی ہوگی۔

☆☆☆

چند دن مزید گزرے وہ اسے یونی میں کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ جس طرح تمام اسٹوڈنٹس روز دکھائی نہیں دیتے۔ پھر بہت دن گزر گئے، ایک دوبار خواہ مخواہ ردابہ کا اس کی جانب خیال بھٹکا ضرور تھا۔

”لگتا ہے سڑک چھاپ پروپوزل کا نمونیہ اتر گیا بے چارے کا۔“

کئی بار لاشعوری طور پر نگاہوں نے اسے تلاش بھی پھر گردن جھٹک کر وہم دور کیا۔ جب کوئی غیر معمولی بات کردے لاشعور نا چاہتے ہوئے بھی بھٹکتا، ٹٹولتا ضرور ہے۔ وہ بھی اسے کھوجتی، پھر خود کو سرزنش کرتی۔

”اونہوں۔ آوارہ کہیں کا۔ آیا بڑا ایڈریس بتا دوں، گھٹیا انسان۔“

دو چار بار ویسے ہی ہانیہ سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھی۔ پہلی بار تو وہ نہیں کھٹکی تھی لیکن کئی بار پوچھنے

پر اس نے شرارتاً کہا۔

”خیر بھی ہے...... آج کل بڑا اس کا پوچھ رہی ہو، کہیں ارادہ تو نہیں بن گیا۔“

وہ فوراً سنبھلی۔

”استغفراللہ۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہی ہوں، یہاں ہی منڈلاتا رہتا تھا درختوں کے اوپر نیچے، نیولا کہیں کا۔“

”خیر نیولا تو نہ کہو۔ یار اچھا خاصا ڈیشنگ ہے۔ کسی فلم کا آڈیشن دے تو، فلم سپرہٹ ہوگی۔“

ہانیہ کے ذومعنی کہنے پر پہلے تو اس نے اس کے بازو پر دو تین مکے لگائے، پھر دونوں ہی ہنسنے لگیں ایسے ہی خواہ مخواہ بلاوجہ، جیسے لڑکیاں ہنستی ہیں۔

☆☆☆

موسم قدرے خوش گوار تھا، مست ہوا درختوں کو چھو کر گزرتی مضبوط پتے سرسرا کر بج جاتے۔ کمزور سہمتے پتے دوسرے جھونکے سے جھڑ کر فضا میں تیر کر زمین بوس ہو جاتے۔ وہ یونی کے پچھلے گراونڈ میں ایک درخت کے نیچے لگے سنگی بینچ پر بیٹھی، پتوں اور ہوا کی سرگوشیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی اسائنمنٹ مکمل کر رہی تھی، اچانک وہ کہیں سے وارد ہو گیا۔ کھنکارتے ہوئے کچھ فاصلہ رکھ بیٹھ گیا، ردابہ نے باقاعدہ شعوری کوشش سے چہرے پر ناگواری پھیلائی اور پہلو بدلیا۔

”آہمم......“ وہ پھر کھنکارا۔

”گلا خراب ہے، تو ای این ٹی کے پاس جائیں۔“

”نو نو، میں سلام عرض کرنے آیا تھا میم...... تو السلام علیکم۔“

وہ بالکل متوجہ نہیں ہوئی، ہائم نے بینچ سے ٹیک لگاتے ہوئے بہت عام سے انداز میں کہا۔

”اسلام میں تین بار دستک دینے کا حکم ہے۔“

”جی......!“ وہ میکانکی انداز میں مڑی اور سر تا پاؤں تک اسے گھورتے کہا۔ ”اور جواب نہ ملے تو واضح ہو جانا چاہیے۔“

”لیکن میں انتظار کرنا چاہتا ہوں......“

”تو شوق سے کریے۔“ وہ شولڈر بیگ کی اسٹرپ کندھے پر ڈالتے اٹھی وہ بھی ساتھ چلنے لگا، پیروں کے نیچے آتے سوکھے پتے احتجاج پر اتر آئے۔

”میم آپ ایک بار غور تو کریں، آخر آپ کو شادی تو کرنا ہے...... مجھ میں کیا برائی ہے......“ وہ تیزی سے چلنے لگی۔ ”میرے سارے بہن بھائی شادی شدہ ہیں، صرف ایک بہن رہتی ہے......“ اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ”اس کی بھی بہت جلد ہو جائے گی......“ ردابہ گراونڈ پار کر اب سڑک پر چڑھ گئی تھی۔ ”والد صاحب نہیں ہیں، والدہ بہت اچھی ہیں۔“

اس نے رک کر اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا تھا، وہ فوراً سنبھلا۔ ”سوری سوری...... میں شرافت سے جرح کر رہا ہوں پلیز سن تو لیں۔“

وہ بنا بولے آگے بڑھ گئی شکر ہے اُسے بس کھڑی نظر آ گئی تھی۔

”دیکھیں میں آپ کو انفارم کرنا چاہ رہا ہوں میری فیملی آپ کی طرف آئے گی...... پلیز مجھے آپ کا جواب چاہیے۔“

”تو میری طرف سے صاف اور کورا جواب ہے...... سمجھے۔“

وہ اب تیزی سے سامنے آ گیا۔

”آخر کوئی ریزن (سبب) تو ہوگا۔“

”میری بات سنیں مسٹر، آپ یہاں پڑھنے آتے ہیں یا میرج بیورو کا پمفلٹ بیچنے۔“

”پہلے تو یہ کہ میں اب پڑھنے نہیں آتا، جاب کر رہا ہوں۔ دوسرے آپ ایسے کیوں کر رہی ہیں، مطلب ایوائیڈ...... بلیو می، میں نے پچھلے دو سال آپ کو آبزرو کیا۔ میں نہیں جانتا وہ کون سی طاقت ہے جو بار بار آپ کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ خود کو بہت سمجھانے کے باوجود، میں خود کو مجبور اور کمزور پاتا ہوں۔...... پلیز...... آپ ایک بار غور تو کریں، جتنا مرضی ٹائم لیں، سال دو سال...... بہت سال۔ میں انتظار کر سکتا ہوں، میری پوری فیملی ہے، سب کی مرضی، اور ایک ارینج طریقے

سے...... پھر آخر قباحت کیا ہے......“

اسے یقین تھا اب وہ ضرور غور کرے گی مگر وہ بیزاریت سے دانت جما کر بولی۔

”دیکھیں مسٹر......“

”مسٹر نہیں، ہائم۔ ہائم انصر نام ہے میرا۔“

”جو کوئی بھی ہے...... میں جتنا برداشت کر سکتی تھی کر چکی، بہت سنے ہیں اس قسم کے فلرٹ۔ شرافت اسی میں ہے اب میرے راستے سے ہٹ جائیں۔“

اس نے اک بے بس سی نگاہ اٹھائی، اور سامنے سے ہٹ گیا۔

”میں فلرٹ نہیں کر رہا مس ردابہ...... بس اک آخری کوشش ضرور کروں گا، پھر جو آپ کے گھر والوں کا فیصلہ ہو۔“

پینٹ کی جیب میں ہاتھ اڑستے وہ مخالف جانب چل پڑا۔ وہ تیزی سے بس کے پائیدان پر پاؤں رکھ اوپر چڑھ گئی۔ وہ کھڑکی کے پاس سیٹ پر بیٹھی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی کئی بار اس پر نگاہ گئی۔ ہائم نے چلتے ہوئے دو تین بار مڑ کر بس کو دیکھا تھا، نگاہیں دونوں کی ملی تھیں لیکن ردابہ نے جلد زاویہ بدل لیا۔

☆☆☆

شام کی چائے کے لیے تانیہ اُسے آوازیں دیتی چھت پر آ گئی۔ وہ منڈیر پر کہنیاں ٹکائے فضا میں کچھ تک رہا تھا اس نے آگے آ کر ہاتھ ہلایا۔

”کہاں ہیں بھائی۔“

”ہوں۔“ وہ قدرے چونکا۔ ”کہیں نہیں۔“

”یہ لیں چائے۔“ تانیہ نے کپ اس کی جانب بڑھا دیا۔ ”کیا سوچ رہے تھے...... لگتا ہے اس میڈم نے ایڈریس دینے کے بجائے ہری جھنڈی دکھا دی۔“

”ہری جھنڈی دکھاتی تو میں ہرا بھرا نہ ہو جاتا، لال جھنڈی ہے اس کے ہاتھ میں......“ ہائم کے تلملا کر کہنے پر تانیہ قدرے حیران تھی۔

”کیا مطلب، میں سمجھی نہیں......؟“ ہائم کے لہجے میں کڑواہٹ اتر آئی تھی۔

”شاید وہ مجھے غلط سمجھ رہی ہے۔“

”حرکت تو آپ کی غلط ہی ہے، کسی لڑکی پر نگاہ رکھنا، اور پھر سرِ عام پروپوز کرنا، ایڈریس مانگنا، یہ کوئی نیک حرکت تو ہے نہیں......“

”شرعاً یہی طریقہ ہے، جس سے شادی کرنا چاہیں، اسے اپنا رشتہ بھیج دیں۔ اب کیا میں پہلے اسے پھول بھیجوں، لو لیٹرز لکھوں، اور پھر مدعا بیان کروں۔“

”تو پھر انہوں نے بھی آپ کو شرعی طریقے سے اگنور کر دیا، ہٹ جائیں ناں پیچھے۔“

”وہ بلا وجہ انکار کر رہی ہے۔ خواہ مخواہ فلرٹ سمجھ رہی ہے۔ دیکھ بھال کر انکار ہو تو سمجھ میں آتا ہے۔“

اس کے طویل ہوتے دکھڑے پر تانیہ اکتاہٹ سے بولی۔

”بہر حال، اطلاعاً عرض ہے، امی آپ کے لیے، دو تین لڑکیاں دیکھ چکی ہیں، اور ایک تو مجھے فائنل بھی لگ رہی ہے...... جلدی کر لیں۔“

”کیا مطلب ہے......“ وہ بگڑ کر بولا۔ ”میں نے امی کو پہلے بھی بولا ہے ذرا ویٹ (انتظار) کر لیں، پھر بھی۔“

”اس لمبے ہوتے ویٹ نے انہیں اوور ویٹ کر دیا، اب تو ویٹ مشین بھی ان کو اٹھانے سے بیزار نظر آتی ہے۔“

”پلیز۔ مذاق نہیں کرو یار، اور تم، تم کس مرض کی دوا ہو، امی کو روکو اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو تمہاری گردن دبا دوں گا۔“

اس کے مصنوعی غصے پر وہ ہنستے ہوئے اٹھی۔

”ابھی تو وہ محترمہ آئیں نہیں، میری گردن پہلے ہی دبنے لگی۔ بہر حال بی فاسٹ“ وہ کہہ کر نیچے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

نعیمہ کے سارے بچوں میں سب سے زیادہ ہائم اور تانیہ میں محبت پائی جاتی تھی، تانیہ کی جانب سے وہ بے فکر تھا وہ امی کو منا ہی لے گی، لیکن پہلے وہ

میڈم تو مانیں۔ ہائم کتنی دیر سوچے گیا اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا، بس ردابہ پر ہی کمان ٹوٹتی تھی۔ ایسا کیا نظر آتا تھا ردابہ میں جو خیال کسی اور جانب بھٹکتا ہی نہیں تھا، مانا خوب صورت تھی، لیکن کوئی دنیا سے الگ حسن تو نہیں تھا۔ اس طرح کی کتنی ہی لڑکیاں خاندان میں تھیں۔ ویل ڈریس، ویل ایجوکیٹیڈ، لیکن اس کے خیال کا جھروکا ہی سانس ساکن کر دینے کو کافی تھا، عجیب بے چینی کا عالم تھا، جو مضبوط توانا ہائم کو بے بسی کی حد تک لے جاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک ٹیچر سے بھی اس کے متعلق بات کی تھی۔ پہلے تو وہ ہنسے۔ پھر کہا۔

”برخوردار تم خاصے معقول انسان ہو...... اور وہ بچی بھی اچھی خاصی شریف ہے، پھر یہ سب۔“

”کیا مطلب سر، معقول انسان شریف بچی کو پروپوز نہیں کر سکتا کیا......؟

سر مبہم سا ہنسے تھے، اور کچھ پل اس کے انداز کو بغور دیکھا۔

”چلو دیکھتا ہوں، میں کروں گا بات اس سے۔“

اور یہ پروفیسر صاحب ہی کی بات کا نتیجہ تھا وہ ب سے ہائم کو گھور گھور کر دیکھنے لگی تھی۔

ٹیچر سے تو بہتر وہ اپنا مقدمہ آپ ہی لڑ لیتا، جانے انہوں نے کیا کہا ہو۔ اور کہنا انہوں نے کیا ھا، بوڑھے پروفیسر رئیس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا تھا۔

”بیٹا۔ ہائم بہت اچھا بر ہے، پھر تمہارے والد صاحب بھی نہیں، بیوہ ماں کہاں سر کھپائے گی۔۔ ہری بات مانو، اپنی قسمت پر رشک کرو، بیاہ رچاؤ، گھر سنبھالو۔“

اور اس کا دل کیا پروفیسر صاحب کی عقل پر لک کرتے ہوئے، ہائم کا سر توڑ دے کہ ٹیچرز تک ات لے گیا۔ ادھر اماں تیز ہوئی تھیں آج ہی کہیں اندھ دیں۔ قسمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، آخری سہارا اب قسمت ہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے بیڈ پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی، نیند دور دور تک نہیں تھی، ایک یونی کی تھکاوٹ، پھر اس فضول انسان نے دماغ کی چولیں ہلا رکھی تھیں، نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار ہائم اس کی سوچوں میں آنے لگا۔

”ایسے ہی خواہ مخواہ فری ہوئے جا رہا ہے۔ سمجھتا جانے کیا ہے خود کو، لنگور کہیں کا۔“ اس نے سوچتے ہوئے پھر سے کروٹ بدلی، سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھ لیا پھر دونوں بازوں اس پر جما دیے۔ ”لگتا ہے کبھی آئینے میں شکل نہیں دیکھی اپنی، اس سے خوب صورت تو یونی کے بھنگی ہوں گے۔“

تکیہ آہستہ سے سرکانے پر آنکھیں واضح ہوئیں، ان میں مسکائی سی چمک تھی۔ ”ویسے بھنگی سے تو نہیں ملتا۔ ہے تو ڈیشنگ، مگر بے غیرت ضرور ہے، کس ڈھٹائی سے ایک ہی بات کیے جا رہا ہے، دماغ خراب کر دیا میرا۔“ منہ پھر سے ڈھانپ لینے پر بھی اس کی بھنبھناہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔

فریدہ اسے دیکھنے کمرے میں آئی تھیں، وہ جب سے یونی سے آئی کھایا نہ پیا، سر کے درد کا بہانہ کیے لیٹ گئی، اب شام اترنے کو تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی اونچی بھنبھناہٹ پر اچنبھا ہوا۔

”ہائیں...... کس سے باتیں کر رہی ہے، کہیں دماغ پر کوئی اثر وثر تو نہیں ہو گیا...... بیری کے درخت کے نیچے تو نہیں بیٹھی تھی۔“

”کچھ نہیں ہوا۔“ اماں کے قیاس پر وہ منہ پھلائے بولی انہوں نے آگے بڑھ کر تکیہ اٹھا لیا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تیری......“

”جی۔“

”چل پھر اٹھ، تیار ہو جا۔“

”خیریت، کہاں جانا ہے۔“ وہ پاؤں سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”نازیہ کے بیٹے کا ولیمہ ہے، بارات پر بھی نہیں جا سکے، احمد آج سختی سے کہہ گیا تھا، ضرور جانا۔“

”احمد بھائی کا بھی زور ہم دونوں پر ٹوٹتا ہے...... رومانہ بھابھی سے کہتے نا، وہ چلی جاتیں۔“

”جن باتوں کا پتا ہو وہ بات تو نہ کیا کرو۔“ بات کرتے فریدہ ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ ”اپنے میکے کے علاوہ کہیں جانا پسند کرتی ہے رومانہ، جو اسے کہتا۔ چل، جلدی اٹھ میں اور تم چلتے ہیں، تھوڑی دیر بیٹھ کر آجائیں گے۔“

نازیہ آنٹی نہ تو اس قدر قریبی رشتہ دار تھیں کہ ان کے نہ جانے کے سبب وہ پوچھ تفتیش کرتیں نہ ہی اتنی دور کی کہ شادی بیاہ پر بھی نہ جایا جائے۔ پھر احمد بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے آج کل ردابہ کے رشتے کے لیے بہت پریشان تھے، بہت سے ملنے والوں کو اچھے شریف لڑکے کا کہہ رکھا تھا، اسی لیے آفس جاتے ہوئے بطورِ خاص امی کو کہہ گئے تھے۔

”شادی بیاہ پر آیا جایا کریں، میل ملاپ سے ہی لوگوں کا پتا چلتا ہے...... نازیہ آنٹی کا بہت بڑا خاندان ہے، ردابہ کو بھی ساتھ لے کر جایئے گا۔“

ردابہ کا موڈ تو نہیں تھا، مگر فریدہ کے سامنے اس کے بہانے کبھی چلے نہیں تھے، زبان سے کم، اپنی گھرکیوں سے ہی کام چلا لیتی تھیں اور خاص طور پر جب احمد بھائی کسی کام کا کہہ جائیں۔ ان کی بات امی نہیں ٹالتی تھیں۔ رادبہ میں کہاں دم تھا۔ ناچار اسے جانا ہی پڑا تھا۔

سفید نیٹ کی ایمبر یلا فراک جس کے بارڈر اور گلے پر سیاہ سلور اسٹونز کا ہلکا سا کام تھا، سیاہ جاموار کا پاجامہ، برائے نام جیولری، ہلکے میک اپ پر گہری تیز لپ اسٹک، آگے کے بال کچھ اٹھا کر کیچر میں جکڑے روٹین سے ہٹ کر اچھا خاصا تیار ہوئی وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔

شادی ہال میں ہی فریدہ نے نعیمہ کو دیکھا تھا بہت عرصے بعد بھی پہلے جیسی بھاری بھرکم تھیں۔ وہ سلام کی غرض سے قریب گئیں مگر ان کے واجبی رویے نے مزید تعارف کروانے سے باز ہی رکھا، یہاں تک کہ انہوں نے ردابہ کو بھی اُن سے نہیں ملوایا، آ کر شرمندہ شرمندہ سی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ وہ پہلے ہی اکتائی بیٹھی تھی، امی کی خاموشی دیکھ کر جانے کے پر تولے۔

”امی چلیں، مجھے نوٹس بھی بنانے ہیں۔“

”ہاں چلتے ہیں۔ نازیہ سے ذرا مل لیں۔“

جب وہ نازیہ آنٹی سے مل کر واپسی کے لیے نکل رہی تھیں تب مردوں کی سائیڈ سے ہائم اندر داخل ہوا تھا، ہائم کو ساکت ہونے میں لمحہ لگا، نہ تو یوں اُسے کبھی تیار دیکھا تھا نہ ہی فیملی میں، ردابہ چادر اوڑھتے ہوئے نازیہ آنٹی سے کوئی بات کر رہی تھی، اُسے نہیں دیکھ پائی وہ خود بھی ایک جانب ہو گیا، اس کے نکلتے ہی اس نے دوسرا کام نازیہ انٹی سے ملنے کا کرنا تھا اور پھر نعیمہ کو بتانا، کچھ کچھ افسوس بھی ہوا۔

”کاش کچھ دیر پہلے آجاتا، یہاں ہی امی اور بھابھی، بہنوں سے ملاقات کروا دیتا، رشتہ داری بھی پتا چل جاتی۔“

خیر اب پتا لینا ایسا بھی مشکل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی حد درجہ دلچسپی دو ماہ بعد ہی اس کی فیملی کی صورت ردابہ کے گھر موجود تھی، انہیں دیکھ کر ردابہ اچھی خاصی ششدر رہ گئی۔

”اس کی اتنی جرأت...... حد ہے ڈھٹائی کی۔“

اس کا تن من کلس گیا اوپر سے ماں بھائی کا بچھ بچھ جانا۔

”یہ کہیں خبطی تو نہیں ہو گئے۔“ ردابہ پریشانی سے بس یہی سوچے جا رہی تھی۔

دراصل نعیمہ کی اپنے بہو بیٹے اور بیٹی کے ساتھ آمد ہی فریدہ کے لیے حیرت اور بے حد خوشی کا باعث تھی، ولیمے سے چند دن بعد ہی جب نازیہ نے ان کے آنے کا مقصد بتایا، پہلے فریدہ چونکیں، پھر اپنے بیٹے احم سے مشورہ کیا اور بڑی لگاوٹ نازیہ سے کہا تھا۔

”وہ غیر تھوڑی ہیں جو پوچھ کر آرہی ہیں، جم ج آئیں، ان کا اپنا گھر ہے اور احمد، علی تو سنتے ہی کھل اٹھے تھے۔“

جہاں ان کی آمد مسرور کر رہی تھی وہاں پھر س رشتہ استوار ہونا دل کو خوشی دے رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ردابہ سے خوش ہو کر کہتی رہیں۔

”اللہ نے تیرا نصیب بہت اچھا کھولا ہے

دیکھ کیسے گھر بیٹھے بیٹھے بات بن گئی۔“

”امی کیا ہو گیا آپ کو...... کوئی بھی ایرا غیرا آ کر میرا ہاتھ مانگ لے، پکڑا دیں گی...... ایسے ہوتے ہیں رشتے؟“

”ایسے ہی ہوتے ہیں، اور کیسے ہوتے ہیں۔“ فریدہ نے ڈپٹا تھا۔ ”اچھے کھاتے پیتے حالات ہیں، لڑکا خوب صورت، برسر روزگار اور سب سے بڑھ کر اپنے۔“

”اپنے...... کیا مطلب، کون سے اپنے......؟“ اس نے ماں کے ہاتھ میں ہائم کی فوٹو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

”دور کی رشتہ داری ہے، لیکن تیرے باپ کا بہت گہرا دوست تھا، ہائم کا باپ۔“ سنتے ہوئے وہ تحیر سے دیکھنے لگی۔ ”ہک ہا۔“ فریدہ نے سرد آہ بھری۔ ”تیرا باپ زندہ ہوتا تو شاید بہت پہلے یہ رشہ ہو جاتا اور ویسے بھی احمد کے دفتر کے قریب ہی ہائم کا دفتر ہے۔ اس کا باس بتا رہا تھا، بہت شریف النفس لڑکا ہے۔“

”ہونہہ شریف۔“ وہ منہ میں بدبدائی۔ ”بھائی کو کیا پتا ایک نمبر لفنگا ہے۔“

فریدہ سن کر چونکیں۔ ”تجھے کیا پتا...... ملا تھا تجھ سے کہیں۔“

”نن...... نہیں۔“ وہ فوراً سنبھلی۔ ”مجھ سے کیوں ملے گا، میں تو اس کی تصویر دیکھ کر کہہ رہی ہوں بالکل آوارہ لڑکوں جیسی شکل ہے، جتنے یونی میں آوارہ لڑکے ہیں سب کی شکل ایسی ہی ہے۔“

ردابہ نے جلدی سے بات بنائی تھی مگر فریدہ تو خوشی میں ایسی دیوانی تھیں جیسے ہتھیلی پر سرسوں جما لیں۔

☆☆☆

نہ انہوں نے یونی کا کوئی تذکرہ کیا تھا نہ ہی ردابہ نے مناسب سمجھا بات جانے کہاں سے کہاں پہنچتی۔ ویسے بھی وہ اس رشتے سے کچھ خائف سی تھی۔ اتنی تو کھری کھری اسے سنائی تھیں لیکن امی کے سامنے معمولی احتجاج بھی نہ چلا۔ چلتا بھی کیسے، برسوں پہلے ابا فوت ہو گئے تھے، وہ مکمل بھائیوں کی ذمہ داری بن گئی تھی، اکلوتی بہن پھر احمد اور علی سے عمر میں بہت چھوٹی، باپ کا سایہ ہٹ جانے سے اس میں عجیب سا خوف بیٹھ گیا تھا۔ بھائیوں سے بات کرتے ویسے ہی ڈرتی تھی۔ کچھ فریدہ بات بے بات اسے شرارت پر ڈپٹ دیتیں۔ خود میں سمٹ کر رہنا اس کی فطرت بن گئی تھی۔ بھائیوں کی شادی کے بعد فطرت جیسے ذات کا حصہ بن گئی ہو۔ بہوؤں پر روک ٹوک فریدہ کے مزاج میں نہیں تھا، سارا سسٹم بہت عرصے سے بیٹوں کے ہاتھ میں تھا، رومانہ اور سندس بھابھی نے آتے ہی سارا گھر اپنے کنٹرول میں کر لیا تھا۔ ردابہ کو بہن کی کمی کا احساس شدت سے محسوس ہوتا۔ گورنمنٹ کالج سے بی اے پر تو کسی نے کچھ نہیں کہا، لیکن ایم۔ بی۔ اے میں جب یونیورسٹی میں داخلے کا ذکر کیا، بھابھیاں دبا دبا احتجاج کر رہی تھیں، گھر کے اخراجات، اماں کی دوائیں، پھر اپنے بچے بھی۔

فریدہ اُس کے حق میں پہلی بار سفارشی بنی تھیں سو احمد بھائی نے داخلہ کروا دیا، ساتھ اس کے لیے بہتر رشتہ بھی ڈھونڈنے لگے۔ بھائی بھابھیوں نے کئی رشتے دیکھے کہیں خاندان کے بہت بکھیڑے، کہیں لڑکا قبول صورت یا بے روزگار، لیکن ہائم فریدہ کو بہت پسند آیا تھا۔ دور پار کا رشتہ دار ہونے کے ساتھ مرحوم میاں کے پرانے گہرے دوست انصر کا بیٹا۔ وہ تو ایک معمولی رنجش بیچ میں نہ آتی تو، یک جاں دو قالب والا معاملہ چل رہا تھا۔ نعیمہ کے آنے پر وہ رنجش بھی مٹ گئی۔ بھائی بھابھیاں پہلے ہی اس کے فرض سے جلد از جلد سبک دوش ہونا چاہتے تھے، سو فوراً ہی منظوری دے دی۔

☆☆☆

وہ کلرک آفس کی لابی سے نکل کر کوریڈور کی جانب تیزی سے بڑھی تھی، شولڈر بیگ کندھے پر جھول رہا تھا ہاتھ میں چند پیپرز تھے جنہیں الٹ پلٹ کر بڑھتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ آج کل اس کے کلرک آفس کے بہت چکر لگ رہے تھے اسے اپنا

سمسٹر فریز کروانا تھا، کیوں کہ فریدہ کی طبیعت کے سبب شادی جلد ہی رکھ دی گئی تھی۔ گھر میں تیاریوں کے ہنگامے تھے، کوریڈور کے اسٹیپس اترتے اس کے قدم ہائم کی گمبھیر آواز پر تھمے۔

"ہیلو۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا بٹنوں والی سیاہ شرٹ، آف وائٹ پینٹ، آف وائٹ فیٹڈ ویسٹ کوٹ، پینٹ کے ہم رنگ بوٹ اور ٹائی، کلون کی مہک، بال جمے، ہاتھ میں سن گلاسز، اور کی چین تھامے یونی میں ایسے گھوم رہا تھا جیسے کسی کمپنی کا ایگزیکٹو آفس کا رستہ بھول کر یونی آ گیا ہو۔ ردابہ کی آنکھوں میں اچھا خاصا تحیر ابھر کر معدوم ہوا۔

"کیسی ہیں......؟"

پل بھر تو اسے کوئی جواب سوجھا ہی نہیں کیوں کہ سابقہ تمام کڑی ملاقاتوں کے بعد یہ ہونے والی پہلی ملاقات تھی جب رشتے کی نوعیت بھی جڑ گئی ہو۔ کچھ ندامت نے آنکھوں میں ہلکورے لیے مگر جلد قابو پا لیا۔

"جی اللہ کا شکر......آپ کا کیا حال ہے؟"

اس نے بہت سرسری سا پوچھا لیکن ہائم جیسے جی اٹھا۔

"واہ۔ مادام...... آخر آپ کو بھی میرا حال پوچھنے کا خیال آ ہی گیا۔"

"دیکھیں ہائم انصر۔" لہجہ کچھ نرم ہی تھا۔ "مجھے اس طرح کی ملاقات قطعاً پسند نہیں، میں نہیں چاہتی کوئی دیکھ کر ایشو بنائے، میں کوئی آزاد فیملی کی لڑکی نہیں ہوں، بہت محتاط زندگی گزاری ہے میں نے۔"

"ارے ارے ے ے ے...... کس طرح کی ملاقات میڈم......؟" ہائم نے واضح کیا تھا۔ "میں آپ کو لنچ یا لانگ ڈرائیو پر لے جانے نہیں آیا، مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا آپ ابھی تک یونی آ رہی ہیں اور مل بھی جائیں گی...... میں تو اپنی سسٹر تانیہ کے ایڈمیشن کے سلسلے میں آیا ہوں، یہاں سے سیدھا ایک میٹنگ میں جانا ہے، نظر پڑ گئی تو سلام کر لیا...... یقیناً آپ کو تو دیکھ کر بھی توفیق نہ ہوتی۔"

"وعلیکم السلام۔" پہلی بار اس نے جوابی سلام دیا تھا۔ "اینڈ اٹس اوکے۔" وہ کہہ کر سیڑھیاں اتر کر مین گیٹ کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ بھی ساتھ تھا۔

"چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نو تھینکس۔ میں بس سے چلی جاؤں گی۔"

آج کا دھیما لہجہ سیدھا ہائم کے دل میں اترا تھا۔

"ابھی بھی آپ کو ایشو ہے، حالانکہ ہم مضبوط رشتے میں بندھنے والے ہیں......"

"لیکن ابھی بندھے نہیں، سو پلیز۔"

ہائم کو اس کی احتیاط پسندی کسی حد تک پسند بھی آئی تھی، وہ خود بھی ایسی ہی سوچ کا مالک تھا، شاید ایسا ہی کچھ اسے پہلے بھی محسوس ہوا تھا تبھی دل کسی اور جانب مائل ہی نہیں ہوا۔

"چلیں، جیسے آپ کی مرضی۔ بس اسٹاپ تک تو ساتھ چل سکتا ہوں۔"

وہ سن گلاسز لگائے اس کے ساتھ چلنے لگا درختوں سے چھنتی دھوپ اور پتوں کی چھاؤں میں اس کے ساتھ چلنا ردابہ کو ایسے لگا جیسے یہ کوئی خوب صورت خواب ہو۔ اس کا دل بے طرح سے چاہا کاش یہ خواب کبھی بھی نہ ٹوٹے، وہی لڑکا جو کبھی اسے فلرٹ، یا آوارہ لگتا تھا، آج اس کی چال دل کے اندر قدم جماتی محسوس ہوئی تھی۔ پلکوں کو خوابوں کا بار برداشت کرنے کے لیے بہت سی تند ہوائیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، تب ہی ان پر سجے خواب تعبیر کی صورت رہ جاتے ہیں۔ اور ابھی اس کے خوابوں کو تعبیر ملنا تھی۔

☆☆☆

سرد موسم میں دہکتا سرخ جوڑا اور عروسی میک اپ، زیورات، سے سجی بنی، مسکراتی مہکتی ردابہ ہائم کی پُرشوق نگاہوں میں پگھلنے لگی تھی۔ ہائم کو جتنا اسے پانے کا جنون تھا اُسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اب وہ اس کے خواب میں نہیں مجسم حقیقت بنی اس کے بیڈروم میں ہے، اور ایک دل فریب استحقاق بھرے رشتے میں بندھ چکی ہے۔ اس وقت دیکھے میں ردابہ کو بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے چھا

اطراف دھنک رنگوں سے چمکتی افشاں برستی ہو، افشاں مانگ میں لگے تو سجا دیتی ہے، بوتل چھٹ کر فرش پر گر جائے، تلووں سے چپک جاتی ہے، خوب رگڑ کر دھونے سے جان چھوڑتی ہے...... آہ خود کو نے کی بہت سزا دیتی ہے یہ افشاں......!

☆☆☆

مس رابعہ کو کیز دے کر وہ جس وقت آفس سے ا، سڑک پر اچھی خاصی ٹریفک تھی، شور ہنگامہ اور پر پریشانی۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران اچھا خاصا ھا ہوا تھا، اوپر سے ایک سوال، گھر اطلاع دے نہ ے۔ ردابہ کی ان دنوں طبیعت بھی کچھ خاص بہتر تھی، ڈاکٹرز نے آرام کا کہہ رکھا تھا۔ اب اتنی ہانی والی خبر۔ احمد بھائی کا راستے میں بھی دو بار ن آیا تھا اور یہ کہ ردابہ کو ساتھ لے کر ضرور آئے۔ فون کرنے ہی لگا تھا جب مس رابعہ کا فون آ گیا ا۔ فائل کا پوچھتے ہوئے ایمرجنسی کا پوچھنے لگیں، نے انہیں بتا کر گھر کے لینڈ لائن پر کال کی اور ساری صورت حال بتا دی۔

"تو ایسے ہی پریشان ہو رہا ہے، فریدہ کو سے دل کی بیماری ہے...... ہو جائے گی ٹھیک، ادوں گی میں ردابہ کو......"

"اس کا بی پی بھی جلد لو ہو جاتا ہے، آپ اسے لا پلا دینا، پتا نہیں ناشتا بھی ڈھنگ سے کیا ہو گا "

ہائم کو ردابہ کی فکر ہو رہی تھی، نعیمہ نے سنتے چہرا بنایا۔

"تیرا کیا خیال ہے، گھر میں بھوکی پیاسی رہتی سب کچھ ہے، کسی نے ہاتھ تھوڑا روک رکھے اور تو اس وقت گاڑی چلا رہا ہے بند کر فون۔ ہو گی۔ اور میں بتاتی ہوں اسے، ہر وقت نہ پریشان ہوتا رہا کر۔"

"اچھا ٹھیک ہے، پھر جیسے مناسب سمجھیں، بھابھی اسے بھی ساتھ لے آنا۔"

"اچھا اچھا...... لے آؤں گی۔"

نعیمہ سے بات کر کے اس کی کچھ تسلی ہوئی تھی اس نے گاڑی ہاسپٹل کی جانب موڑ لی، جہاں کارڈیک سنٹر میں فریدہ داخل تھیں۔

ہاسپٹل کے کوریڈور میں احمد بھائی، اور علی خاصے بوکھلائے ہوئے تھے، فریدہ بہت پہلے سے ہارٹ کی پیشنٹ تھیں، مگر آج صبح بہت اچانک اٹیک ہوا۔ ڈاکٹرز خاصی پیچیدہ صورت حال بتا رہے تھے۔ ہائم بھی ہاسپٹل پہنچ گیا دونوں بھائیوں کو تسلی دی۔ کچھ دیر بعد ہی اس کی نگاہ انٹرنس پر گئی وہ نعیمہ اور زارا بھابھی کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی، منہل کو تانیہ کے پاس گھر چھوڑ آئی تھی، منہل تھی بھی تو چار سال کی، ذرا سے رش سے گھبرا جاتی تھی۔

"اچھا ہی کیا اسے گھر چھوڑ آئی۔" ہائم نے دیکھتے ہی سوچا اور ردابہ کی جانب بڑھا تھا، بے حد الجھا، آنسوؤں سے دھلا چہرہ، آنکھوں کے گرد گلابی سی سوجن، اس سے نگاہ ہٹا کر اس نے نعیمہ کو سوالیہ دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو نہ ہی لاتیں۔

"کیا کرتی، یہ پریشان ہی اتنی ہو گئی تھی، روئے جا رہی تھی، پھر تو نے کہا تھا لے آنا، اسی لیے لے آئی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تسلی ہو جاتی ہے۔"

نعیمہ ردابہ کی بھابھیوں سے ملتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"کہاں ہیں فریدہ، کیسی ہے، ہوا کیا اچانک سے۔" وہ وضاحت دیتے رومانہ، سندس کے پاس چلی گئیں۔ ہائم سر خم کر کے ردابہ کی جانب بڑھا، اس کے شانوں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے قریب ہی بینچ پر بٹھا لیا۔

"کیا ہو گیا ردابہ...... ٹھیک ہو جائیں گی آنٹی۔"

اس نے خوف و امید سے اس کی جانب نگاہ اٹھائی، اس کی آنکھوں سے لڑھکتے آنسو ہائم کو کوفت میں مبتلا کر گئے۔

"پلیز۔" اس کے ہاتھ کو تسلی آمیز تھپتھپاتے حوصلہ دیا۔ "ایسے مت کرو یار، تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

Waqar Azeem www.paksitanipoint.com

"کیا ہوا میری امی کو...... کل تو میری ان سے بات ہوئی تھی، بالکل ٹھیک تھیں۔"

آنسوؤں میں گندھی آواز سے ہائم کو چبھن محسوس ہوئی۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کا وزن ردابہ کے سرد پڑتے ہاتھوں پر دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں...... مائنر سا اٹیک ہے، ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی......" گیلی پلکیں یقین دہانی کے لیے اٹھیں۔ ہائم نے ہونٹ بھینچ کر پورا سانس لیا تھا۔

"مجھے تمہاری بہت فکر ہے ردابہ...... پلیز اپنے اندر ہمت پیدا کرو، زندگی میں بہت سے فیز آتے ہیں، خود کو اتنا کمزور نہیں پڑنے دینا چاہیے کہ مزید نقصان ہو۔"

"کیا مطلب ہے آپ کے کہنے کا...... کیا کہا ہے ڈاکٹرز نے...... امی کے علاوہ کون ہے میرا۔"

"کیوں...... میں نہیں ہوں...... پھر منہل۔"

وہ چپ رہی، گیلی پلکیں کانپنے لگیں۔

"امی ٹھیک ہو جائیں گی نا۔"

"ہاں ہاں، ان شاء اللہ...... اور اگر تم ایسے ہی روتی رہو گی، وہ تو اپنے وقت پر ٹھیک ہو جائیں گی، لیکن تم ضرور بیمار پڑ جاؤ گی۔"

اس نے بے بسی سے ہائم کے کندھے پر سر ٹیک لیا۔ قریب سے گزرتے لوگ ایسی صورت حال میں جیسے ترحم بھری نگاہ سے مریض کے رشتہ داروں کو دیکھتے ہیں بالکل ویسے ہی دیکھ رہے تھے، بلکہ قریب سے گزرتے ایک سادہ بزرگ نے اُس کے سر کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

"صبر کر دھیے...... اللہ بہتر کرسی۔"

☆☆☆

ایمرجنسی کا دروازہ کھلتے ہی سب میکانکی انداز میں ادھر کو لپکے تھے، بروقت طبی امداد ملنے کے سبب وہ اب خطرے سے باہر تھیں لیکن پھر بھی ڈاکٹرز انجیو پلاسٹی کا مشورہ دے رہے تھے۔ کچھ دن ہاسپٹل رہنے کے بعد وہ گھر آ گئی تھیں، اس کے بعد بھی ردابہ پورا ہفتہ ان کے پاس رکی تھی، ردابہ کی طبیعت اور پریشانی کے خیال سے ہائم نے منہل کو اپنے ساتھ گھر پر رکھ لیا تھا۔ آفس سے چند دن کی چھٹیاں لے لیں، مس رابعہ نے چند دن پہلے ہی ریزائن کیا تھا، اس کی شادی کی تاریخ فکس ہو چکی تھی، بیاہ کر لاہور سے حیدرآباد جانا تھا۔ آج کل و صرف ہائم کی جگہ ان کے بے حد اصرار پر آ رہی تھی۔

ردابہ کی سسرال سے اس کے جیٹھ جیٹھانی او شادی شدہ نند ثمرین آپی ہاسپٹل میں ہی فریدہ کی عیادت کر چکے تھے۔ اب اتنا وقت تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا گھر جانے کے بعد بھی چکر لگاتے۔ نعیم البتہ ہائم کے ساتھ ایک بار آئی تھیں، پھر بھی رداب کے لیے یہ بات بہت اہمیت رکھتی تھی کہ نعیمہ اس کی ماں کو اہمیت دی اور عیادت کو آئیں۔

شادی کے چار سالوں میں وہ پہلی بار ات دنوں کے لیے میکے رکی تھی، ایک تو ہائم اُسے ایک د سے زیادہ رکنے نہیں دیتا تھا۔

"میرا دل نہیں لگتا یار، اداس ہو جاتا ہو تمہارے بنا۔"

سال بعد ہی منہل کی آمد کے بعد بچی اس بہانہ بن گئی۔

"منہل کے بغیر گھر سونا لگتا ہے پلیز...... مل آتی ہو، رہنے کا کیا کام ہے۔"

اور میکے میں کون سا سب باہیں پھیلائے اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ اچھی جگہ شادی کر دی، گھر لڑکا س اچھا ہے، سو فارغ، ایک ماں ہی تھی وہ بھی بلڈ پریشر مریضہ۔ گھر کے مسئلے کبھی کسی سے شیئر کیے ہی نہیں، ایک بار وہ میکے آئی اس سے ہانیہ بھی ملنے آ گئی۔ اس کی ہنسی پر ہانیہ نے اسے بہنوں کی طرح کرید کر پوچھا۔

"تم ایسی تو نہیں تھیں، کھوکھلی ہنسی والی...... بھائی کا رویہ ٹھیک ہے نا تم سے......؟"

اس کے بار بار اصرار پر وہ پھیکا سا ہنسی۔

"سسرال میں صرف میاں کا رویہ ہی تھوڑا ہے، اس سے پہلے بہت سے رشتے ہوتے ہیں...... میری ساس کبھی مجھ سے خوش نہیں ہوتیں، جتنی مر کوشش کر لوں، مجال ہے کہہ دیں میرا کوئی کام درس ہے، جان نکال دینے کی حد تک گھور کر دیکھتی ہیں

میاں فرماتے ہیں، سارا وقت انہیں ہی دوں۔“

”تمہاری آنکھیں نہیں ہیں کیا“ ہانیہ کو یک دم غصہ آ گیا۔ ”تم بھی آنکھیں نکال کر بات کیا کرو...... اور میاں کو چار کر کے سنایا کرو، سسرال والے ہوتے ہی اس قابل ہیں، کہ انہیں ان کی اوقات میں رکھا جائے...... اپنی بھابھیوں سے ہی کچھ سبق سیکھ لو، کتنا منہ لگاتی ہیں سسرالیوں کو...... اور میاں کے کیسے آگے پیچھے پھرتی ہیں، تم بھی نا۔“

چائے لے کر آتی فریدہ نے جب سنا تو پہلے ڈر گئیں پھر بیٹھ کر دونوں کو پیار سے سمجھایا تھا۔

”نہیں۔ بیٹا۔ ایسے نہیں کہتے، اور انسانوں کے رویے اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آتے، انہیں سمجھنے میں وقت لگتا ہے، صبر کیا کرو۔“

”آنٹی۔ کتنا صبر کرے یہ...... سارا کام بھی کرے اوپر سے گھوریاں، تھکاوٹ بڑھ جاتی ہو گی اس کی۔“ ہانیہ چھوٹی بہن کی طرح جرح کرنے لگی۔

”بیزاریت سے کیا کام بہت تھکاوٹ رکھتا ہے بہ نسبت خوشی خوشی کیے کے...... پھر ہائم تھکی تھکی شکل دیکھ کر کیا سوچتا ہو گا۔“

”میں کیا کروں امی، میرا کیا قصور ہے، گھن چکر بنا کر رکھتی ہیں نعیمہ آنٹی مجھے۔“

”تھوڑی ہمت پیدا کر لو، ہائم کی خوشی کے لیے...... گھر ایسے تھوڑی بستے ہیں، بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔“

پھر کئی بار اسے وہی کچھ سمجھاتی رہیں جو شادی سے پہلے سمجھایا تھا۔

”ردابہ میری جان، شادی سمجھوتے کا دوسرا نام ہے، سمجھوتا عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے۔۔ تمہیں تو یہ ہولنا ہی نہیں چاہیے، تمہارا میکا اتنا مضبوط نہیں ہے، گھر پلٹ آئی لڑکی کو کوئی دو دن برداشت نہیں کرتا، اس لیے اپنے اندر ہمت پیدا کرو اور ویسے بھی میاں ی کی خفگی میں کسی رشتے کا نقصان نہیں ہوتا ائے۔ خود ان کے اپنے رشتے کے۔ بہت نازک وتا ہے یہ۔ کانچ سے بھی زیادہ۔ نعیمہ شروع سے ہی ایسی ہے، تم دفع کیا کرو، انہیں موقع ہی نہ دو، ہائم سے شکایتیں لگانے کا۔“

ماں کی تربیت سے پہلے ہی اس میں بہت برداشت تھی، پھر مزید بھر گئی۔

ہائم کے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا، بڑے بھائی ضماد، اور زارا بھابھی کے تین بچے تھے، گھر بھر کی رونق کے ساتھ کاموں میں بھی اضافہ۔ چھوٹی نند تانیہ جو ابھی پڑھ رہی تھی، اس کی صورتِ حال گھر میں ویسی نہیں تھی جیسے شادی سے پہلے ردابہ کی تھی۔ بہت فرق تھا۔ باپ تو اس کا بھی نہیں تھا، لیکن نعیمہ نے خود کو بیٹوں کے آگے کبھی بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے لاڈ بیٹوں سے کہہ کر اٹھواتی تھیں۔ پورے گھر کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ہائم کی بہت دوستی تھی اس سے۔ لیکن اس کا مزاج نعیمہ کے مقابلے میں فطری طور پر اچھا تھا، وہ گھر کے کچھ معاملات میں خود ہی دلچسپی لے لیتی تھی۔

بڑی نند ثمرین گھر سے زیادہ دور نہیں تھی اپنے دو بچوں کے ساتھ اکثر ہی آئی ہوتی، اتنے بڑے گھر کی ذمہ داری یک لخت وہ بوکھلا سی گئی اوپر سے نعیمہ کا ردابہ کے ساتھ کچھ خاص مشفقانہ رویہ نہیں رہا تھا، جس کا وہ میکے آ کر شکوہ بھی کرنے سے گئی۔

☆☆☆

ذیاج سے اس کی ملاقات ایک یونی فیلو کے طور پر رہی تھی۔ وہ اس سے عمر میں کچھ بڑا ضرور تھا لیکن ایک دو سمسٹر چھوڑ دینے کے سبب فی الوقت کلاس فیلو بھی تھا۔ ٹرپ سے واپسی پر جب اس نے تمام پکس مما کو دکھائیں، تو انہوں نے باقاعدہ ذیاج کی پک پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ لڑکا کون ہے......؟

انداز بہت چونکتا سا تھا جس پر منہل کی بھنویں پل بھر کو سمٹیں۔

(باقی اگلے ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

اور اب تو اماں کی سہیلیوں اور رشتہ کرانے والیوں کے توسط سے مٹن کے رشتے آنے لگے تھے۔ کسی ٹھیلے والے، تانگے والے، بڑھئی، موچی۔ حد تو حد ایک روز تو محلے میں رہنے والے پینسٹھ سالہ جگت چچا نے بھی رشتہ بھیج دیا جن کی بیوی کو مرے ہوئے بیس سال ہو چکے تھے۔ اس رشتے کے آنے پر مٹن تڑپ تڑپ کر روئی اس طرح کہ اماں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پھوٹ پھوٹ کر روتا ننو تو اپنی پلاسٹک کی بندوق لے کر اسی دم جگت چچا کو قتل کرنے تیار ہو گیا۔

''اماں میں شادی نہیں کروں گی۔ بلکہ مجھ موٹی بھینس سے کون شادی کرے گا۔ خدا کے واسطے تم یہ رشتہ لانے والی خالہ کو منع کر دو کہ میرے لیے کوئی رشتہ نہ لائے۔''

''تو کیا ساری عمر ہمارے ہی گھر بیٹھی رہے گی۔'' اماں کی آواز گیلی تھی۔

''اماں کچھ نہیں مانگوں گی تم سے۔ بس ایک چارپائی کے جتنی جگہ اور دو روٹیاں۔ گرمی سردی ایک ایک جوڑا۔ اس کے سوا کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''میں ہاتھ جوڑتی ہوں اماں۔'' اس نے روتے روتے ہاتھ جوڑ دیے تو ننو دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ البتہ اماں چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

چپکے چپکے دو سال گزر گئے۔ مٹن کا وزن پہلے سے بھی دو چار کلو بڑھ گیا۔ سارا دن گھر کے کام میں جتی رہنے والی، سوکھی روٹی چٹنی کھانے والی مٹن مزید موٹی ہو گئی۔ لیکن اس سارے عرصے میں مٹن کا کوئی رشتہ نہیں آیا۔ مٹن اب مطمئن تھی۔

اس کی خالہ اب کے پورے سال بعد ملنے آئی تھیں۔ مٹن نے گائے کے گوشت کا ایسا سالن بنایا کہ خالہ نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ سارا دن وہ کام میں جتی بھانجی کو دیکھتی رہیں۔ رات کو جب سب سونے کے لیے چارپائیوں پر لیٹ گئے تو خالہ مٹن کے سرہانے آ بیٹھیں اور لگیں ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ جب سب کے سونے کا اندازہ ہو گیا تو وہ بولیں۔

''بٹیا! ایک بات کرنی تھی تم سے۔''

''بٹ...... بٹیا...... یہ کیا کہہ دیا تھا خالہ نے۔''

آنسو ابل ابل کر اس کے تکیے میں جذب ہونے لگے۔ آواز سینے میں ہی گھٹ گئی۔

''بٹیا! آپا اور بھائی جان تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ تم شادی کے لیے مان جاؤ۔''

سسکیاں روکتے ہوئے مٹن نے خالہ کے ہاتھ تھام لیے۔

''ہاں بٹیا۔ ہمارے رشتے میں جیٹھ ہوتے ہیں۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کے بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ بچوں کی وجہ مجبور ہو گئے ہیں۔''

مٹن کی سسکیاں کراہوں میں بدل گئیں۔

''بٹیا! سرکاری نوکری ہے۔ روپیہ پیسہ زمین جائیداد نوکر چاکر کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس تم ان بچوں کی ماں بن جاؤ۔ بٹیا اللہ بہت اجر دے گا۔''

''خالہ بٹیا کہا تھا تو بٹیا سمجھ بھی لیتیں۔'' اس نے روتے روتے کہا اور کروٹ بدل لی۔

خالہ اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئیں۔ وہ دو دن کے لیے آئی تھیں لیکن ہفتہ بھر ٹھہر گئیں اور مٹن کو منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ہی گئیں۔

تیاری تو کچھ کرنی نہیں تھی۔ سب کچھ لڑکے والے کر رہے تھے۔ اس لیے پندرہ دن بعد کی رخصتی ٹھہرا دی گئی۔ رخصتی کی صبح تک مٹن گھر کے کاموں میں جتی رہی۔ وہ تو کام دھندے میں شام تک بھی رہتی۔ لیکن بھلا ہو خالہ کا جنہوں نے ڈپٹ کر اسے غسل خانے میں دھکیل دیا۔

رخصتی کے وقت سب ہی رو رہے تھے۔ نن سب سے زیادہ...... اماں ایک طرف نڈھال پڑی تھیں لیکن مٹن کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ اتنی خاموش تھی اس کے ہونٹ باہم یوں پیوست جیسے کبھی نہ کھلنے کا عہد کر چکے ہوں۔ اسی خاموشی وہ کار میں بیٹھ گئی اور سسرال پہنچ گئی۔

خالہ اور ان کی دیورانی اس کو ایک بڑے

نہاہت خوب صورت کمرے میں بٹھا گئیں۔ سسرال میں تو کوئی عورت نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آہٹ ہوئی۔ وہ گھبرا گئی۔ لیکن اس کے گھونگٹ میں جھانکتے دو معصوم خوب صورت چہرے تھے۔

"آپ ہماری ماما ہیں؟" ان کے یقین بھرے انداز پر اس کی گردن خود بخود اقرار میں ہل گئی۔

"سونو، مونو! دیکھو میں کہہ رہا تھا ناں کہ یہ ہماری ماما ہیں۔" دو چھوٹے چھوٹے تین چار سال کے بچوں کے منہ مزید اس کے گھونگٹ میں جھانکنے لگے۔

"یہ آپ نے نوز میں چوڑی کیوں پہنی ہے؟" ایک چھوٹے سے سفید ہاتھ نے اس کی نتھ کو چھوا۔ وہ جو جانے کتنے دن سے افسردہ تھی دلگیر تھی بے اختیار کھل کر مسکرائی۔

"دیکھا چچی نے کہا تھا ناں کہ دلہن تمہاری ماما ہیں۔ دیکھو ان کا رنگ ہماری طرح ہے بالکل وائٹ اور پنک نوز۔"

"ہاں، ہاں۔" چھوٹے چھوٹے تین سر تائید یں ہلے۔ ایسی تعریف...... ایسا نذرانہ...... اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ارے...... تم سب یہاں گھسے ہوئے ہو۔ کل کر بھاگو یہاں سے۔" خالہ جو بچوں کی چچی تھیں ان کو لینے جا پہنچی تو چاروں اس سے لپٹ گئے۔ اس نے بھی چاروں کو بازو پھیلا کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔ الہ دونوں فریقین کو راضی دیکھ کر واپس چلی گئیں۔

رات جس وقت سمیع احمد کمرے میں آئے تو اپنے بستر پر دئی ہوئی دلہن اور اس کے چاروں طرف سوئے اپنے سپوتوں کو یکھ کر ہولے سے ہنس کر اسٹڈی میں سونے کے لیے چلے گئے۔

بہت دن ایسا ہی چلتا رہتا لیکن تیسرے دن ہی ہوں نے دلہن کو اکیلے پا کر دھمکا دیا کہ وہ ان چاروں یطانوں کے ساتھ سونے پر سزا کی حق دار ٹھہرے گی۔ سے جاگ کر ان کا انتظار کرنا ہوگا۔ سو وہ اب اسٹڈی کے خر پر بیٹھی سمیع احمد سے نغمہ نامہ سن رہی تھی۔ اس کی خوب ورتی اس کے حسن کے قصیدے اس کی نزاکت اور خمدار مر کے قصے اتنے لمبے تھے کہ ان کو سنتے سنتے وہ سو گئی۔

یہ تو روز کا معمول ٹھہرا کہ پہلے چاروں بچوں کے ساتھ بیڈ پر پھر سمیع احمد کی اسٹڈی میں بچھی سیج پر سوتے جاگتے نغمہ نامہ سنتے ہوئے اس کی راتیں گزرنے لگیں۔ لیکن اب اسے نغمہ نامہ سننے کا بعد بھی جاگنا پڑتا کہ سمیع احمد کو اس کے مٹاپے کے ساتھ ساتھ جلد سونے پر بھی اعتراض تھا۔ نام انہوں نے بھی اس کا مٹن ہی لیا تھا کہ بقول ان کے اس کے سراپے کو دیکھ کر کچھ اور ذہن میں آتا ہی نہیں تھا۔

"نغمہ کی کمر تو ایسی تھی کہ ہماری مٹھی میں آجائے۔ اب تمہاری کمر تو کمرہ ہے بلکہ پورا سمیع ولا اس میں سما جائے تو بھی ختم نہ ہو۔ ویسے آپس کی بات ہے شادی والے لہنگے میں تم کیسے پوری آئی تھیں۔" سمیع احمد نے قہقہہ لگایا۔ لیکن اس کو اب رونا نہیں آتا تھا۔ اس کے چاروں بیٹوں نے اس کا دل مضبوط کر دیا تھا۔

☆☆☆

"ماما...... پیاری ماما۔ جلدی آئیں دیکھیں یہ بلو کیا کر رہا ہے۔" اس کے بیٹے نے گیند کھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ایک سالہ بیٹے کو اس کی گود میں ڈالا۔

"کیا کر رہا ہے میرا ابلا۔" اس نے پوتے کو اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ گزرتے وقت نے مٹن کو مزید موٹا کر دیا تھا۔ لیکن نہ اب اسے پروا تھی نہ اس کے چاروں شہزادوں کو جن کو اس نے واقعی شہزادوں کی طرح پالا تھا۔ کیا تھا جو سمیع احمد نے اس کی کوکھ سونی رکھی تھی۔ اس نے ان چاروں سے اپنی گود بھر لی اور مطمئن ہو گئی۔ وہ اپنے بچوں کے ذہن پر نیکی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ اعلا سرکاری عہدوں پر فائز اس کے بچے اس پر جان چھڑکتے تھے۔

چاروں بیٹوں کے ساتھ وہ درِ مصطفیٰ پر حاضری دینے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ پانچوں نے تین تین عمرے کر لیے تو اس نے دل میں ہلکا سا درد محسوس کیا اور چند گھنٹوں بعد وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ آنسوؤں سے تر چہروں کے ساتھ چاروں نے اس کا جنازہ یوں کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا جیسے پھول ہوں۔

ساری عمر موٹاپے اور وزن کا طعنہ سینے پر سہنے والی کا جنت البقیع میں جاتا جنازہ واقعی پھولوں کی طرح ہلکا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

بالو دشی

منعم ملک

دھاک کے تین پات

کشن گڑھ کی سرکنڈوں کے جنگلات اور کئی کئی قلعوں پر اُونگھتے بلا کے سبز کچور باغوں کی قید میں جکڑی بستی کے چوپال پر جمی محفلوں میں مسلمان، برہمن، کھتری، سکھ، ہندو دھرم کے لوگ سیاست، انگریزوں کی حکومت سے خار، ایکا ایکی کے ڈھنڈورے، فرنگیوں کی عیاری پر تھوکتے، جتے کی نے کو غداروں کی گردن گردان کر دانت گاڑھتے اور یونہی سر گھما کر دور سے نظر آتے ریسٹ ہاؤس کے وجود کو چتونوں کی زد پر رکھے سرِعام ہونٹوں کی منڈیروں کو غلیظ گالیوں سے بھر دیتے......تو کشن گڑھ کی اس بستی کے پہلو میں ہی برس روز سے بچھی جاتی خوف ناک گڑھوں والی مجروح سڑک پر گزرتی لاریوں سے برآمد ہوئے اور نشیب کو پچھاڑ کر...... جب سرکنڈوں کی کلغیوں کا گدلے پانیوں کی میلاہٹ نے کچھن نچوڑ کر دھرتی رنگ میں تبدیل کر دیا......اور کماد کی ساری مٹھاس بڑے بڑے چیونٹے چوس کر پھوگ کرنے لگے......تو اُفقی کناروں نے بھی روشنیوں پر پہرے کھول دیے، تب سرِشام ہی چوپال پر بڑی دیدہ دلیری سے چڑھ کر کوئی مسافر گرج کر کہتا تھا...... "عظمت کو بھی سلام اُس ماں کی سیند (مانگ) میں کہ جس نے غیرت کی نہایت کڑوی گولی نگل کر گبرو جنے......شہر کی خشک سرد سڑکوں کو انسانوں کے خون کے چلوؤں سے رنگا جاتا ہے اور عصمت ریزی کے حیواناتی مظاہروں پر آسمان بھی شرم کیے بغیر کھڑا رہتا ہے......شہر کی سڑکوں پر مسلمانوں کی لاشیں راہوں میں حائل کر کے لاریاں صبح و شام گزاری جا رہی ہیں، اور یہ تو رہے انسان......"

"ایک ہی دفعہ میں کہہ چکو......" بدلحاظ ہو کر چیخا۔

"دین کی طبیعت کا بھی کچھ یوں قصہ ہے کہ مقدس مساجد کی دیواروں پر سندوروں سے "وشنو جاپ" تحریریں جاوے ہیں اور مسجد کی چوکھٹوں پر ہنومان کے بت رکھوالی کے لیے رکھے جاوے ہیں اس بھونڈے مذاق میں کہ ان کی طاقت سے بچ کر

کوئی اندر بڑھ کر دکھادے...... میں بھی لاری چڑھتے ہوئے ایک کام تو کر ہی آیا......''

''تو نے کیا کیا......؟'' مجھے میں سانپ پھنکارنے لگے۔ بدلحاظی بڑھتی گئی۔

''میں نے باندا پی موڑ کے سب سے جفاکش منہاری کو ڈھونڈا اور اُس تک پیغام پہنچایا کہ بٹوارا ہونے سے پہلے پہلے تک بہترین قسم کے اتنے دستے تیار کردے کہ ہندوستان کے ایک بھی مسلمان کی کلائی ان چوڑیوں سے سونی نہ رہ سکے......''

کافی دیر بھور سے کی سی خاموشی ناچتی رہی اور کسی بھی

شور پر موت کے آثار رہے...... چوپال چڑھنے والا اُتر کر بستی کے قلب دندناتا گیا اور اصطبل کے گھوڑے ہنہنا کر اُچھلے۔ گلے میں پڑے جھانجھر ہلے ، مُرکیاں بولیں...... تو انسانوں کے حلقوں سے بھی چند الفاظ کھوٹے سکوں کی طرح برآمد ہوتے دکھے۔

"یہ سارا ملبہ اُن طلبہ کا ہے جو شر اُٹھائے گھومے ہیں، علی گڑھ کالج کے طلبہ کی بڑھتی جرتیں گرو کی قسم دلوں میں ناحق دیواریں کھڑی کرے ہیں......"

"کیا ہندوستان کیا پاکستان، اتفاق کا نعرہ بھی الاپتے ہیں اور دوغلی قوم جنم بھومی بھی ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں...... یہ سارا فساد اوتار کی کرپا سے ہی اب تھمے گا۔"

"بکواس بند کر اُوئے...... ہندوؤں جیسی مکار عیار قوم دنیا میں نہیں۔ خون پیتے ہو اور بکتے ہو کہ تمہارے دانتوں کے کیلوں میں سانس لیں جن میں انسانی گوشت کے ریشے پھنسے ہیں اپنا تھوکا تم لوگوں کی قوم چاٹے گی اور بہت جلد چاٹے گی، بٹوارا تو صاف نظر آرہا ہے، اسی تلملاہٹ میں یہ کھمبا نوچا جارہا ہے...... نعرہ تکبیر......"

ایک زوردار بھگدڑ مچ گئی اور اِکا اِکی اپنا منہ یونہی چڑاتی رہی جیسے کتے کے منہ سے گرے گوشت کے ٹکڑے رندی میں بنا اُس کا عکس چڑاتا تھا۔

گلیاں دھول اُڑاتی سنسان ہونے لگیں اور لوگ لہو ٹھنڈا کرنے کو کالی مرچیں گھول کے بے سود پیتے تھے...... 46ء چل رہا تھا اور آگے کی تاریخیں یوں قریب آتی جارہی تھیں مانو باقی وقت تو ماہ پوس بن گیا ہو...... تیزی سے سمٹتا اور پلک جھپکتے دامن چھڑا کر اونچے میناروں کے مندروں کے اوپر بہت پرے اور پرے......

اُس نے دروازے کے بالائی حاشیے سے کان لگا کر گلی کی خاموش چاپوں کو سنا تو بے طرح تڑپ کر چادر سر پر کھینچ لی۔ راستے اور مکان ایک دم سے پراسرار ہوگئے اور اتنے ٹھوس اور جامد کہ ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے...... دروازہ بھیڑ کر اُس نے قدم نکالے اور کلائیوں کی چوڑیاں شدت سے بج اُٹھیں۔ کھن کھن کھنک......

"آنندی......" وہ سہم کر پلٹی تو آنکھیں پھیلائی ہرنی لگی۔ وقت ظالم تھا اور انسان ظالم ترین...... کبھی پناہ دیتا تو اگلی کروٹ بڑے زناٹے دار لگتی۔ سمراٹھ اُس کا بڑا بھائی پیشانی پر غیرت اور شاید جواں مردی کی بھی سرخ نشانی ٹکائے اُسے عجلت میں ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

"کہاں جاتی ہو، شام ایشور کے جاپ میں گزارا کرو...... حالات بدتر ہوتے جاتے ہیں اور تو سمجھتی نہیں......"

"میں...... وہ......"

"ایشور کی سوگند سمراٹھ کی بہن کو کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا...... مگر تیری حفاظت میرا پہلا کرتوے ہے، دشمنوں کے چنگل توڑنے سے بہتر ہے وہ خالی ہی رہیں اور ناکارہ ہوجائیں۔"

وہ جلدی میں بھی تھا اور حکمت سے بھرا بھرا لگا۔ وہ سسک پڑی۔ اس لیے کہ وہ محفوظ تھی، اور اس لیے کہ اُس پر چنگل کسنے والے خود مرتے جاتے ہیں۔ اُسے اپنا بھائی زہر لگا۔ وہ اندر بڑھ گیا تو وہ تیزی سے گلی پھلانگ کر بستی کے کنارے پر آئی۔ کنویں کے پاس بچے گولیاں کھیلتے تھے مگر آج ندارد تھے۔ اُفق بھی کیا غضب ڈھا رہا تھا کہ لال لال ہوا جاتا تھا۔ یکا یک پنواروں کی اوطاق سے دو بچے نکلے تو پہچان کر وہ چلائی۔ بچے زیادہ رمز شناس تھے دو جست لگا کر آئے تو بنا منہ سے ایک لفظ نکالے اُس نے اپنا بازو سامنے کیا جس کی نازک و دودھ جیسی سپیدی میں ڈھلی کلائی میں سرخ چوڑیاں گنتی کی ہی رہ گئی تھیں...... لمحہ وہ ضائع نہیں کرتی تھی اور دماغ سے کم سوچتی تھی۔ ایک سرخ چوڑی اُتار کر اُس نے بچے کی طرف بڑھائی اور ہونٹ گول کر کے اُنگلی اُن پر رکھتے اشارہ کیا۔

"تابش بھیا......" بچے نے چوڑی ہتھیلی میں بند کی جواُن کی ہتھیلی سے باہر نکلے جاتی تھی "تابش باؤ...... تابش

Nagat Azeem

باؤ“ الاپتے ایک دوسرے سے آگے نکلنے لگے۔ یہ اُس کا خاموش اشارہ تھا اور ایک شاطر سا طریقہ۔

سورج اپنے سنہری کہرے سمیت پربت کی آغوش میں پناہ گزین ہوا، اور کائنات کو اُونگھ کے خیال سوجھنے لگے۔ وہ کھلیان میں پہنچی تو تابش باؤ کو پہلے محوِ انتظار پائی تھی۔ اضطراری کیفیت میں چوڑی بار بار ایک اُنگلی سے دوسری میں گھماتے ہوئے......

بہت پیاری مسکراہٹ نگاہ سامنے آنندی کو آسیب زدہ کرنے لگی۔ ٹھیک ایسے کہ جب وہ سفید کلیاں پرو کر گول دائرہ سر پر رکھتی تو جنات اس پر عاشق لگتے......اور سلیٹی بندیا بھنوؤں کے عین بیچ، مجال ہے جو پھر ادھر اُدھر ڈول جائے، لٹکاتی تو بے حجابی کی پاداش بہت سی نظروں پر سکتہ پھیرتی۔ یہ پاداش بہت کم اس لیے بھی بھگتنی پڑتی کہ اُس کا مسلمانوں والا پیراہن رکھ کر دھول جما دیتا تھا......آسیب زدہ خوب صورت آنندی......!

”تابش!“ اس کی سرگوشی خودکلامی ایسی تھی، صحرا میں جیسے مور سُر بلند کر دے۔ وہ مڑ کر اس کے پاس آیا، کھلیانوں پر سکوت رہا اور گھاٹ کی ویرانی چونک گئی۔ وہ نہایت سنجیدہ ہو گیا تھا اور دل ہولا دیتا تھا۔ آنندی کو سرزمین کے خدشے بجا لگے۔

”میں نے تجھے کتنی دفعہ کہا ہے بار بار مت بلوایا کر...... چوڑیاں تیری فساد کھڑا کریں گی تیرے بھائیوں کے نتھنے بو سونگھنے میں ماہر ہوئے جاتے ہیں، بتا رہا ہوں تجھ پر تو کڑی نظر بھی ہے۔“

”بار بار نہ بلوایا تو سوچتی ہوں کہیں بھول کر ہجرت نہ کر جاؤ، سچ کہتی ہوں انسان تو بے حس ہی ہوئے جا رہے ہیں۔“

”جھلی ہے تُو......“ تابش سلیم کے چہرے کے خطوط نرمی میں ڈھل گئے اور وہاں چاہت کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ ”ہجرت کرنی آسان کہاں ہوتی ہے، اور جس زمین پر جنم کے بعد کئی بہاریں دیکھی ہوں وہ ممتا کی طرح قدم بار بار زنجیر کرتی ہے......“

”تابش۔ تجھے سب جکڑ لے گا مگر ایک حاجرہ کی کسک نہیں جکڑے گی۔ میرا ذکر کبھی تیری گفتگو میں گھل سکے گا!“ شکوہ اس کے لبوں پر اتنا بھلا لگا جتنا کاجل آنکھوں میں پھیر کر حسن نکھارا جاتا ہے۔ تابش سلیم ہنس پڑا اور راج ہنس کے جوڑے پانی پینے گھاٹ پر اُترنے لگے۔ اس کی ہنسی بھی راج ہنسوں سی تھی۔

”تو مجھ سے کیا چاہتی ہے......؟“

”بٹوارا ہو جائے گا؟“

”ہو بھی سکتا ہے......“

”پاکستان چلے جاؤ گے؟“

”یہ بھی ہو سکتا ہے......“

”میرے لیے کیا آدیش ہے؟ کرپان سنبھال رکھوں یا میری لاج رکھو گے۔“ وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی۔ عورتیں بہت لاچار تھیں، ایک جھٹکے میں پسنے والیں۔

اس کے سسکنے پر تابش کی جان پر بن آئی...... تقسیم ہونے جا رہی تھی اور دل کہاں اس کے متحمل ہوتے ہیں۔ وہ آگے بڑھا اور شفق پر پھیلی لالی کی طرح اُس کے سرخ چہرے کو اُوپر اُٹھایا۔

”تابش سلیم مرد ہے اور اس کی زبان بھی مسلمانوں والی ہے...... تجھ سے پیماں باندھے بغیر بھی تجھے اپنا کہا ہے اور اس بات سے اب کون انجان ہے؟ تابش آخری سانس تک حاجرہ کے ساتھ ہے، تیرے بھائی بھی کیا چیز ہیں......؟“

وہ رونا بھول کر اس کی صورت تکنے لگی۔

”مجھے سمراٹھ سے بہت خوف آتا ہے، وہ مجھے وشواس گھاتی لگتا ہے تابی...... لیکن، لیکن تم لوگ یہاں سے کبھو مت جانا۔“ وہ پھر سے رونے لگی اور اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر وہ راہ تلاشتی رہی جو شاید کبھی بنی نہ ہوگی، اُمید ان کی زندگی میں وہ مسافر بنتی نظر آئی جس کی منزل ان راستوں سے گزرتی ہی نہیں تھی۔ تابش سلیم نے اُس کو بے چارگی سے دیکھا۔

”تو کیوں خوف کھاتی ہے پہلے کچھ کر سکے ہیں وہ......؟ وقت پڑنے پر جواب ہم بھی دیں گے۔“

"سمراٹھ سے محتاط رہنا تابش...... میرے جیون کی ڈوری تیری سلامتی سے جڑی ہے۔"

وہ اسے نجانے کیا کہنے آئی تھی، کچھ ہوشیار کرنے آئی تھی مگر ہمیشہ کی طرح وہ سب بھول گئی تھی جو سوچ کے آئی تھی۔ دماغ استعمال کرنا اُسے نہیں آتا تھا۔ بار بار ایک تکرار......

"اس بستی کو چھوڑ کر تو کہیں نہیں جائے گا۔"

وہ پھر ہنس پڑا۔

"کچھ بھی ہو جائے میں کہیں نہیں جاؤں گا...... حالات جیسے بھی پینترے بدلیں۔"

اُس کے الفاظ مغرب کی آذانوں اور مندروں سے بجتی گھنٹیوں کے ساتھ مل کر فضاؤں میں نقش ہو گئے۔ وقت شاید اُسے محبت میں چوڑیاں پہننے کی اجازت دے دے۔ سامنے کھڑی لڑکی کو اصولوں کی پٹیاں پڑھانے پر بھی رہتے وہی ڈھاک کے تین پات...... "کچھ بھی ہو ہجرت نہیں......"

☆☆☆

بالوشے

سورج کی سونے کی طشتری پربت کے اوپر چڑھ آتی اور اپنی باسی کرنوں کے لیپ اُونچی نیچی منڈیروں پر بڑی چاؤ سے کرتی۔ اُس سے لپٹتی تھی جو پجاریوں کی پرارتھنا، بھجن گانے کی آوازوں اور مندر کے گھنٹے پسِ نظر کرتی۔ پھرتیلی بلی کی طرح دیوار پر پنجے جمائے آدھا چہرہ آنکھوں تک باہر نکال کر میاؤں والے انداز میں سرگوشی کرتی تھی "بالوشے...... بالوشے......"

دیوار پار چھت کے اوپر بنیان میں، بان کی کھردری جھولتی چارپائی پر اُلٹا ترچھا لیٹا وہ بے پروا سا شخص...... جسے نہ ایک ٹانگ ایک طرف ڈھلکنے پر کوئی بے چینی تھی نہ بازو منجھی سے نیچے لٹکنے پر، بان کے نشان چہرے پر سرخ نقش و نگار چھوڑتے ہیں تو اُن کی مرضی...... ہم تو بیوپاری گھوڑے بیل بیچ کر سوئے ہیں۔ محبت کے بعد بھی بے ڈھنگے پن میں ذرا سی سلیقگی نہیں آسکی؟ وہ ناک چڑھا کر گھورتی اور پھر اپنی ہی بات کے گداز پن سے کھلکھلا کر نڈھال ہو کر رہ جاتی۔

"بالوشے...... بالوشے......" اُس کے کان کے قریب ہو کر ایک اور سرگوشی ہوتی اور اُس کے جسم سے اُٹھتی مردانہ مہک گھبرا کر پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیتی۔ وہ کسمساتا کہ یہ سرگوشی نہیں گویا جاگنے کا کوئی الارم لگا ہے۔ آنکھیں مسلتا ہوا سیدھا ہوتا اور پھر سورج کی سختی سے چندھیائی آنکھیں پکڑتا۔

"چین نہیں ہے تجھے، آنکھوں میں درد کرا دیا۔" اُٹھ کر قمیص بغل میں اڑسی اور وہ نیچے کو جاتا ہے۔ آنندی پیچھے لپکتی اور راستہ مل لیتی۔

"تو شرمندہ مجھے کیا کر...... خود احساس نہیں ہوتا، یہ رت جگے کہاں کے ہوتے ہیں جو دن کی دھوپ کا ہوش بھی کرائے نہیں کراتے؟" سکڑے ہونٹ، تیوری چڑھی اور بھنویں بھی اکٹھی ہوئی ہیں...... وہ گھورتا۔

"بیوی نہیں آئی میری۔ تو اپنے سوال بھی بند کر...... فارغ مخلوق۔"

"نہیں آئی جبھی بھونڈا پن طبیعت میں جگہ جگہ پڑا ہے، آجائے تو کوئی طریقہ ہی سمجھ جاؤ گے۔" وہ ناپسندیدگی سے اُسے دیکھتی اور جھولتی چارپائی کو...... بان کی ڈھیلی پٹیاں۔

وہ ہنس دیتا اور رازداری سے پوچھتا۔ "کھانا زمین پر پلتھی مار کر کھاتی ہو؟"

"ہاں......" ایک اور بھونڈی بات پر وہ حیرانی سے جواب دیتی۔

"سوتی بھی لکڑی کے پلنگ پر ہو؟"

"ہاں تو......؟" الجھن کے آثار۔

"کبھی یہ بستر بھی آزما کر دیکھو اس میں جھولنے کا تو مزا ہی الگ ہے...... اور کھانا اس پر بیٹھ کر کھاؤ، رکابی سے شوربا چھلک چھلک کر دامن بھگ دے تو لگے گا کھانا تو ہضم بھی ساتھ ہوتا جار ہے...... ہاہاہا۔" وہ اسے چھیڑ کر ایک زور دار قہقہ لگاتا اور وہ چیخ پڑتی۔

تابش ہنستا بھاگتا آگے اور وہ سیڑھیا

پھیلا نگتے نیچے آنگن میں اُتر جاتی تو تب احساس ہوتا تھا کہ کیا کر بیٹھی ہے۔

گھر آنا جانا تو یوں تھا کہ جوتوں کے ساتھ اندر چلے آؤ مجال نہیں کوئی ٹوک بیٹھے...... مگر اپنے گھر سے کود کر اُن کے آنگن اُتر آنا...... خجالت مٹانے کو پھر یہی ملتا کہ خوب تپ تپ کر تابش کی ماں سے اس کی شکایتیں کرتی۔ اور اس لڑکے کو پیدا کر کے اپنی سلیقگی اور رکھ رکھاؤ پر جو بٹا لگوایا تھا اس کا رونا روتی...... دل ہی دل میں ہنسے جاتی اور سرزمین کے ساتھ مل کر۔ گولا باری تب تک جاری رہتی جب تک کہہ نہ دیتی۔

''اچھا چھوڑ...... آئی اس لیے کہ بسم اللہ کے لڈو لائی تھی...... بالو شے۔''

''بالو شے...... تُو ناں کام کی بات آخر میں ہی کرنا۔''

وہ فوراً قریب آجاتا اور آنٹی بھی نہ ٹوکتی کہ پہلے منہ دھو کر آئے۔ بغل میں دبا کانسی کا چھوٹا سا ڈونگا اُس کی سمت بڑھاتی جہاں پسے ناریل کے سفوف میں لپٹے لڈو اُسے بہت رغبت کی دعوت دیتے تھے۔ ڈبا کھول کر وہ ہمیشہ ایک نظر اُس پر ڈالتا۔

''کھاؤ کھاؤ بسم اللہ کے ہیں......'' وہ ہنس پڑتی اور وہ مطمئن......

بسم اللہ کا قصہ بھی یوں تھا کہ، بلکہ ٹھہریے شروع سے شروع کرتے ہیں......!

شہاب الدین کے بھی آباؤ اجداد کشن گڑھ کی ویران دھرتی کو آباد کرتے ہوں گے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اکثریت میں مسلم آباد تھے۔ پھر دھیرے دھیرے ہندو، برہمن، کھتری، سکھ، چوہڑے، راجپوت بسیرا کرنے آتے گئے تو بستیاں ہی کلبلانے لگیں...... شہاب الدین (تابش سلیم کے ابا حضور) نہایت رعب وسطوت رکھنے والے اور اس پر غضب کے زمیندار تھے...... بستی کی گلیاں چھان کر کھلیانوں کو نکلو تو دور دراز کے کئی قلعوں پر مشتمل اُن کے رقبے حصے میں آئے اور کاشت کاری کے باوجود اتنی زمین بغیر کونپل نکالے پھر بھی بانجھ ہی رہتی کہ کوئی اس پر قبضہ کر کے اپنے حق میں کر لے تو شہاب الدین کی پیشانی پر شکن نہ پڑ سکے......

سادہ لوح لوگ، محبت میں گندھی فطرت اور کسی حسد، لالچ کو دل میں جگہ دیے بغیر سب ایک دوسرے کے ساجھی ہو گئے۔ گاؤں میں تھانیدار بدلتے، تحصیلدار آتے، نمبردار یا پھر فرنگیوں کی گوری میم صاحب کے عرصے بعد بھی بلا مقصد چکر، شہاب الدین کی حاکمیت پر کچھ اثر نہ پڑا تھا۔ گاؤں کے کئی مزارعوں، کسانوں اور متروں کی چولہا چکی آج بھی اُن کے دم سے چلتی تھی۔ اور وہ بلا کے سخی، چہرہ شناس، بامروت تھے۔

گاؤں کی سب سے اُونچی پیشانی والی حویلی اُن کی ہی تھی۔ پرانے طرز کی بنی پرکشش اور کشادہ اور اُٹھان میں مضبوط...... بازو میں ہندو دھرم کے لوگوں سے اُن کا یارانہ بندھ گیا۔ بھون لال اور کستوری...... کستوری میں ناز بہت تھا اور بھون لال میں انکساری کے درجے...... وہ زیادہ غریب تھے اور تھوڑے سے پُراُمید...... پھر شہاب الدین کے درشن نصیب ہو گئے تو بھولے ناتھ کے گوڈے گوڈے پرنام کرتے نہ تھکتے۔ بھون لال کمال کا ''حلوائی'' تھا......! ہر طرف سے سکون تھا اور خوشیاں تو اتنی سستی تھیں جیسے نئی نئی ہی ایجاد ہوئی کوئی چیز ہوں اور معمولی بھاؤ میں بٹتی ہوں۔

جیٹھ کا مہینہ تھا، شہاب الدین کی زوجہ پورے دنوں سے تھیں اور گامو کی دائی بیوی تو پہر پہر چکر لگاتی...... جیسے ان دنوں نیلے پروں والا سخت جان پرندہ مندروں کے اُونچے میناروں کے گرد چکر کاٹتا تھا اور مسجد کے دیواروں پر ابابیل حاضری دیتے تھے، گامو کی وہٹی کی پیروں میں ان سے کہیں تیز رفتار پھرکی لگی ہوتی۔ پھر قبل ہفتہ بھر وہ دہلیز پکڑ کر بیٹھ ہی گئی اور شام وسحر بی بی جی کے سوجن زدہ پیروں پر تیل سے مالش کرتی...... ٹانگیں دباتی، بال سنوارتی تب ایک شام لڑکے کی پیدائش نے اُس کی ساری محنت سفل کر دی۔

''چوہدری صاب کے گھر پر نعمت آئی ہے...... سنو...... اوئے لوکو سنو......''

حویلی کی آخری منڈیر پر چڑھ کر وہ حلق کے بل

چلائی اور تین بار جوش سے چلاتی ہی رہی تو گلزار دور سے ڈھول پیٹتا ہجوم کا ریلا لیے آنے لگا، ننکو سنگھ نے پھولوں کے ہار پکڑے، ایشر رائے اپنا دنبہ کھولتا ہوا بھاگا، اور بازو کے پڑوسی بھون لال تو دن بھر کی مٹھائیاں لا کر دالان میں ڈھیر کر چکے تھے۔

''بھون لال...... میرے یار اتنا سب؟'' شہاب الدین خوشی و خلوص کے اس سنگم پر سرخ ہوئے جاتے تھے۔ آنکھوں کے کانچوں میں ہلکی ہلکی اوس ایسی نمی......

''ہم ہی کہہ آئے تھے...... آج ضرورت لگتی ہے چم چم کی۔'' روفی نائی کی بیوی بھی پیچھے نہ رہی اور اپنا اندازہ فخریہ پیش کیا......

گھی کے دیے جلا کر دنبے کے گوشت، اور تندوری مکئی کی نرم روٹیوں سے رات کو مہمانوں کی تواضع کی گئی اور عمدہ پھل ہر ایک کے ہمراہ کیے گئے۔

کئی دنوں بعد کستوری کام کاج سے فارغ ہو کر اُن کی حویلی ننھے کو پچکارنے آئی تو شہاب الدین چہک کر بیگم سے کہتے۔

''سوچا تھا بیٹی ہو گئی تو......''

''ہائے چپ، لڑکی ہے ناں...... دو ہی تو لڑکے ہیں میرے۔''

''پر لڑکی تو ایک ہے نا...... خیر مقصد یہ تھا کہ لڑکی ہوتی تو نام رکھتا حاجرہ...... لڑکا ہے تو تابش دل کو بہت ہی بھاتا ہے۔''

''پر اس پر تو سلیم ہی سجتا ہے، میرا شہزادہ سلیم......''

''نہیں تابش......''

''نہیں سلیم......''

''میں نے کہا تابش''

''میں کہتی ہوں سلیم......''

''تابش سلیم......'' کستوری نے دونوں کے درمیان مداخلت کی تو دونوں نے چپ ہو کر دیکھا۔ ''کیا ہی سندر لگتا ہے، گیتا کے سنہری اکشروں سا...... اور حاجرہ، یہ تو کانسی گاگروں میں اُنڈیلی جاتیں چاندنیوں سا چمکے ہے، اتنا شیریں، اتنا سشیل......''

''کستوری بھابھی کو کیا ہوا ہے۔'' دونوں بحث بھول کر ہنس پڑے اور اُس کے سانولے چہرے کے نقوشوں سے پھوٹتی الوہی چمک کو دیکھنے لگے۔

پر کستوری نہ بھولی اور جو کام چوہدری شہاب الدین نہ کر سکے وہ ایک ہندو مہیلا کستوری نے کر دیا......

سمراٹھ اور اشوک کے جنم کے بعد سے کستوری کے گربھ نے لڑکی کو جنم دیا تو سمراٹھ اشوک سے کئی سال بڑا، اشوک تابش سے ایک سال اوپر اور لڑکی تابش سے دو سال چھوٹی تھی۔

بھون نے اُس دن مٹھائی بنائی بھی اور خود ہی بانٹی بھی، دل کھول کے کہ گھر میں ''لکشمی'' کا روپ لے کر دیوی آئی ہے۔ اب کٹھنائیاں دور، اور آسانیاں شروع......

بھون لال نے اُسے گود میں اُٹھا کر پیشانی چومی اور اعلان کیا کہ ''آنندی...... آنندی بھون لال......''

تلسی کے پودے کو غسل دیتی کستوری اس کی جلد بازی پر تلملا کر مڑی۔

''حاجرہ...... اس کا نام حاجرہ رکھتی ہوں میں ہاں......''

''حاجرہ......؟'' چوہدری صاحب نے بڑی حیرانی سے اقبال بیگم کو دیکھا۔ ''پر یہ تو ہمارا بڑا مقدس نام ہے۔''

''بچے بھی تو بڑے پاک ہوتے ہیں نا شہاب الدین باؤ...... کیا میری لڑکی آپ کے دھرم کے نام کے لیے بھی کم تر ہے؟'' کستوری کے سنجیدگی سے بھرے لہجے نے اُن پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ دونوں شش و پنج کا شکار ہو گئے۔ کستوری کسی طور مان کے نہ دی۔

''وہ بات نہیں...... شرمندہ کر دیا آپ نے بھابھی۔''

''شہاب بھاؤ۔ آپ کیا سنتے ہو اس جاہل کی...... دیکھ کستوری کیا حاجرہ کے ساتھ بھون لال اچھا لگے ہے؟ سمجھتی کاہے نہیں......''

''چپ بیٹھ بھون، ہمری مائی کہی ہے اُولاد پر پہلا

ادھیکار مائی کا ہووے ہے...... یہ نام کب سے من سے لگا کر رکھی ہے ہم، جس سمے سے اپنے تابش سلیم کا نام رکھے ہے باؤ، بھاوج نے ......اور اپنے نام کی چنتا کاہے کرے ہے تُو، اس کا نام ہے حاجرہ سلیم......" وہ اپنی ہی دھن میں تھی تابش پر نظر پڑی تو بے ساختگی میں کہتی گئی اور شہاب الدین، اقبال بیگم خوب ہی سٹپٹائے تھے۔ بھون لال بھی پھر نما نما مسکراتا رہا......

اتنے وقت میں اُن میں کبھی مذہب یا فرقوں کی بات نہیں چھڑی تھی، اسی لیے اس سے تو جیسے فرق ہی نہیں پڑا۔ اور آنندی شاید وہ پہلی بچی تھی جس کی زندگی کی شروعات ہی مسلمانوں کے مقدس نام سے ہوئی تھی باپ بھائیوں کے لیے وہ آنندی ہو گئی اور ماں کے لیے حاجرہ......

وقت دبے پاؤں آگے سرکتا اُن کے یارانے کو بل دے کر مضبوط کرتا گزرنے لگا۔ بچے دھیرے دھیرے بڑے ہونے لگے تو تابش کی دوسری بہن سرزمین، حاجرہ کی ہمجولی لگنے لگی۔ اشوک کی تابش کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ ہر وقت سائے کی طرح دونوں ایک ساتھ رہتے اور اپنے دوست مشترکہ بنا کر چلتے تھے......اُن کے دوست ہر مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ تابش کے مزاج میں کھلی نرمی اور خوش مزاجی اسے ہر ایک میں یکساں مقبول کر دیتی تھی مگر ان دونوں کی نسبت شاید بڑا ہونے کے سبب سمراتھ ان سے کھنچا کھنچا رہتا تھا......اُس کے دوست بھی ان سے الگ تھے اور مزاج بھی......

تابش اور اشوک ذہین، طبیعت میں شوخی مزاح اور شخصیت میں دلچسپ اور سلجھے ہوئے تھے......وہ سب ایک ساتھ اسکول جانے لگے۔ نہر پہ بچھے لکڑی کے پل کے پار، ناشپاتیوں کے جھنڈ کے پیچھے سرخ اینٹوں والا اسکول جس میں بیری کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر پڑھا جاتا تھا......

نہر کے اوپر کھڑا کیکر کا نوکیلا درخت تیز طوفان میں گر پڑا تو دوسرے کنارے تک ایک اور پل خود بخود بن گیا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اسکول آتے اور جاتے رہتے......پھر اسکول میں باقی بچوں کی طرح مٹی سے اَٹے ٹاٹوں پر چھینا جھپٹی یا لڑائی کرنے کے بجائے ایک ساتھ سکون سے بیٹھتے تو لگتا نہ تھا مخالف مذہب کے بچے ہیں۔

اُن کے والدین نے کبھی ان میں فرق کا کلمہ پڑھا ہی نہیں تھا...... پو پھٹنے کے بعد جب جنگلی گھاس پر سحر کے کہرے کی بالکل باریک سی لکیر منڈلا رہی ہوتی، اور اوس کے قطرے گلاب کی پنکھڑیوں کو بوسہ دے رہے ہوتے، اور درختوں میں دبکے پرندوں پر رزق اُترنے کا وقت ابھی باقی ہوتا وہ دونوں کھیتوں کی سیر کے لیے نکلتے تھے۔ ہرے ہرے کھیتوں اور ٹھنڈی ہوا کے رونگٹے اُٹھاتی لہروں کے سنگ اُن کی نظروں کی چمک تیز تیز ہوتی......اور جب دونوں کو شہاب الدین کا ملازم خاص بیل کی جوڑی جت کے حوالے کرتا کہ وہ اس پر چڑھ کر ہل چلائیں تو بیلوں کو قابو کرتے بھاگتے دوڑتے آگے پیچھے ہوتے اُن کی چھاتیاں کسی کڑیل نوجوانوں کی طرح اُبھرنے لگی تھیں......اور کاٹھی مضبوط، اچھی اور خالص غذا تو اُٹھان، رنگ و صحت پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ لڑکپن میں ہی تابش سلیم کی وجاہت پر نظریں بھٹکنے لگی تھیں۔

پھر جب معمول سے فارغ ہو کر دونوں مسجد کے راستے پر جاتے تو دہلیز تک جانے پر تابش چوکھٹ پار کر جاتا اور اشوک باہر رکا بس مسکرا کر رہ جاتا۔ قرآن پڑھنے پر دونوں کی راہیں تبدیل ہو جاتیں اور پاؤں مخالف سمت گھوم جاتے......

لڑکیوں کا قصہ مختلف تھا۔

حاجرہ، سرزمین اور باقی لڑکیوں کے ساتھ مٹی کے برتنوں سے کھیلتی، اُنہی کی طرح سادہ شلوار قمیص اور لمبی سی اُوڑھنی لے لیتی، اضافہ صرف ایک ہوتا......بھنوؤں کے بیچ کی سلیٹی بندیا۔ قرآن پڑھنے بھی مولوی کے پاس اُن کے ساتھ ہی چلی جاتی، کسی کو خبر بھی نہ ہوتی اور وہ دو مذہب کی پیروکار بننے لگی۔

اور ہاں وہ بسم اللہ کے لڈو......

سمراتھ کا بہت کم عمری میں اپنے چچا رام لال

کی لڑکی پاروتی سے آنکھ مٹکا چلا تو کستوری نے شبھ جان کر بیاہ میں تاخیر نہ دکھائی۔ پاروتی اپنے نام جیسی ریشمی روئی سی بنی تھی۔ سرخ ساڑھی میں لپٹی ماتھے تک پیازی رنگ و سرخ پٹیوں والا لمبا دوپٹا مانو اندر چاندنی بکھری ہو۔ نزاکت سے لال پیروں سے گلش گرانے اور گلال میں پاؤں دھرنے سے لے کر سادہ فرش پر اپنی آمد کے نقش چھوڑتی، پائل کی چھن چھن میں اُس کی ایک ایک ادا مسحور کن...... جہاں بیٹھتی چاندنی کا ڈھیر لگتی۔ پھر اسی سال بیٹا بھی ہو گیا تو سر اٹھ غرور سے دندناتا پھرتا تھا۔ (حاجرہ تب پندرھویں برس میں لگی تھی) بھون لال نے پوجا طاق میں سجے ایشور کا دھنے ہو کر مٹھائی شہاب الدین کی حویلی روانہ کی۔ حاجرہ بہت خوش ہوئی...... بالوشے کے لڈو خاص رکھ لیے، تابش کو وہ بہت پسند تھے۔

پر اُس دن نجانے کیا ہوا تابش ہاتھ بڑھاتے جھجک گیا۔

”حاجرہ یہ پرشاد کے لڈو ہیں؟“

”ہاں پر تجھے کیا ہوا ہے؟“ وہ حیرانی سے اُس کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں، ایسے ہی پوچھا ہے...... آج رہنے دو میرا معدہ گڑبڑ کر رہا ہے میٹھا کھاؤں گا تو......“

وہ اُس کا گریز سمجھ گئی۔ سمجھ کے خاموش ہو گئی۔

پھر کئی دنوں بعد واپس آئی تو تابش کو شرمندہ کر گئی۔

”میں نے ابا سے بالوشے بنانا سیکھ لیا ہے...... اب تو کھا لے معدہ گڑبڑ نہیں کرے گا، بسم اللہ کے ہیں......“

”بسم اللہ کے......؟“ اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے پوچھا۔ دھوپ اُس کی گلابی اور شفاف رنگت کو مزید واضح کر رہی تھی۔

”ہاں، بسم اللہ پڑھ کر تیار کیے ہیں...... اب سے ایسے ہی بنایا کروں گی۔“

تابش کے چہرے پر محبت کے اتنے رنگ بکھر گئے کہ اُن کو شمار کرنے کی ہمت وہ خود میں نہ پاتی تھی۔ دونوں کی نظریں جھکی جھکی رہنے لگیں اور لب میٹھا میٹھا مسکاتے۔

تابش کے تعلیم کے بعد اپنے شوق تھے۔ گھڑسواری، کبڈی، نیزہ بازی وغیرہ جیسے کھیل اُس کے مشاغل تھے۔ کئی بار اپنے گھوڑے پر اُس نے حاجرہ کو ساتھ بٹھا کہ وہ مظاہرے دکھائے کہ چیخ چیخ کر حاجرہ کا خوف سے پھر مزے سے گلا بیٹھ گیا تھا۔

کڑاکے کی سردی پڑتی، دبیز کہرے کی تہ جمی ہوتی یا بارش کی بوچھاڑ...... تابش کی گھڑ دوڑ دیکھنا اُس کا مقصد حیات بن گیا۔ وہ چھپ چھپ کر اس کے بہت سے کھیل دیکھنے جاتی۔ بچپن میں ہاتھ پکڑ کے اسکول جو جانا ہوتا تھا، لڑکپن آیا تو پردے والے تانگے پر پکی پُل کا لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ سیر بھی ہو جاتی، ذرا سا دور بھی پڑ جاتا مگر پردے کا خیال ہو گیا تھا۔ حاجرہ کو وہی کام بلاوجہ اچھا لگتا تھا جو تابش کرتا تھا۔

کچھ برس مزید بیتے...... کشن گڑھ سے دور پنگھٹ سے پہلے مموال کے قصبے میں میلے سجتے تھے۔ مقابلہ بازی وہاں کی شان تھی...... اور یہاں اقبال بیگم یعنی تابش کی والدہ حضور کا میکا آباد تھا۔ لڑکیوں کے کان میں بات پڑی تو پس پردہ وہ لڑکوں سے پہلے تیار ہو گئیں۔ مقابلے تھے تو تابش یااشوک لازمی جاتے۔

”والدہ...... مموال سے چھمی کی چٹھی آئی ہے فیکے کے ہاتھوں...... جی اُداس اور طبیعت کی ناگواری کے واسطے یاد کر رہی ہے۔“ سرزمین نے نرم و سپید اُنگلیوں پر غضب ڈھاتے ہوئے اُنہیں بار بار مروڑا اور نظریں جھکائے رکھیں۔ چھمی اُن کی موسیری بہن تھی۔

”ہائے میں مری، کہاں ہے فیکا روکا نہیں اُسے...... حال تو پوچھ لیتی میں؟“ اقبال بیگم تڑپ ک گئیں تو وہ تیزی سے بولی۔ ”شہر ملازمت کے ل جا رہا تھا تو کھڑے پاؤں ہی پیغام دے گیا۔“

”اچھا تابش کو ہمراہ کرتی ہوں، عبیرہ سے بھ جا کے کہہ......“

اماں نے تو مان ہی جانا تھا، حاجرہ بھی ضدی تھی۔

پچھلے سوموار سے ڈھول پیٹے جانے لگے تھے

میدانوں کی صفائیاں شروع ہو چکی ہیں، اور نمائشیں میخیں کھڑی کرتی ہیں۔ تینوں لڑکیوں کے لیے پالکی تیار کرادی گئی۔ رات کا سفر شروع ہوا، مموال کے ٹیلوں کے بیچ نہ جھرنے تھے، نہ اُونچے اُونچے پربت اور وہ لمبی لمبی خودرو گھاس جس پر جگنو بیٹھتے اور شبنم الجھتی اور نہیں تو ہوا ہی ستا کے کوئی ارتعاش پیدا کردیتی۔ بس لالٹینیں اور مشعلیں روشن تھیں، اور مختصر سا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مٹی ہی مٹی کے غبار اور پیروں تلے آتے پتھروں کی کھٹ پٹ......

استقبالیے میں آگ کے الاؤ روشن کر کے محفلیں آباد کی گئیں۔ پیالوں میں گڑ والی چائے لکڑیوں پر پکا کر پیش ہوئی۔ تابش اور اشوک ساتھ ساتھ ہوتے تھے...... ان کے بھی ساتھ گئے اوطاق پ باجے گرم رہے۔

اگلی صبح میلے کی رونق جوبن پر پہنچی ہوئی تھی۔ ہ کی بات پھمی کے بھائی فیکے سے ٹھہری تو بچپن گزرے، ہاں اہم وقت پر کام آگئی کہ مجبور کرنے پر وہ اُنہیں شام میں میلہ دکھانے لے گیا۔ تابش دراز قد کا مالک، اُبھری چھاتی اور نکلے شانوں والا مضبوط مرد لگتا تھا۔ میدان اُن کے بھی مقابلے سے سجا مگر راٹھ بھائی کا سن کر حاجرہ کا دم خشک ہو گیا۔

"گھڑسواری اور نیزے بازی میں اپنا تابش مار گیا ہے...... مگر دنگل کے لیے سمراٹھ میدان میں گا۔" فیکے کی معلومات پر وہ دل تھام کر رہ گئی۔

"ہے ایشور، سب خیر رکھنا۔" ایشور خیر کیا تا۔ حاجرہ نے جو خیر مانگی وہ ہو نہ سکی۔ تابش سمراٹھ بھائی کہتا تھا، وہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ہار بھی نہیں تا تھا

نگل شروع ہو گیا۔ اشوک کے ساتھ باقی وں نے بھی مل کر دونوں طرف سے نعرے تابش تو ہنستا رہا مگر سمراٹھ کی آنکھوں میں تی تھی۔

"بھائی یار۔ میں ہار جاؤں گا...... جیت کسی کی گی۔" تابش نے ہاتھ کھڑے کر کے محظوظ کن مسکراہٹ سے اُسے روکنا چاہا۔ سمراٹھ حقارت سے ہنس پڑا۔

"اوئے، چل چاچے شہاب کے ٹکڑوں کی طاقت دکھا، مرد منہ پھیر کر جاتے ہیں تو پہلے اپنی نامردی تسلیم کرتے ہیں......"

تابش کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ بات عزت پر آگئی تھی کافی دیر تک زور دار مقابلہ چلتا رہا اور وہ جوش کے نعرے پڑے کہ حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔ سمراٹھ کو اُس نے پچھاڑ دیا...... پھر ہنس کر دوستانہ انداز میں اُسے یوں کھڑا کیا جیسے کسی بچے کو تنگ کرتے کرتے پھر پیار کرتے ہوئے جانے دیتے ہیں۔ اور تو کسی کو محسوس نہ ہوا مگر ہتک کا شدید احساس تھا جس نے سمراٹھ کی رگ و پے میں چنگاریاں بھر دیں...... اور کسی سے بھی ہار منظور ہوجاتی مگر ایک مسلمان سے......؟ سمجھیں سمراٹھ کی چڑ یہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔

میلے سے لوٹنے پر تابش سلیم کا سینہ مزید پھولا ہوا تھا اور اشوک، فیکے کی گردنیں تنی تھیں...... اشوک نے خوب اچھل اچھل کر تابش کی صلاحیت کی داستان گوش گزار کی اور حاجرہ دانتوں میں اُوڑھنی کا کونا دبائے دل ہی دل میں بلائیں اُتارے جاتی تھی۔ سفر کا چارہ کرتے وقت تابش نے نظر بچا کر ایک سرخ کانچ کی چوڑیوں کا دستہ حاجرہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ سرزمین نے چوری پکڑ لی اور حاجرہ کو بڑی معنی خیز نگاہوں میں تولتی بولی۔

"واہ! کیا طریقہ پیدا کیا ہے بھائی نے...... تجھ پر رشک آرہا ہے۔"

"کیوں ایسا کیا ہوا ہے......؟" وہ چوڑیاں چھپاتے ہوئے استفہامیہ بولی۔ تابش کی بے ضرر سی چیز بھی اُس کے لیے زندگی سے بڑھ کر تھی، پر سرزمین کو کیا ہوا تھا؟

"تجھے واقعی نہیں پتا اس میں کیا خاص بات ہے؟" وہ قل قل ہنستی معصوم سی آنکھیں پھیلائے اس کی بے خبری پر افسوس کرنے لگی۔

"خاص کیا ہے......؟"

"کہتے ہیں حضرت پیر کے دربار کے قریب سے جس کا نام لے کر لال چوڑیاں خریدی جائیں...... اُس جوڑے کی اللہ کی رحمت سے شادی ہوجاتی ہے، بھائی کو تو خوب پتا ہے۔"

سرزمین کی توجہ سے بات سننے پر اُسے لگا کشن گڑھ کے گلابوں کے سارے کھیت اُس کی دل کی پگڈنڈی پر نچھاور ہوگئے ہیں اور اُن پھول کی پتیوں کے نصیب میں تابش کے قدموں سے لپٹ کر ہی مرجھانا لکھ دیا گیا ہے۔ اُسے اپنے گال، گلال کی حدت سے دہکتے محسوس ہوتے رہے۔ کبھی اُن میں کوئی قول و قرار نہیں ہوا تھا...... کوئی واضح رمز، کسی بات سے کوئی سبیل اور نہ کسی عمل سے کوئی ٹھکانا ہوا تھا...... پھر بھی اس سب کی نجانے کیوں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اس بات میں نجانے کتنی سچائی تھی، پر بات تھی بہت خوش گوار۔ وہ پردے کی اوٹ سے گھوڑے پر سوار تابش کی پشت کو تکتی رہی اور خوش ہوتی رہی...... اور پھر اچانک دھکا لگنے پر وہ اُچھلی، پُل کے قریب اُس کا بازو وا ہوا اور بغل سے چوڑیوں کا دستہ پھسل کر گھاٹ سے ٹکرایا اور ندی میں بہہ گیا...... حاجرہ کا دل پھٹا، صورت کالی سیاہ ہوگئی...... اگلے کئی پہر وہ منہ چھپا کر اُن چوڑیوں پر روتی رہی تھی...... دل میں دو دھاری وسوسے، اور خدشات بیٹھ گئے۔

تابش سلیم کے پاس فخر و غرور کے لیے بہت کچھ تھا۔ حاجرہ سلیم کے پاس فخر کے لیے صرف ایک تابش......!

☆☆☆

گلاب زادی

برکھا کے بعد زمین نے خوب بھڑاس نکالی، شاہ خاور نے چابک دستی سے زرد تاروں کا جال پھینک کر فضاؤں کی خوشگواریت چھین لی، اور ہوا کو یکجا کرکے گھٹن کا سماں پیدا کیا۔ کیلے، کھجوروں، سنگترے اور سفیدوں کے پیڑ جامد ہوکر سر نیہوڑے کھڑے تھے۔ گھٹن ایسی بڑھی کہ پھل پک کر تیار ہوگئے......

شہاب الدین نے اپنے باغوں سے اُترا عمدہ پھل علیحدہ کیا اور حصے بنا لیے۔ پھر ایک بڑی ٹوکری میں پھل ڈال کر بھون لال کے گھر کی طرف چل دیے۔ کستوری اور بھون لال پریشان سے بیرونی دیوار سے ملحقہ کمرے میں بیٹھے تھے جس کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی...... شہاب الدین گلی سے گزرنے لگے تو دونوں کی مایوسی میں ڈوبی آواز سن کر ٹھٹک گئے۔

"کستوری...... تُو ہی بتا گھر آئے مہمان کو کس منہ سے روکیں کہ ہمارے اپنے بھوجن کے لالے پڑے ہیں...... ایک دو روز بعد کی بات ہوتی تب بھی کچھ نہ کچھ ہوجاتا مگر آج شام ہی وہ پہنچتے ہوں گے۔" بھون لال کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا کھا رہا تھا۔ شہاب الدین جم کر کھڑے رہے۔

"حاجرہ کے باپو، تُو کہے تو کہیں سے مدد مانگ لیتے ہیں، ایشور کی مہربانی سے سارے ہی تو یہاں اپنے ہیں......" کستوری کی بات پہ وہ سوچ میں ڈوب گیا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہ آتا ہو۔ پاروتی اُنہیں چائے دینے آئی تو بھون بگڑ کر بولا۔

"سمرا تھ سے جا کر کہہ اب آوارہ گردیاں چھوڑ کر کوئی روزی روٹی کرے...... برکھا سے جو نقصان ہوا گندم تو ساری بہہ گئی، جو بچی وہ سوکھی نہیں اب کیا فاقے کریں......"

پاروتی اُس کے غصے سے گھبرا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

شہاب الدین ایک دم ساری بات سمجھ گئے...... گندم مٹی کے ڈرموں میں ڈالنے سے قبل دھوپ لگوانے کے لیے چھتوں پر ڈالی جاتی۔ گزشتہ دنوں ہوئی طوفانی بارش سے شاید اُن کی گندم چھت سے بہہ کر صحن میں بکھر گئی تھی۔ شہاب الدین کچھ سوچتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو حاجرہ نے بڑھ کر سلام کیا۔

"جیتی رہو۔ آؤ بھئی بھون۔ یہ کچھ پھل رکھو...... اور آج، آپ سب کا شام کا کھانا ہماری طرف ہے۔ آپ کی بھابھی نے کچھ اہتمام کیا

ہے۔“

”کھانا......“ بھون نے بے یقینی سے اُنہیں دیکھا۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ ”دھنے واد شہاب الدین بھاؤ مگر ہماری اپنی طرف کچھ دوست آرہے ہیں......تو آپ کی طرف پھر کسی دن......“

وہ اُس کی خودداری پر مسکرائے۔

”یہ تو اور اچھی بات ہے، مہمانوں سے ہمارا بھی دل بہل جائے گا تو بس طے ہوگیا ہے۔“

”ہاں پر یہ ہے کس خوشی میں......؟“ کستوری نے سکون محسوس ہوتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

”تابش میلے کا کوئی مقابلہ نہیں ہارا الحمدللہ...... یہ اُسی خوشی میں ہے۔“ اُنہوں نے عاجزی سے بتایا۔

مگر سمراٹھ کے چلتے قدم رُکے، حلق میں کڑواہٹ بھر گئی۔ پتاجی کے سامنے بے عزتی کرنے کے لیے، مکار لوگ) شہاب الدین حاجرہ کو ہاتھ بٹانے کی غرض سے لے کر چلے گئے......شام کو مہمان بھی آگئے، کھانے میں کچھ دیر باقی تھی۔ بھون لال سمجھ گیا کہ یہ سب اُن کے لیے کیا گیا ہے۔ کھانے کے ساتھ اقبال بیگم نے آلو بخارے کا حلوہ بھی بنایا، عبیرہ اور حاجرہ نے انار دانے اور پودینے کو سل پر پیس کر چٹنی تیار کی، سرزمین نے میٹھی چھاچھ بنائی۔ دنبے کا شوربا پیش کیا گیا، بھابیوں نے دادی کے ہاتھ سے بُنا سب سے خوب صورت میز پوش بچھا کر برتن لگائے اور باتوں میں لگا کر بیٹھ گئیں......کھانے کے بعد قہوے اور گڑ والی چائے رکھی گئی۔ بھون لال اور کستوری نہایت خوش ہوئے۔

حاجرہ نے سب کو مشغول پایا تو چپکے سے سیڑھیاں چڑھ کر تابش کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کتابوں کے ڈھیر میں کچھ تلاشتا تھا۔

”آہم......کہیں جانے کی تیاریاں ہیں؟“ وہ ہاتھ باندھے فرصت سے اُسے دیکھنے لگی۔ تابش مڑا اور اُسے دیکھ کر سیدھا ہوا۔

”ہاں ایک جلسے میں جانا ہے دوستوں کے ساتھ......“

حاجرہ ہاتھ پشت پہ باندھے دو قدم آگے آئی۔

”بہت تعریفیں سنی جا رہی ہیں جناب کی...... لیکن ابھی بھی کچھ کمی سی ہے۔“

”لوگ جو بھی کہیں، آپ کے نزدیک تو کمی بہرحال ہر دفعہ رہے گی۔“ وہ شریر سا ہو کر مسکرایا۔

حاجرہ سنجیدہ سی ہوگئی۔

”ایسا ہے کیا...... پر کیوں؟“

”کیونکہ گلاب زادی کے شایانِ شان کوئی کب ہوسکتا ہے......تو کمی تو رہے گی۔“

ہاں اور وہ کمی بس یہی ہے کہ......“ وہ آگے آئی۔ دو قدم کا فاصلہ رہ گیا، تابش کو اُلجھن نے گھیرا اور اُس کے ہاتھ ہوا میں معلّق ہوئے۔ ”تمہیں نظر بھی لگ سکتی ہے، لیکن اب نہیں لگے گی...... ہاہاہا“ تیزی سے ہاتھ اُس کے چہرے پر رگڑتے ہوئے وہ قہقہہ مار کر بولی۔ تابش فوراً پیچھے ہٹا تو وہ بھاگی۔ اُس کے ہاتھوں پہ لگی ساری سیاہی اُس کے چہرے پہ اُتر آئی تھی۔

”بے وقوف...... جاہل...... پاگل۔“ چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ چلایا پھر خود بھی ہنسنے لگا۔

اس کے بعد یکایک چین لکھتے راوی کے قلم کی نب کو کہیں سے اٹک لگی اور لفظ مڑ سے گئے۔ اپنے گھر بیٹھے بھون لال اور کستوری کہہ رہے تھے۔

”کتنا دھیان ہے شہاب بھاؤ کو سب کا ہماری عزت رکھ لی......اور اپنا تابش بھی کتنا سمان دیتا ہے حاجرہ کا جھکاؤ بھی ہے، دھرم آڑے نہ آتا تو اپنی حاجرہ کا بیاہ حویلی میں کر دیتے۔ ہماری عزت بھی بڑھ جاتی......حاجرہ بھی سکھی رہتی۔“

”ماں! ایک لفظ اور نہ کہنا......“ کسی پل دروازے سے داخل ہوئے سمراٹھ کی دھاڑ نے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے۔ حاجرہ رسوئی میں تھی، چولہا چھوڑتی رسوئی کی جالی سے جھک کر جھانکتی ہے...... سمراٹھ کی نفرت انگیز آنکھیں اور چہرے پر پھیلے گستاخی کے تاثرات......

"کیا بکتا ہے سمراٹھ، بڑوں کے منہ چڑھنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔" بھون لال نے بھی گرج کر کہا۔ پاروتی سہمتی ہوئی سمراٹھ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

"میں کہتا ہوں باپو، اُس نیچ ذات کے لڑکے کا نام دوبارہ اپنی زبان پر مت لانا...... وہ ہمارے دھرم سے انکاری ہیں، ہمارے ایشور کو فضول چیز جان کر نگاہ بھر نہیں دیکھتے اور تُو اور ماں...... ان ہی کے راگ الاپتے ہو۔ جا کر باہر دیکھو کیا ہو رہا ہے مسلمان اپنی اوقات پر اُتر آئے ہیں...... برصغیر کو ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں، ان کے رویے میٹھی چھریاں ہیں جس سے وہ ہماری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اور تُو اُن کمینے خاندانوں میں......"

سمراٹھ کف اُڑا رہا تھا۔ بھون کستوری حیرت سے اُسے دیکھتے تھے اور حاجرہ کا رنگ ہلدی کی مانند زرد پڑ گیا تھا۔ اُسے اپنی جسم سے جان نکلتی واضح محسوس ہوئی۔

"بکواس بند کر اُوئے...... آنندی کے ماں باپ ابھی زندہ ہیں اور اُس کے بارے میں آدیش دینے کا حق بھی رکھتے ہیں، تیری آخر کیوں مانیں گے ہم؟" بھون کے ہونٹ زرد خشک پتے کی مانند کپکپاتے تھے۔ سمراٹھ کا لہجہ توہین آمیز تھا، اور الفاظ ناقابلِ یقین......

"ماننی تو پڑے گی...... اور تم دونوں خود مانو گے، آنندی کے بیاہ کے لیے میں نے لڑکا دیکھ لیا ہے......" اُس کا انداز ٹھنڈا، مضبوط اور بہت پُراسرار ہو گیا۔ اتنا کہ وہ دونوں کچھ بول نہیں سکے اور خوف سے حاجرہ کی آنکھوں میں سراسیمگی بھرتی گئی۔ حالت ایسی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... اُس کے دھیان کے وہ سارے سندر سپنے جہاں وہ تابش کے ساتھ ہاتھ پکڑے چاندنی کو پکڑتی تھی، اور دن کی روشنی میں تابش پگھلا سونا اُس کی مانگ میں اُنڈیل دیتا تھا...... وہ کانسی کی بالٹی میں پانی بھرتی اور تابش چپکے سے کنواں چلانے لگتا تھا۔

رسوئی کی گھٹن زدہ فضا سے باہر نکل کر اُس نے چاروں اور خالی خالی نگاہیں گھمائیں تو مٹی کے کتنے ہی خاکستری گھر اُسے اجنبی اور غیر مانوس لگے تھے...... کشن گڑھ کی یہ گلیاں تابش سلیم کے قدموں کی دھمک اور حویلی کے لوگوں کی موجودگی سے خالی ہو جاتیں تو اُس کی زندگی "نرک" کی وہ منزل ہوتی۔ جہاں سے آگ کی بس شرر، شرر زبانیں نکالتی آواز آتی اور انسانی جسم کے جلنے کی سڑاند...... اور کچھ بھی نہیں۔ آنندی یا حاجرہ کی زندگی بے سکون ہو کر گزرنے لگی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب چھوٹی چھوٹی تحریکیں کھل کر چلنے لگیں۔ اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے تقسیم کے خواب مسلمانوں کی جاگتی آنکھوں نے دیکھے اور عظیم لوگوں نے اپنی ہمت، صلاحیتوں، جواں مردی اور اللہ پر اندھے یقین کو پل صراط بنا کر اس پر چلنے کے لیے کمر کس لی...... اللہ کے نائب انسانوں کی اللہ نے بھی پھر اس قدر مدد کی کہ بظاہر بے جان نظر آتے الفاظ مگر شاعروں کی شاعری میں ایسی قوت پڑی کہ برصغیر کے عوام کو جڑ سے ہلا کر رکھ گئی۔ یہیں سے یک لخت ہوائیں پھر گئیں، اور ان میں ٹھنڈک کے سوا بھی کچھ شامل ہوا۔

علی برادران کی تحریک خلافت نے زور پکڑ کر مخالف قوم کی خوش فہمی کو ٹھکانے پر لگا دیا۔ وہ خواب، خیال، نظریہ جسے ہنس کر اُڑایا جاتا رہا...... وہ خرگوش کو اپنی طاقت کے نشے میں چور پا کر رینگتا رینگتا منزل پر رواں دواں ہو چلا...... کبھی پسپا ہو جانے کے ڈر سے اس کے مقابلے میں مخالف تحریکوں کی آگ بھڑکائی گئی۔ اور باقاعدہ شازشوں اور فریب کاریوں کا آغاز شروع ہوا۔

سمراٹھ بھون لال نے اس کام میں سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ سمراٹھ نے کشن گڑھ کے ہندو، سکھ نوجوانوں کو خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا اور مسلمانوں کے خلاف زہر بھرنا شروع کیا، سمراٹھ کا مقصد ایک اور بھی تھا اور اُس کے ارادے اُوپر تک

کے تھے...... اسے اپنی اب تک کی عمر میں بھی شہاب الدین خاندان کی جی حضوری اور رعب میں آنا بھی پسند نہیں رہا تھا۔ اور مسلمانوں کے ہاتھ میں حکومت دیکھنا تو کسی صورت گوارا نہیں تھا...... اس تحریک کے ذریعے اندر ہی اندر مسلمانوں کے لیے محاذ کھڑا ہونا شروع ہوگیا۔ اور دولت کی لالچ کا مارا وہ انگریز کے ساتھ اپنی چالاکی سے ہوگیا...... بھون لال اور کستوری کو خبر نہیں تھی کہ اُس کی بڑی اولاد خصلت و اطوار میں اپنی قوم پر چلا گیا ہے......!

پھر 1945ء کے اختتام اور 1946ء کی شروعات کے ماہ انتخابات منعقد ہوئے...... تو اپنے دوستوں کے ساتھ تابش سلیم نے شوقیہ شرکت کی اور دوسرے علاقوں سے انتخاب لڑتے مسلم اُمیدواروں کے لیے گھر گھر کے کواڑ کھٹکائے...... ان انتخابات کی سو فیصد کامیابی نے برٹش حکومت تک کہ جو ہوش اُڑائے وہ اُڑائے، تابش سلیم نے مخالفوں کی نگاہوں میں آکر ان کے دلوں میں نفرتوں کے پہاڑوں کی میخیں خود ٹھوکیں......!

☆☆☆

منڈیروں پر سے گلابیت سمٹی، اُجالے کا آخری قطرہ اندھیرے کی نحوست نے چوس لیا اور پربتوں پر پھیکی سیٹی سی چاندنی گھن چکر بن گئی تو چمگادڑوں کو اپنے ٹھکانے سے زیادہ پناہ کھلی فضا میں نظر آنے لگی...... اور پھر تندوروں کے کھلے دہانوں سے دھوئیں کے مرغولے بلند بلند مینار بناتے چلے گئے اور چاند بھی دندانے دار لگا تو بلوریں چوڑیوں کے ٹوٹے ٹکڑے چھن سے اُس کے قدموں میں آگرے......

تابش نے تڑپ کر نظریں اُٹھائیں تو حاجرہ کے چہرے پر دکھ کے سارے آثار تھے۔

''جلسے سے واپس آگئے؟'' اُس کے آنکھوں میں کرب تھا اور شکوے کی تیرتی ڈوریاں۔ تابش نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔

''ہاں آگیا...... تجھے بتا نہیں سکتا میں کہ مجھے اپنی قوم پر کتنا فخر محسوس ہوا حاجرہ......'' وہ خوش اور پُرسکون لگتا تھا۔ حاجرہ نے تلخی سے اُسے دیکھا۔

''تو تم بھی بٹوارے کے حق میں ہو...... زمین کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ سب کے حق میں بہتر ہوگا حاجرہ...... ہر مذہب کے لوگ اور مسلمانوں کو اختیار مل جائے گا کہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ جئیں، یہ اُن کی آئندہ نسلوں کی بقاء ہے۔ سب کو برابری کا حق ملنا چاہیے۔'' اُس نے دو قدم بڑھا کر حاجرہ کو رسانیت سے سمجھایا......

حویلی کے سامنے وہ باہر گلی میں کھڑے تھے۔ چمگادڑیں سروں پر فراٹے بھرتی گزرتی تھیں۔

''برابری کا حق اور کیسا ہوتا ہے تابش...... سب کو ہر چیز تو میسر ہے۔ پھر حدود کھینچنا، انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنا اور وہ دھرتی جو سب کی ماتا ہے اس کا سینہ چیر کا دو حصے کر دینا تمہیں حق لگتا ہے؟'' مارے دکھ کے اُس کی آواز پھٹ گئی۔ چاند سے اُترتی چاندنی اتنی ٹھنڈی رہی کہ اندھیرے پر گمان جوں کا توں تھا...... وہ بھی اندھیرے میں تھی۔

''تمہیں کچھ خبر نہیں بھولی لڑکی، تم بس وہ جانتی ہو جو اس گاؤں میں ہو رہا ہے...... باہر نکل کر دیکھو مسلمانوں پر زندگی کے دن تنگ کیے جا رہے ہیں، ایک ساتھ رہنا دوبھر ہوگیا ہے، اور برابری کہاں ہے؟ جہاں معمولی سے تعلیم کی لکیر پیٹتے غیر مسلم، پڑھے لکھے باشعور مسلم نوجوانوں پر فوقیت کھا کر سرکاری وردیاں پہن رہے ہیں، کلکٹر لگ رہے ہیں، ڈی ایم بنتے ہیں، کہیں اتالیق تو کہیں سپاہی بھرتی ہو رہے ہیں اور اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جانے لگی ہے، سنسکرت کی اہمیت ہے اور اُردو کی اوقات دو کوڑی کی کردی گئی ہے...... عزتیں غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہیں۔ مسلمانوں کی جاگیریں ضبط ہو رہی ہیں اور ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں...... یہ سب اب بغیر آزادی کے کبھی تھم نہیں سکتا حاجرہ۔'' تابش جذبات میں کہتے کہتے چپ ہوگیا کہ اُس کا دل بھر آیا تھا......

حاجرہ کو وہ ایک دم بہت بدلا ہوا معلوم ہوا تھا۔

”تم پہلے تو ایسی بات نہیں کرتے تھے تابش......“ حاجرہ اپنا معاملہ بھول کر اُسے تکنے لگی۔ اُسے لگا چمگادڑیں اُس کے اوپر سے گزرتیں، اُس کے سیاہ نصیب کا سنکیت (اشارہ) دیتی ہیں۔

”ہاں، میں نے دور سے علی برادران کو دیکھ لیا ہے ناں......“ وہ ہنس پڑا۔ حاجرہ چونکی۔

”قائد علی کو......؟“

”قائد، علی کب سے ہوگئے......وہ جناح ہیں۔“ تابش کا تیوری چڑھا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ حاجرہ بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہوگئی۔ اُنگلی کی پوروں سے آنکھوں کی نمی صاف کی۔

”تم لوگ پاکستان چلے جاؤ گے؟“

”نہیں......یہ ہمارا گاؤں ہے، ہمیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔“ اُس کے لہجے کا یقین حاجرہ کو اندر تک سرشار کرنے لگا مگر وہ حقیقت کا تعارف بھول نہیں سکتی تھی۔

”سمراٹھ بھائی بہت بدل چکا ہے تابش...... اُن کا لہجہ نفرت سے بدبودار ہو چکا ہے۔ اور اب تو ماں، ابا بھی چپ رہنے لگے ہیں، میں نے سمراٹھ بھائی کو اُنہیں روپے دیتے دیکھا تھا۔ وہ کسی سازش میں لگتا ہے بے احتیاطی چھوڑ دو تابش......“ وہ کس قدر مجبور ہو کر اور بے بسی سے بتا رہی تھی۔ اپنے خون اور دلی رشتوں میں وہ ایک کمزور سی باڑھ تھی جو دونوں کو ایک دوسرے کے منہ آنے سے روکنے کی کمزور کوشش کرتی تھی۔

”تم فکر مت کرو سمراٹھ بھائی نہیں تو...... اشوک تو اپنا یار ہے۔“ اُسے یقین تھا۔ نجانے کس مٹی سے بنا تھا یہ لڑکا...... کچھ دیکھتا ہی نہیں تھا۔

”سمراٹھ بھائی میری سگائی اپنے ایک دوست سے کرنا چاہتے ہیں تابش......“ اُس نے سسکی بھری اور دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اس سکوت کو چیرنے کے لیے چمگادڑوں کا گروہ بھی نہ بھٹکا۔ پھر اچانک تابش نے ایک بھونڈا سا قہقہہ لگایا تو حاجرہ اُس میں بے فکری ڈھونڈتی ہی رہ گئی۔

”یہ کبھی ہو نہیں سکتا حاجرہ......اب بس عبیرہ کے نکاح کا انتظار کرلو۔“ شانوں سے تھام کر تابش نے پُرتپش لہجے میں اُسے کہا تو اُس کی بات میں چھپے استحقاق کو بھانپ کر حاجرہ کے دل میں بغاوت نے جگہ لی اور اُلٹے قدم مڑ گئی۔

اب حاجرہ کی کہانی چلتی ہے......!

وہ ایک ہندو لڑکی تھی مگر اپنی عمر کے اس پڑاؤ تک آتے آتے دو دھاری مذہب پر چل رہی تھی...... گزرے ورشوں کی محبتیں اس لڑکی پر الگ ہی رنگ میں اثر انداز ہوئیں...... وہ اسلام کو بہت حد تک جانتی بھی تھی اور بنا پروا کیے عمل بھی کیے جاتی۔ سرزمین میں اُس کی جان ہوتی تھی۔ دونوں مسجد میں ایک ساتھ داخل ہوئیں تو مولوی صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی انکھیوں میں غصہ بھر کر اُسے دیکھتے تھے۔

”یہ ساتھ کیوں آتی ہے؟“ اُنہوں نے ”آنندی“ کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔ دونوں کا دل دھڑکا۔

”مجھے بھی اس کتاب کو پڑھنا ہے مولوی چچا۔ قرآن پاک سکھا دیں؟“ وہ بہت اُمید سے اُنہیں دیکھنے لگی۔ جیسے بھیک مانگنے والے آنکھوں میں زخمی التجا لے کر سوال مارتے ہیں۔

”تیرا مذہب الگ ہے، اور یہ ہماری بہت پاک اور مذہبی کتاب ہے تو ابھی نہیں سمجھ سکتی......اور میں ایک ہندو مذہب کی بچی کو قرآن نہیں پڑھاؤں گا۔ دوبارہ مت آنا......“

”پر چچا......میرا نام تو حاجرہ ہے نا، جو حضرت ابراہیم کی بیوی بی بی حاجرہ کا ہے......اُن کے قصے ہمیں دادی (سرزمین کی دادی) سناتی ہیں کہ وہ کتنے اُونچے مقام کی مالک ہیں، آپ مجھے قرآن نہیں پڑھائیں گے تو وہ اپنے ہم نام بندے کے لیے آپ کو معاف کردیں گی، اور اُن کا پیارا اللہ؟“

وہ مذہب کی تھیوریاں سمجھتی تھی نہ ہی درمیان کے تفرقات، مگر اُس وقت اُس نے مولوی چچا ک عجیب تاثرات میں دیکھا...... جیسے شرمندہ ہوں،

چھوٹی بات کہہ دینے پر نادم...... پھر وہ ساتھ جاتی تھیں۔

سرگی وقت جب فضاؤں میں ایک پُرسکون سا مقدس ٹھہراؤ دلگداز لہریں پیدا کرتا تھا دونوں بس ایک ہی سمت جاتی دکھتی تھیں اور حاجرہ کے گھر والے بے خبر رہ گئے...... شہاب الدین حویلی میں کبھی کبھار سرزمین کے پہلو میں جڑ کر کھڑے ہوتے ایک ہی جائے نماز پر حاجرہ کو نماز پڑھتے دیکھتے تو ہنس پڑتے تھے......

”کیا ہی شان ہے اللہ کی...... میرے منہ سے نکلے نام پر کیا خبر تھی کہ اس بچی پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔“

رمضان کریم میں سخت دنوں کے روزے بھی اہل ایمان نہایت جوش و خوشی سے فرض کی ادائیگی کرتے تو کانسی کی گاگر سر پر رکھے کنویں کی طرف پانی بھرنے، منہ پر گھونگٹ نکالے حاجرہ کنویں کی اور جاتی تو سرزمین کو ہمراہ لیتی تھی...... ایک دن سرزمین نے پوچھ لیا۔

”آج تم نے پانی نہیں پیا......؟“

”ہاں، میرا روزہ ہے......“ وہ مسکراتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ جیسے اپنا راز فاش کر رہی ہو۔ سرزمین استعجابیہ اُسے دیکھنے لگی۔

”تمہارا اور ہمارا مذہب بالکل الگ ہے حاجرہ۔ تمہارے گھر والے تمہاری جان لے لیں گے...... تمہارے دھرم میں بھی تو......“

”میرے دھرم کے روزے مجھے بہت کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں سرزمین۔ کوئی کس چاہ میں رکھتا تو کوئی کس خواہش میں...... مجھے خوشی ہوتی ہے میں وہ روزہ پورا کرتی ہوں جسے سب صرف ایک ان کے لیے رکھتے ہیں...... اللہ کے لیے...... اور حاجرہ اور تمہارا مذہب ایک ہے...... آنندی اور اُس کے خاندان کا دھرم الگ ہے۔“ وہ دل موہ لینے والے انداز میں ایسے کہتی، سرزمین اُس کے باؤلے پن پر سر جھٹکتی ہنستی تھی۔ سیتا پھل کی لاغر جھولتی ڈالیاں دونوں کی ہنسی سے لرزنے لگتی تھیں...... پھر تضاد یہ ٹھہرتا کہ وہ کستوری کے سامنے آرتی میں بھی کھڑی ہو جاتی، پرشاد بناتی، مورتیوں پر پھول چڑھا دیتی...... اسے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کہ کیا کرتی تھی۔

جنوری کا مہینہ تھا، کہرے میں ڈوبی خشک سردی ساری کائنات پر بکھری تھی۔ برفیلی دھند درختوں کے گرد چہار سو گھس کر گہرا سبز کر کے مزید ہیبت ناک دکھائی اور ایسے میں بجتی مندر کی گھنٹیاں کوٹھڑیوں میں گھسے زرد مدقوق لالٹین کی روشنیوں میں لپٹے انسانوں کو لگتا گویا ٹھنڈ کے غضب سے دیوی دیوتاؤں کے دانت بجتے ہوں۔

چوپال پر حقے سے دھویں کے مرغولے اُٹھتے اور بگولوں کی مانند بلند ہوتے ہوئے فلک کی اور بڑھ جاتے تھے۔ اسی چوپال پر حقہ کے دھویں اُڑاتے اپنی دھن میں سمراٹھ نے جوئے میں پانچ سو ہار دیے۔ ننکو سنگھ کے لڑکے نے خوب ٹھٹے اُڑائے...... روپیا بھی زیادہ تھا، اور غیرت بھی۔

”یہ ساری ملی بھگت تھی تم سارے لوگوں کی......“ سمراٹھ نے تپ کر جواب دیا اور قہوے کا پیالہ کھینچ کر چبوترے سے پرے پٹخا۔ قہوے کے اُڑتے سیاہ کڑوے چھینٹے سب پہ بڑے ناگوار گزرے۔ سدھو نے گلدیپ کو آنکھ مار کے بڑے تمسخرانہ انداز سے سمراٹھ کو چھیڑا۔

”ابے تُو تو بڑا سمجھ دار ہو گیا، ملی بھگت سمجھ میں آ گئی؟ ناک کے نیچے ہوئے سوانگ کی تو بھنک بھی نہ پڑ سکی تجھے......“

”کیا مطلب ہے؟“

”وہ تُو چھوڑ...... پانچ سو کی بات ہے نا، بھڑکتے کاہے ہو...... جس کا تو سالا ہے وہ شہنشاہ بندہ ہوتا ہے۔“ گل دیپ کی بات بڑی معنی خیز تھی...... آنکھوں کے ڈیلے پُراسرار انداز میں گھوم رہے تھے۔ سمراٹھ کا ماتھا گھوم گیا...... دماغ پہلے بھی کب سیدھا تھا۔

”کیا بکتا ہے تُو گل دیپ......“ سمراٹھ نے

جھپٹ کر پنجہ پہلے مارا اور بات بعد میں کی۔ سامنے والے کا منہ وار سے لال ہو گیا۔ محفل میں یک بیک تناؤ پھیل گیا۔

”تیری جرأت کیسے ہوئی۔ اُوئے، خود کو مرد سمجھتا ہے......“ گل دیپ دیوانہ وار اُلٹ پڑا۔ پے در پے دونوں طرف حملے سے دونوں کی قمیصوں کے کالر پھٹ گئے۔ باقی لوگ بیچ بچاؤ کرانے لگے۔

”میری بہن کا نام دوبارہ زبان پر نہ لانا...... پانچ سو میں تیری اوقات سامنے آ رہی ہے نا، تیرے منہ پر ماروں گا (گالی)......“ وہ بکتا جھکتا پھر سے اُس کی اور لپکنے لگا۔ سردی کے باوجود اب وجودوں میں آگ کے بھانبھڑ بھڑکنے لگے تھے۔

”اوئے چل...... پانچ سو کی بات کرتا ہے پہلے اپنی عجت جا کے سنبھال...... جو ہارے پانچ سو کی طرح تیرے اپنے منہ پر پڑنے والی ہے۔“ گل دیپ نے زہر اُگلا جس نے گویا سمراٹھ پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔

”تیرا کیا مطلب ہے؟“

”سب سمجھتا ہے تُو مطلب پر جن سے پیٹ بھرتا ہے اُن کے خلاف کچھ دیکھ بھی کیسے سکتا ہے تو......“ اُس کی نگاہوں میں سارے کشن گڑھ کی غلاظت تھی۔ لہجے میں ایسی بُو کہ سب کو اُبکائی آ جائے۔

”میں نے پوچھا کیا کہہ رہا ہے......“ سمراٹھ کی دھاڑ نے چوپال کی دھول اُڑا دی...... خود گلدیپ کی تنے نقوش میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ سدھو مدبرانہ انداز میں آڑے آتے بولا۔

” چھوڑو یار کیا لڑتے ہو...... گلو گھر چل تو......“

”نہیں مجھے بتانے دے...... تُو نہیں جانتا کہ وہ مسلمانوں کا لڑکا کس طرح تیری بہن کو ملکیت سمجھتا ہے...... تیری بہن کی بندیا کی چمک کیسے اس لڑکے پر مرگی طاری کر دیتی ہے، یا تو یہ نہیں جانتا کہ بہن کا کتنا وقت کس کے گھر گزرتا ہے...... بٹوارا ہوا تو وہ اسے تحفہ جان کر......“ گل دیپ کے گھٹیا الفاظ منہ میں ہی مچلتے رہ گئے...... ایک پتھر کا بھاری ٹکڑا گھومتا دکھائی بھی نہ پڑا۔ اور ماتھے میں شگاف ڈال کر اُس کے سانولے چہرے پر گہرے رنگ کی آبشار بہا گیا۔

☆☆☆

صحن کے بیچ تلسی کے پودے اور سیتا پھل والے گھر کی دیواروں پر لگیں گاندھی اور نہرو جی کی گرد آلود تصویریں ایک کنارے اُکھڑ کر پُرنم ہواؤں کے دوش پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ پورے گھر پر ہُو کا عالم طاری تھا...... پوجا طاق میں صندل کی چوکیوں پر سُرخ زبان والی مورتیوں کے گلے میں مرجھائے ہار گزشتہ دن کے غماز تھے۔ حاجرہ دوپٹا گلے میں لٹکائے حویلی سے بھیجے گئے دھان کے کھیت کے خوشبودار چاول رسوئی میں کھڑی صاف کر رہی تھی۔ ایک چولہے پر پانی اُبلنے کو رکھا تھا...... دوسرے پر دھیمی آنچ میں دال تیار ہو رہی تھی۔ اُس کی مانگ میں بڑی بڑے دنوں بعد کی بندیا آج چمک رہی تھی...... اچانک صدر دروازہ اتنے طوفان سے کھلا کہ ٹوپی دار کیلوں کے نیچے ٹین کے ٹکڑے اُکھڑ گئے تھے...... سمراٹھ صحن میں آ کر پوری قوت سے چلایا۔

”آنندی......“ وہ فوراً باورچی خانے سے باہر آئی اور ناسمجھی کے عالم میں دروازے میں جم گئی۔ سمراٹھ کی پلکوں سے کچھ باہر نکلی آنکھیں...... اور جوش سے بری طرح کانپتا وجود، اُسے بے پناہ خوف محسوس ہوا۔

”بھیا......“ سمراٹھ پلک جھپکتے اُس کے پاس پہنچا۔ جھکے چھت والے کمرے میں اشوک اُلٹا پڑا ریڈیو درست کر رہا تھا...... سمراٹھ کی کرخت آواز پر ریڈیو پھینک کر باہر لپکا۔

”سچ سچ بتا تیرے دل میں کیا ہے......“ اُس کے سوال پر حاجرہ کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ اس کا جنونی روپ دیکھ رہی تھی۔ لب پھڑ پھڑانے

لگے......

"بھیا......"

"میں نے پوچھا کیا چاہتی ہے تُو؟" سمراتھ نے چلا کر ہاتھ زور سے تھال پر مارا۔ خوف سے اُس کے منہ سے چیخ برآمد ہوئی اور ہاتھ لبوں تک گئے۔ تھال کا شور بلند ہوا، اور سرخ اُبھری اینٹوں پر چاول دور تک بکھرتے چلے گئے...... اشوک تیزی سے دونوں کے درمیان آیا۔

"بھائی۔ کیا کر رہے ہو...... کیوں اس پر چلا رہے ہو۔"

"پوچھ اس سے کیوں چلا رہا ہوں...... بتا تو کیوں جاتی ہے بار بار حویلی...... کیا رشتہ ہے تیرا اُن کے ساتھ......؟" حاجرہ گنگ سی اُسے آگ بگولا دیکھ رہی تھی۔ اشوک نے بڑی حیرت سے اُس کو دیکھا۔ چھت پر سے کستوری ساڑھی کے پلو سنبھالتی گرتی پڑتی نیچے آتی دکھائی دی۔

"کیا کیا ہے حویلی کے لوگوں نے......؟" اشوک نے گہرا سانس بھرتے پوچھا۔ ورنہ وہ تو ڈر ہی گیا تھا۔

"تجھے کچھ نظر نہیں آئے گا بے غیرت...... دونوں اُن مسلمانوں کے دم بھرتے جو نظر آتے ہو، آج بھری محفل میں اُن کی کمین کا لڑکا منہ پر کالک مل گیا ہے میری...... اُس حرام زادے کے ساتھ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگی ہے یہ بے عقل لڑکی۔ کان کھول کر سن لے آئندہ کے بعد حویلی کی طرف تیرا ایک قدم بھی اُٹھا تو ٹانگیں توڑ دوں گا...... جسے ہماری عزت کی پروا نہیں......"

"ایسا نہیں ہے سمراتھ بھائی......" وہ سن کر سسک پڑی۔ اشوک کا منہ بھی سرخ ہو گیا تھا جانے کس بات پر ضبط کیے رہا۔

کستوری نے آ کر بڑے بیٹے کو جھنجوڑا اور دو ہتھڑے مارے۔

"کیا بکتا ہے بدبخت اپنی ہی بہن پر الزام لگائے گا...... اب پوری بستی اکٹھی کرے گا، میں کہتی ہوں منہ بند رکھ اپنا......"

"تیری آنکھیں آج تک بند نہ رہتیں تو مجھے منہ کھولنا نہ پڑتا...... وہ بدذات چھوکرا اتنی ہمت اُس کی کہ ہماری عزت پر نظر بھی ڈالے۔ میں اس کو تو دیکھ ہی لوں گا، پہلے سیتا موسی کو تار کرو یا پتر بھیجو...... جلد سے جلد شیکھر سے اس کی سگائی ہو جانی چاہیے اور کوئی سمسیا نہ ہوئی تو بیاہ بھی...... ان کا تو میں اب رہنا بھی دوبھر کر دوں۔"

"میری بات سن سمراتھ۔ جلدی کر کے اپنی عزت دو کوڑی کی نہ کر...... وہ مسلمان ہیں وہ ہماری برادری میں بیاہ بھی نہ کرے ہیں۔ نہ ہی اُن کا دھرم یہ اجازت دیے ہے۔ پھر یہ اُن کی نرم دلی ہے جسے غلط رنگ دیا جا رہا ہے......" کستوری نے اُسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔ شکر تھا کہ پاروتی اپنے انگریزی اسکول پڑھتے بیٹے کو ٹیوشن دلوانے گئی تھی ورنہ کتنی شرم کی بات ہو جاتی۔

"میں کچھ نہیں سنوں گا شیکھر کے من کو میں نے پڑھا ہے اور سیتا موسی کی بھی چاہ ہے تو بس......"

"سمراتھ بھیا......" حاجرہ نے تڑپ کر لب کشائی کی۔ اُس کا نچلا ہونٹ مسلسل چبانے سے سرخ پڑ چکا تھا۔ "یہ ظلم مت کریں شیکھر کے ساتھ کی سزا مجھے مت دیں...... اور تابش ایسا بالکل نہیں ہے خدا کے لیے اُن سے دشمنی......" اُس میں نجانے اتنی ہمت کیسے آئی تھی۔ اشوک بیچ سے ہٹ چکا تھا...... اپنی جوان بہن پر پہلی مرتبہ...... پہلی مرتبہ سمراتھ نے پوری قوت ایک ہاتھ میں منتقل کر کے گھوم کر جبڑا توڑ تھپڑ اُس کے گال پر رسید کیا۔ حاجرہ نے توازن کھویا، پیشانی رسوئی کے دروازے سے جم کر ٹکرائی۔ اُس کی بندیا شاید آج ٹوٹ گئی تھی یا پیشانی چیر گئی تھی۔ گال پر خون کی لکیر کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔

"واسطہ تابش کے لیے...... واسطہ بھی خدا کا......؟"

☆☆☆

"ہے! ایک تو جنگ کا زمانہ ہے پیٹ بھر کر کھانا

جیسے گناہ ہوگیا ہے...... مہنگائی اتنی کہ انسانوں کی جان کو آئی ہے اور کام ٹھپ۔ اُوپر سے اللہ نے خدمت خلق کا جذبہ بھی ماشاءاللہ سے کوٹ کر ناک تک بھر دیا کہ میاں خود لٹکو پھانسی یا پھانکو سانپ بن کر مٹی مگر خبردار جو خوب صورت بلاؤں کو گھر کا راستہ دکھایا ہو تو......''

توے پر روٹی کو پٹخ پٹخ کر وہ ہاتھوں سے زیادہ زبان چلائے گئی۔ اُپلوں کا کڑوا دھواں صحن میں پڑے لاغر وجود کی سانسوں میں مدغم ہوا تو وہ اُچھل اُچھل کر کھانسنے لگ گیا۔ اُس کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر وہ دو گھونٹ پانی پلا دے...... بس خالی آنکھوں سے اُس عورت کو دیکھنے لگی جس کی زبان کی رفتار چھری سے تیز اور الفاظ خاصے طاقت ور ہوتے تھے۔ وہی عورت آگ بجھاتے اُٹھی اور پانی میلے سے گلاس میں بھر کر اُس کے قریب گئی۔

''یہ پانی پی ابا......'' وہ کچھ شرمندہ نظر آئی۔

''تیرے بستر سے کیسی دوائیوں کی بدبو آرہی ہے پر کیا کروں صبح ارادہ کیا تھا کہ پتلا پتلا صابن پکا کر چادریں اور تیری لنگیاں دھوڈالوں گی...... مگر وقت جو ملا ہو، میں بھی اکیلی جان ہوں باقی سب تو پکی پر بیٹھنے آتے ہیں۔'' بوڑھے نے بس دو گھونٹ ہی پانی لیا تب تک تو وہ اپنی پوری داستان گوش گزار کر چکی تھی۔ کونے میں گٹھڑی بنی وہ مجرم سی دیکھتی رہی۔

''بچی سے کہا کر ہاتھ بٹوا لے، دل بہلے گا اُس نمانی کا......'' بوڑھے کا منہ پونچھتے وقت اُس نے یہ بات نقاہت سے بہو کو کہی تو وہ چمک کر بولی۔

''یہ......؟ (طنزیہ اُس کی طرف اشارہ کیا) یہ کوئی کام نہ کرے بس مجھ پر ایک احسان کر دے...... بتا، ہے کون تُو؟'' وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اُس پر تیر کی طرح جھپٹی تو وہ سہم کر اُسے دیکھنے لگی۔

''حا...... حاجرہ ہوں میں......'' اُس نے کئی بار بتایا ہوا نام ایک بار پھر دہرا دیا۔ اس کے پاس منانے کو کتنے ہی غم تھے پھر بھی اس عورت کی صورت ایک اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''بی بی نام نہ بتا مجھے ماجرا بتا...... تیرا سلیم سے آخر رشتہ کیا ہے میں پوچھتی ہوں''

''ان...... انسانیت کا۔'' اُس کی اٹک نے حلیمہ کو خوب ہی شک دلایا۔ وہ اپنے نام پر بالکل بھی نہیں گئی تھی۔ حاجرہ کا جینا حرام کرنا اُس پر جیسے فرض کر دیا گیا تھا۔

''انسانیت کا......'' نقل اُتارتے ہوئے۔

''سارے مردوں کو انسانیت بھی حسین جوان کڑیوں کے واسطے یاد آجاتی ہے۔ میں تجھ جیسی عورتوں کو خوب پہچانتی ہوں بی بی...... سچ بتا مجھے تُو...... کوئی ہندوؤں کی عورت تو نہیں ہے، اللہ معاف کرے...... سلیم ایسا لگتا تو نہیں۔''

''نہیں...... الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔'' اُس نے گھبرا کر اُس کا نیا خیال رد کر دیا۔ مسہری پر پڑا وجود اتنا اونچا نہیں بول سکتا تھا کہ بہو کو ٹوک سکتا...... جب سے وہ یہاں آئی تھی حلیمہ کی ساری شائستگی رخصت ہو چکی تھی۔ سورج اُبھرنے سے لے کر آنکھیں موندنے تک حاجرہ اُس کی اتنی بہت ساری باتیں برداشت کرتی تھی...... اور حلیمہ مزید سوچ جاتی تھی کہ ایسا کون سا رشتہ تھا جو اُسے سلیم کی بیوی سے سب کچھ سننے پر مجبور کرتا تھا۔

''تیرے ساتھ کوئی قصہ ضرور ہے لیکن میں بھی اپنے نام کی ایک ہوں...... کہیں تو کوٹھی سے تو بھاگ کر نہیں آئی......! سلیم کام کرتا تھا وہیں اور تیرے آنے کے بعد سے کام بھی گیا...... ہیں؟'' دونوں بھنویں اُٹھا کر اُس نے پوچھا اور حاجرہ نے کرب سے دونوں آنکھیں میچ لیں۔ دل کرتا تھا کاش مر جاتی...... کوئی فرق نہ پڑتا بے وقعتی تو نہ ہوتی۔ اسی پل دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی گئی اور لکڑی کا کمزور سا دروازہ کھل گیا۔ حلیمہ فوراً سیدھی ہوئی اور اپنا اصلیت کی پٹاری میں اپنا یہ رخ چھپا لیا۔

سلیم اندر داخل ہوا اور نلکے کی طرف ہاتھ دھونے جاتے ہوئے اس پر ایک نگاہ غلط ڈالی، کسی

فضول پڑے ہوئے سامان کی طرح۔

"گلاب زادی" کی زندگی مرجھائی جا چکی تھی۔

☆☆☆

تقسیم

ہندوستان میں ہراس پھیل گیا۔ یک لخت عداوتوں بھری سازشوں کی سرد خشک ہوائیں چلیں جس نے چراگاہوں کو پلک جھپکتے میں سکھا دیا۔ 1947ء کا سن لگ چکا تھا اور کشن گڑھ کے قریب قریب کتنی ہی قوموں نے آکر آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ دور اندیش لوگوں نے خطرے کی بو دور سے محسوس کرلی...... مسلمانوں کے گھروں میں راتوں رات قتل ہونے لگے اور بالکل پُراسرار طریقے سے۔

اس صبح اُونچی حویلی کے روشن کمرے کے دریچے کی چوکھٹ سے تابش نے سر نکال کر دور تک پھیلے کشن گڑھ کی سرحدوں کو طائرانہ ماپا تو کچھ لوگ برساتی کی اور تیز تیز جاتے دکھائی دیتے تھے۔ تازہ صبح کا چمک دار سورج نومولود بچے کی طرح کھلا تھا مگر کچھ کمی لگتی تھی۔ جیسے پہلے کی سی بے فکری غائب ہو۔ تابش نے ایک گہری سانس لی اور سست روی سے حویلی کے صحن میں دیکھا۔

صبح کے ساتھ ہی حویلی میں گہما گہمی شروع ہوچکی تھی...... عبیرہ کی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی تھی اور اُس کی بری کی تیاریاں اقبال بیگم کی نئی مصروفیت تھی۔ عبیرہ مایوں بیٹھی تھی۔ پیلے جوڑے میں لپٹی کمرے کے ایک کونے میں الوہی سی دلہناپے والی چمک لیے...... اُس کی دوستیں سارا دن تانتا باندھے ہتی تھیں۔ ہر آنے والا کا طعام حویلی کی ریت تھی مگر دلوں میں فاصلے آگئے تھے۔ اب پہلے والی بات رہی تھی نہ گزرے زمانے...... تقسیم کا عمل قریب لگتا تھا، اور تنگ دل قوموں کے نقاب چہروں سے ہٹتے ہارہے تھے۔

تابش کے لیے یہ سب افسوس ناک تھا......

یڑھیاں اُتر کر وہ نیچے آیا تو سرزمین اور اقبال بیگم کشمیری شالیں شانوں کے گرد پھیلائے ملازمین سے کام نمٹانے میں لگی تھیں اور اوطاق میں تابش کے دوست انتظار میں تھے...... اس نے سرزمین کو آواز دی۔

"تم نے چائے کا اہتمام کیا......؟" وہ سر پر اوڑھنی درست کرتی قریب آئی۔

"چائے بھابھی لاتی ہوں گی...... حویلی میں کتنے کام ہیں اور لاٹ صاحب آپ ہیں کہ ایک جگہ ٹکتے نہیں، جلسوں کے علاوہ بھی کچھ راحتیں آپ کی منتظر ہیں......" اُس کا لہجہ ہلکا مگر انداز سنجیدہ تھا۔ تابش چونک گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو...... بابا جان نے کچھ کہا ہے؟"

"آپ کی زندگی میں کون اہم ہے تابش بھائی۔ آپ یاد رکھے ہوئے ہیں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے بولی تو اُداسی ادا سے جھلکتی تھی۔ تابش بے چین ہوگیا۔

"سرزمین کیا ہوا ہے؟ ظاہر ہے تم سب میرے لیے بہت اہم ہو......"

"ہمارے لیے اور بھی بہت لوگ ہیں بھائی۔ حاجرہ بہت مصیبت میں ہے...... اُس کا حویلی میں داخلہ ممنوع کر دیا گیا ہے۔ اس کا بھائی شاید اس کا رشتہ بھی کہیں اور کر دے اُس کو آپ کی ضرورت ہے۔ کل شام اُس نے اپنی ایک چوڑی بھجوائی تھی پہلے تو میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکی بچہ بھی پکڑے جانے پر گھبرا کر بھاگ گیا۔ بعد میں، میں سمجھی کہ یہ چوڑی کس کی ہے اور بھیجنے والی نے یہ کس مجبوری میں بھیجی ہوگی مگر آپ حویلی میں رات گئے لوٹے...... پاکستان تو بن جائے گا بھائی پر آپ سوچ لیجیے کہ آپ اس "دوسرے" بٹوارے کے متحمل ہوسکتے ہیں؟" سرزمین پختہ انداز میں کہتی ہوئی چلی گئی اور تابش کی رنگت میں گلابیت گھل گئی تھی۔ کتنا بہت سارا وقت اُس کا چہرہ پرچھائیوں میں گھرا رہا۔ ہاں حاجرہ بھی تو اُس کے لیے بہت "اہم" تھی۔ مگر

ناسازگار حالات کوئی ان کہی داستان سناتے تھے۔

پھر اسی شام حویلی کے پھاٹک کی زنجیر بڑی بدتمیزی سے کھٹکائی گئی۔ گاؤں کا سرپنچ بگڑے تیوروں کے ساتھ شہاب الدین کو طلب کر رہا تھا...... تابش ہمراہ والد کے چوپال پر پہنچا تو اُسے لگا جیسے دشمنوں کی بھیڑ جمع ہے۔ پنجاب میں ان گنت مسلمانوں کی قتل و غارت ہوئی تھی اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی...... اس خبر نے کشن گڑھ کے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے بجائے ڈر بٹھا دیا تھا۔

"شہاب الدین اپنے بیٹے کی باگیں کھینچ کر رکھ، یہ جن راستوں پر چل نکلا ہے ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ اس کی بڑھتی جرأت کو روکیں...... ورنہ ہم سب کے لیے مصیبت کھڑی کر دے گا۔"

اُونچے شملے کے کسی راٹھور کی ہی جرأت ہوئی تھی کہ وہ اُن کو مخاطب کرتا۔ سمراٹھ ان سب میں بہت پیچھے کھڑا تھا...... نما نما مسکراتا...... جیسے چنگاری سلگا کے بھڑکتا دیکھتا ہو۔

"کیا کیا ہے میں نے؟" تابش نے باپ کو زحمت نہیں اُٹھانے دی۔ بھرے مجمعے میں کرواہٹ سی پھیل گئی۔ کتنی تعداد میں مسلمان بھی جمع تھے...... اجنبی...... ملامتی...... خفا خفا۔

"آئے روز کے جلسوں میں شرکت مسلم لیگ کے نعرے لگانا اور کانگریس کی کھلے عام مخالفت، سچ کہتے ہیں شہاب الدین تیری منہ رکھنی نہ کرتے تو تیرے اس لونڈے کو آج ٹانگوں پر کھڑا ہوتا نہ دیکھتے...... اسے آج اور ابھی روک لو ورنہ اس عمر میں صدمہ شاید تو سہن نہ کر پائے......"

"صدمہ......" تابش بڑبڑایا۔ بڑبڑا کر ہنسا۔ چوپال پر موجود کتنے ہی لوگوں کے اس گستاخی پر منہ سرخ پڑ گئے مگر وہ کہتا گیا۔

"صدمہ واقعی سہن نہیں کر پائے گی کانگریس پارٹی جب بٹوارے کی دھول انہیں چاٹنی پڑے گی...... وہ وقت آن پہنچا ہے سرپنچ جی کہ ظالموں پر خدا کی لاٹھی گونج دار آواز میں ٹوٹ پڑے، کیا چاہتے ہیں آپ سب کہ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کریں پہلے انگریزوں اور پھر انگریز کے بھاگ نکلنے پر ہندوؤں کے تلوے چاٹیں...... گاندھی کی مکاری تابش سلیم سمجھ چکا ہے۔ راٹھور صاحب، کیا ہم سب کو نہیں دکھتا کہ مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ اُن کی جانوں کی قیمت بس اتنی رہ گئی ہے کہ ایک بلم (نیزہ) چلے، گنڈاسا لہرائے اور انسان گاجر مولیوں کی طرح کاٹ کر پھینک دیے جائیں...... مسلمان اتنے ارزاں نہیں ہیں جناب کہ تمہارے وفادار کتوں کی طرح دم ہلاتے پھریں اور تم لوگ اُنہیں ٹھڈے مارو...... ایک تابش سلیم کو روکو گے، اُن رہنماؤں کو کیسے روکو گے جو تمہاری چھاتیوں پر پیر رکھ چکے ہیں......"

مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ سمراٹھ بھون لال کے دانت کچکچانے کی آواز واضح سنائی دیتی تھی...... شہاب الدین نے اپنے لڑکے کو یوں دیکھا جیسے بہادری کو مجسم دیکھتے ہوں۔ یہ تابش وہ تابش نہیں تھا۔ سننے والے دم بخود تھے۔ ہجوم میں کچھ نوجوانوں کو سمراٹھ آنکھوں کے اشاروں سے دیکھتا تھا۔ یہ سارے وہ پہلوان تھے جو امیر فسادی ہندوؤں کے ایک سرغنہ کے دست تلے سازش کے تحت تیار کیے جا رہے تھے، جن کا فی الوقت سردار سمراٹھ تھا۔ اور جن کا مقصد مسلمانوں کو ہر طرح سے اذیت دے کے اپنے گھروں سے بھگانا یا مارنا تھا۔

"اس سب میں قصور بھی مسلمانوں کا ہے اگر یہ سارے فسادات نہیں کریں گے جواب تم کر رہے ہو تو قتل بھی نہیں ہوں گے...... ہم نیچ حرکتیں نہیں کیا کرتے......" سمراٹھ نے خاصے طنز سے جوابی مقابلہ کیا تو تابش نے ضبط پر پاؤں جما کر اس الزام کو سہا تھا۔

"جواب دینا ایک بات ہے اور قتل بالکل دوسری...... ہر انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے کسی بھی عمل میں آزاد ہے، کیوں شہروں

Wadar Azeem

میں اذان دینے پر گلے کاٹے جاتے ہیں، نمازوں کے دوران بین بجائے جاتے ہیں...... اس سے تنگ آکر اگر حق کی بات کی جاتی ہے تو تم لوگوں پر قتل واجب ہوجاتا ہے اور پھر کہتے ہو کہ تمہارے خلاف پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے...... اگر مسلم لیگ کا مؤقف بے جا ہے تو پھر تم لوگوں کا ڈر کس چیز کا ہے؟ تمہاری بات بذات خود دوغلا پن لیے ہوئے ہے سمراٹھ......"

تابش کی کیفیت جنونی تھی سمراٹھ سے برداشت کرنا دوبھر ہوگیا۔ اس کی باتیں مرچوں جیسی تھیں جو کانوں کی لوئیں تک سلگا رہی تھیں...... شہاب الدین نے اُٹھ کر اُس کا شانہ تھاما۔

"بس کرو تابش، یہ سب ہمارے عزیز ہیں...... ان کے خلاف جا کر کچھ مت کرو۔"

"تو اور کیا تابش، تم ہمیں ہمارے گھروں سے بے گھر کروا کر رہو گے...... ہمیں کچھ لینا دینا نہیں سیاست سے اور نہ ہی ہم ان رہنماؤں سے ہاتھ ملائیں گے جنہیں مولویوں نے کافر قرار دے دیا ہے...... ارے مفتیوں کی بات سے بھی بڑھ کر کچھ ہے؟ جناح ہو یا اقبال سب کافر ہیں دین سے دور، یہ سب کے دلوں میں نفرتوں کے بیج بو کر خاردار پیڑ کھڑے کردیں گے......"

تابش نے بڑے دل سے ایسی کئی باتیں سب کی زبانوں سے سنیں اور ہلکا سا مسکراتا رہا۔ وہ سب اُسے نہیں روکنا چاہتے تھے "اُس" چیز کو روکنا چاہتے تھے جو قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ وہ حتمی اور اٹل لہجے میں بڑے صاف لفظوں میں بولا تھا۔

"قائد واقعی کافر ہے جو دین پر عمل کرتا ہے...... وہ واقعی کافر ہے کہ کوٹ پہن کر سگار پی کر حق کی بات کرتا ہے اور کانگریس کے منہ پر کلمہ بلند کرتا ہے، اُس کو کافر کہنے والے آج تک آزادی نہیں لے سکے تو اب ان کے پیچھے کھڑے ہو کر مجھے اپی ہوجانے دیں...... قوم کو خضر مل گیا ہے اور اُس خضر نے تابش سلیم پر جادو کردیا ہے۔"

وہ ایک چٹان کی طرح کھڑا تھا جس کے پتھر پر لکیر بھی نہ پڑسکی۔ اس کے بعد سے سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو بستی میں کہرام مچ گیا۔

شہاب الدین کے اصطبل کے سارے گھوڑے بھینسیں اور دوسرے جانور زمین پر ڈھیر ہوئے پڑے تھے، جیسے چوہے زہر کھا کر مر جاتے ہیں...... تابش بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تو یہ نظارہ دیکھ کر گہری گہری سانسیں لیتا پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرنے لگا...... اُس کی چھاتی بری طرح اُبھرتی بیٹھتی تھی۔ تو دشمن اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئے ہیں...... سب افسوس بھری آنکھوں سے بے زبان جانوروں کا حال دیکھ رہے تھے اور وہ...... اپنے گھوڑے کے پاس بے آواز بیٹھا اور منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی، دکھ سے تابش کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

حاجرہ نے دروازے میں پہنچ کر اُسے دیکھا اور وہیں رُک گئی۔ گھوڑے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا وہ شخص غصے اور بے بسی سے سب کو دیکھتا جارہا تھا اُس کی شریانیں بے حد واضح ہورہی تھیں...... شہاب الدین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تجھے کہا تھا نا وہ خالی دھمکی نہیں تھی...... اب رو کیوں رہا ہے مالی نقصان انسان کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ پاتا میرے بچے......" تابش اُن کا ہاتھ تھام کر اور رفتار سے آنسو بہانے لگا۔ گھٹی گھٹی سی سسکیاں، وہ کتنا رحم دل تھا...... حاجرہ سے دیکھا نہیں گیا وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔ سراغ رساں موجود تھا اور باقی اُن کے عزیز...... وہ سب جانتے تھے کہ اتنا بے رحم کون تھا۔

☆☆☆

فضا میں سوگواریت تھی۔ کتنی دیر سے آنسو بہاتی حاجرہ کی نمی بھی جیسے ہوائیں چرا گئی تھیں کہ اُن میں اسے ایک محسوس کیا جانے والا بین سنائی دے رہا تھا۔ عبیرہ کی شادی میں حویلی والے کتنے خوش تھے اور

ایک گھاؤ مل گیا...... اُس نے بے دردی سے اپنے آنسو رگڑے تو گھر میں اشوک داخل ہوتا دکھائی دیا۔ حاجرہ کو اُسے دیکھ کر شدت سے رونا آنے لگا، وہ دونوں ایک دوسرے پر گئے تھے اور دونوں کسی اور سے مجبور تھے۔

"حاجرہ پانی کا گلاس لا دو۔" آواز لگا کر وہ صحن میں پڑی لوہے کی پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا، جانے کہاں سے لایا تھا حاجرہ نے پانی لا کر رکھا تو بولا۔

"جیتی رہو۔" وہ ٹھہر سی گئی۔

"تم جیو، میں جی کر کیا کروں گی۔" بھائیوں والی ازلی محبت...... اشوک چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"ہمیں جینے کا مقصد دو گی، انسان کے پاس جینے کی وجہ اُس کے اپنے ہی ہوتے ہیں......"

"شاید کاکا (شہاب الدین) کے کہنے کا مطلب بھی یہی تھا...... مالی نقصان تو کچھ نہیں بگاڑتا بس اپنوں کی سلامتی ہو۔" وہ آہ بھر کر بولی۔ اشوک کے حلق سے پانی نہیں اُترا۔

"تابش تمہیں اچھا لگتا ہے؟" اُس نے غیر متوقع سا سوال کر دیا۔ وہ سکون سے مسکرا دی۔

"اُس میں برا لگنے جیسا کچھ ہے کیا؟"

"اُس کے لیے پرارتھنا کیا کرو حاجرہ اُس سے سمراٹھ بھائی کی ناپسندیدگی مجھے بہت کھلتی ہے۔" اشوک کی معصومیت پر وہ ہنسی اور ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"تمہیں وہ کام کہنا چاہیے تھا جو میں نہ کرتی ہوں...... دعا نہ کرتی تو میں خود زندہ رہ پاتی؟"

اچانک گلی میں چیخ و پکار بلند ہونے لگی۔ دونوں نے فکرمندی سے ایک دوسرے کو دیکھا صبح شام اب یہی ہونے لگا تھا ہندو شرارتی بچے مسلمانوں کے بچوں کو لوٹنے لگتے مارتے پیٹتے، بڑے آگ لگا دیتے گلی میں بے عزت کیا جاتا، فسادات بڑھتے جا رہے تھے۔ مگر اس سمے سمراٹھ دروازے سے نمودار ہوا تو اُسے لہولہان دیکھ کر دونوں ششدر رہ گئے تھے...... بھون لال اُسے جھڑکتا آ رہا تھا۔

"کیا ضرورت تھی تابش سے بھڑنے کی اپنی بھی رت بہا دی اُس کا الگ سر پھاڑ دیا...... تُو کیوں نہیں سمجھتا آخر کہ تیرے اس سب کرنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔" حاجرہ کے پیروں سے زمین نکل گئی سرعت سے زخمی نگاہ اشوک پر ڈال کر وہ تیزی سے رسوئی میں بھاگی۔ اشوک نے دکھ بھری نظر بہن پر ڈالی اور سمراٹھ کے پاس گیا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" انداز اُکھڑا سا تھا۔ سمراٹھ نے بھی اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پھر اُسے جاتا دیکھ کر دریافت کیا۔

"تُو کہاں جا رہا ہے......"

چند لمحے وہ چپ رہا پھر گہری سانس لے کر مضبوطی سے بولا۔ "تابش سے ملنے......"

"دماغ ٹھیک ہے تیرا، تیرے بڑے بھائی کی اُس نے یہ حالت کی اور تو کس منہ سے وہاں جا رہا ہے دشمنوں کے پاس......" سمراٹھ کے دھاڑنے پر اُس پر ذرا جو اثر پڑا ہو۔

"وہ آپ کے دشمن ہوں گے، میرا وہ دوست ہے۔" اشوک کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اور حاجرہ کھڑکی میں سر لگائے سمراٹھ کو بکتا جھکتا سنتی رہی اور اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔ سمراٹھ نے اُس پر پابندی لگا دی تھی گھر سے نکلنے کی...... پھر بھی وہ بے اختیار ہو کر آج باہر چلی گئی تھی۔ لیکن وہ جو اب تک سمراٹھ کے دباؤ ڈالنے کے باوجود تابش سے دستبرداری پر ایک انچ نہ ہلی تھی آج بری طرح دہل گئی تھی...... تابش اُس کی وجہ سے کتنے خطرے میں تھا وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔ رات کو پاروتی اُس کے کمرے میں آئی تو ناچار حاجرہ پلنگ سے اُٹھ پڑی۔

"اب کیا چاہتی ہو تم؟" پاروتی نے اُس نے آتے ہی پوچھا۔ حاجرہ مردوں کے انداز میں بیٹھی تھی۔

"آپ کا شوہر مزید کیا چاہتا ہے؟"

"دیکھو آنندی۔ دیا کرو ہم پر ضد چھوڑ دو...... چھوڑ دو اُس لڑکے کا پیچھا، دل لگانے کے لیے تمہیں اور کوئی نہیں ملا تھا۔"

"آپ چھوڑ سکتی ہیں اپنے شوہر کو؟" اس نے بے حد سرد لہجے میں خود کو کہتے سنا۔

"وہ پتی ہے میرا......" پاروتی نے چبا کر ادا کیا تو حاجرہ سیدھی ہوئی۔

"اور جس کا آپ کہہ رہی ہیں وہ میری روح کے اندر کہیں بہت گہرائی میں اُتر چکا ہے، شوہر چھوڑا جاسکتا ہے اُسے اپنی روح سے کیسے کھینچ نکالوں......؟"

"اُسے مت نکالو بس ہم سب پر رحم کھاؤ...... تم جانتی نہیں ہو تم کن کن کے لیے مصیبتوں کا باعث بن رہی ہو۔"

"اپنے شوہر سے جا کر کہیں میری اُس سے شادی کر دے ہم دور چلے جائیں گے...... پاکستان......" وہ جانے کیسے اتنی بے باک ہوگئی تھی پاروتی کی رنگت گلابی پڑ گئی۔

"وہ مرجائے گا مگر یہ نہیں کرے گا...... بنتی کرتی ہوں آنندی شیکھر سے سگائی کر لو، جانتی ہو آج دونوں گھاٹ کے پاس لڑے تابش کے سر میں چھ ٹانکے لگے ہیں اور تیرا بھائی بھی زخم زخم ہے...... وہ دونوں بار بار سامنا کریں گے جب تک ایک مر نہ جائے...... مجھے بیوہ ہونے سے بچا لو آنندی مجھے سفید رنگ سے خوف آتا ہے اُس کی ٹھنڈک مجھے اندر سے کاٹتی ہے اور اگر سمراٹھ کی جگہ مرنے والا تابش ہوا تو......"

"نہیں......" اُس نے چیخ کر پاروتی کے نٹ دبوچ لیے۔ رنگت لٹھے کی مانند سفید پڑ رہی تھی۔ اور جسم یوں لرزتا تھا گویا نحیف سا ہو کر آندھیوں کی زد میں ہو۔ وہ حقیقت کہہ رہی تھی اور حاجرہ اس سے خوب آشنا ہوگئی تھی۔ انسان اپنی تکلیف پر کبھی نہیں بلبلا سکتا جب تک کہ بات اُس کے کسی بہت پیارے پر آ کر نہ ٹھہرے۔

اور وہ سمراٹھ کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔

"مجھے بات کرنی ہے......" اُس کا لہجہ پست تھا بہت پست...... سمراٹھ گھاگ تھا وہ تو سنتے ہی بھانپ گیا۔

"بولو کیا کہتی ہو؟" وہ مزے لے کر مسکراتا نظر آنے لگا۔

"مجھے وچن دیجیے......"

"دیا......" وہی پُر لطف، محظوظ کن انداز۔

"تابش کو آپ اب سے کچھ نہیں کہیں گے...... مجھ سے وعدہ کریں کہ اُس کا راستہ نہیں کاٹیں گے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے...... وہ لوگ جلد یہاں سے چلے جائیں گے تب تک کچھ مت کہیے گا۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں شیکھر سے سگائی کے لیے تیار ہوں۔"

سمراٹھ نے آخر میں بہت تاسف سے اُسے دیکھا۔

"میری غیرت عمر بھر مجروح رہے گی کہ میری بہن نے ایک نیچ انسان کے ساتھ میری ناک کے نیچے کھیل کھیلا اور اُس کی زندگی کا سودا کرنے میرے سامنے بھیک لینے آئی...... بہر حال تم بھی اپنے وچن پر قائم رہنا۔"

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ مڑ گئی۔ عبیرہ کی رخصتی اگلے دن تھی اور اُس کی سگائی بھی اسی دن رکھ دی گئی تھی۔

رات چڑھی تو اتنی زہریلی تھی کہ پل پل ڈستی تھی اور اندھیرا صورتوں کے اصلی رنگ نچوڑ لیتا تھا...... پاروتی مہندی لے کر آئی اور اُس کی ہتھیلیاں رنگنا شروع کر دیں۔ دھیمی آواز میں بات کرتی وہ کبھی اسے چھیڑتی تھی مہندی کے رنگ سے...... کبھی پھیکی پڑ جاتی۔ کستوری اور بھون لال خاموش تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ گھر کا بڑا سمراٹھ ہو چکا تھا، کیونکہ وہ اب گھر کو سنبھال چکا تھا۔ پاروتی اُس کے پاس سے اُٹھ کے گئی تو حاجرہ نے کچھ سوچتے ہوئے دروازے کی کنڈی چڑھائی، لالٹین کی روشنی بڑھائی اور اپنے

سفید دوپٹے کا ٹکڑا پھاڑ کر مہندی کی نوک اوپر رگڑنے لگی۔

تابش سلیم!

تقسیم کسی بھی چیز کی ہو دو حصے کر کے ہی مکمل ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے وہ ہمیں بھی تقسیم کرنے پہ تُل گئی مگر ہم دونوں تو سدا سے ایک ہیں۔ دوریاں آ بھی جائیں تو روحوں کے رابطے کب کٹتے ہیں، میری لاج رکھنا تابش میرے فیصلے کی عزت کرنا۔ زندہ رہوں گی مر کر تم سے علیحدہ ہونے کی جرأت بھی کروں تو...... ہجرت کر جاؤ تابش پاکستان ضرور بن جائے گا۔ بس وہاں کی مٹی کی پوٹلی ضرور روانہ کرنا، روز چٹکی مانگ میں بھر کر تہوار منایا کروں گی۔ اور اگر کبھی تمہاری بیوی اجازت دے تو ایک آدھ خط لکھنا۔

حاجرہ سلیم

کتنی ہی دیر وہ روتی بلکتی رہی اور ٹیڑھے میڑھے الفاظ کھینچتی رہی۔

”محبت اور آزادی میں ایک چیز کتنی مشترک ہے...... دونوں سرخ ”قربانی“ مانگتی ہیں۔ محبت دل کا خون اور آزادی وجود کا......“

بہت رو چکنے کے بعد اُس نے کلش میں اپنی کلائی کی ساری چوڑیاں توڑ کر ڈالیں اور مہندی کے دونوں ہاتھ آپس میں مسلتے ہوئے مہندی کا چورا اندر جھٹک کر اُوپر کپڑا باندھا اور مورتی کی پوجا کرتی کستوری کے قدموں میں رکھ آئی۔

”آپ کی بیٹی کے ارمانوں کی ارتھی ہے یہ...... باپو سے کہنا کندھے پر اُٹھا سکیں تو اُٹھا لیں......“ پھر وہ مڑی اور اُس کے بعد ایسے پتھر ہو گئی جیسے ابتدا سے ہی تو ایسی تھی۔

اگلے روز حویلی کے پھاٹک کے سامنے بارات رکی تو میراثیوں کے ٹپے اور سکوں کے چھنکاروں سے فضائیں جھوم سی اُٹھیں۔ حاجرہ کے لیے کستوری نئی نکور ساڑھی خرید کر لائی تھی، وہ لپیٹ کر آئی تو بے اختیار پیسے وار کر دیوی کے چرنوں میں رکھے۔ شیکھر کا خاندان بھی چمکتے سکوں کی جھلملاہٹ میں چل کر آیا۔ ان سے تھوڑا ہی دور اقبال بیگم تابش کو قابو کیے کیے نڈھال لگ رہی تھیں۔

”تابش...... میرا...... بچہ بے وقوفی مت کر...... بہن کی بارات در پر کھڑی ہے، حاجر تیرے نصیب میں لکھی ہی نہیں تھی میرے بچے۔“

”وہ میرے نصیب سے واقعی نکل جائے گی اماں اگر آپ مجھے روکیں گی...... میں اُس کے بغیر نہیں رہ سکتا وہ میرے بغیر نہیں رہے گی میرا انتظار کر رہی ہے وہ مجھے جانے دیں میں پوری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔“ اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے اُلٹی چھری سے اُس کی نبض کاٹی جا رہی ہو۔ حاجرہ کا مہندی سے لکھا رقعہ اُسے چھت پر اپنی جھولتی چارپائی کی ہتھی میں اٹکا ملا تھا۔ لیکن اقبال بیگم اُس کی دیوار بن گئی تھیں۔

”میں جانتی ہوں وہ بھی میری ہی بچی ہے مگر اب وقت بدل گیا ہے تابش یہ تم دونوں کے لیے بہت ہے......“ وہ اُسے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی تھیں پھر اچانک دروازے میں سایہ لمبا ہو گیا۔ وہاں شہاب الدین کھڑے تھے۔

”تم پہ پہلا حق ہمارا ہے تابش...... والدین کے لیے اولاد ہاتھ سینکنے کے لیے ہوتی ہے، ہم تجھے اس دشمنی میں نہیں جھونک سکتے۔“ وہ بے بسی آنکھوں میں مرچیں بھرے دونوں کو دیکھنے لگا۔ با بارات تھی، رونق تھی اور ہنگامے...... لوگ چودھ صاحب کی صاحبزادی کی بگھی کی کوستائشی دیکھتے جو آج سے پہلے اتنی سجی نہ دیکھی گئی تھی۔ اقبال نے انوکھا ہی قدم اُٹھایا۔ جانے کیا سوجھی کہ کستو کے گھر کا دروازہ پار کرتے دکھائی دیں۔ حاجرہ اُ میں سگائی کی انگوٹھی پہن چکی تھی...... یہ وہ منظر تھا نہیں دکھنا چاہیے تھا۔

”حاجرہ میری بچی......“ اُنہوں نے جھک پیشانی چومی تو حاجرہ کے اندر جمی برف ممتا کی گ سے پگھلنا شروع ہو گئی۔

”کاکی ماں......“ وہ سسک اُٹھی۔

Naqar Azeem

”یہ میرے تابش کے لیے سنبھالے ہوئے تھے مگر تم بھی میری ہی بچی ہو...... یہ کنگن اپنی کاکی. ماں کا پیار سمجھ کر پہنے رکھنا، سدا سکھی رہو۔“ چار بھاری کنگن اُنہوں نے حاجرہ کی کلائی میں ڈالے تو ہ آگ کی طرح دہکتے تھے۔ بھون لال اور کستوری کے ساتھ حاجرہ کا متوقع سسرال بھی اجنبیت طاری کیے خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا...... حاجرہ روتے روتے ہنس دی۔

”آپ نے تو اب بیڑیاں ہی پہنا دی یں......“ وہ بغیر ڈرے پُراسرار سا بولی۔ کچھ وقت اور رسمیں ہوتی رہیں اور حاجرہ کا دھیان حویلی کے ور پر اٹکا رہا۔ اُس کے حلق میں کھارا پانی کتنی ہی قدار میں اکٹھا ہو رہا تھا...... اپنے اندر جلتے بھانبھڑ کو باتی وہ بچپن کے وہ سارے دور گھومتی رہی جہاں بھی آنسو سے واسطہ نہیں پڑتا تھا...... ضبط پر وہ جمے زموں سے پھسلنے لگی تو ایک دم اُٹھی اور بھاگتی ہوئی ھلا دروازہ پار کر گئی...... پیچھے بیٹھے نفوس ہکا بکا رہ ئے تھے۔

حویلی کے دروازے پر ہجوم تھا...... رخصتی کا زباتی منظر چل رہا تھا اور عبیرہ اپنوں کے ساتھ لگی سکیوں کے دم گھونٹ رہی تھی۔ حاجرہ ساڑھی کا پلو نبھالتی بھیڑ کو چیر کر اندر داخل ہوئی تو دلہن کے پاس ، بھابھیاں اور اقبال بیگم دور ہو گئیں...... وہ بے ی سے لب کاٹتی غیروں کی طرح اس کے نزدیک نے لگی۔ وہ جو ان کے سب سے زیادہ قریب ی...... اور جس کا ان پر بہت حق تھا......

”وقت بہت ظالم ہے عبیرہ۔ بٹوارا زمینوں کا ملکوں کا ہو...... مگر دلوں کا نہیں ہونا چاہیے......“

سرزمین، حاجرہ اور عبیرہ تینوں لڑکیاں پیشانی ، پیشانی ٹکائے زار و قطار رونے لگیں۔

پنگھٹ کی کماری کا دکھ ریلے کی صورت بہنے
...

وہ تینوں ایسے رو رہی تھیں کہ باراتی دم بخود رہ
......

میراثنیں تھاپ چھوڑ ”لکھیا بابل مورے“ گانا بھول گئیں...... اور بہت پیچھے کھڑی کستوری کی آنکھوں میں پچھتاوا ہلکورے لے رہا تھا۔

مسلمانوں سے دوستی کتنی مہنگی پڑی...... مسلم نام رکھنے کا اتنا اثر تو پڑنا تھا......!

☆☆☆

بارش کے پانیوں نے سیاہ تارکول کو بھگو کر چمکیلا کر دیا تھا۔ رم جھم سے مٹی بیٹھ چکی تھی اور دھلی دھلائی سڑک شفاف لگ رہی تھی...... ایسے میں جب سر پر پنچھیوں کا سایہ منڈلا رہا تھا، اور بولیاں تعاقب کرتی تھیں وہ بغیر کسی پروا کے چادر کا پلو بنائے زمین پر جھک جھک کر کاغذ چنتی اور پلو میں اکٹھے کرتی کوئی دیوانی عورت لگتی تھی...... پہلی نظر میں یہی گمان گزرتا تھا گویا مانگنے والی ہو۔

اپنے متحرک قدموں کے ساتھ نجانے وہ کتنی دیر چلی تھی کہ عقب میں کسی کے بھاگنے کی دھمک اور پھر سست پڑتے قدم کی آواز محسوس ہوئی۔ نو وارد سلیم تھا اور بے طرح ہانپ رہا تھا۔

”تم کیا کر رہی ادھر...... میں کتنی دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔“ سانسوں کو قابو کرتے ہوئے قدرے سکون محسوس کر کے وہ بولا تو حاجرہ رک گئی لیکن خاموش رہی۔

”بندہ بتا کر ہی باہر نکلتا ہے میں ڈر گیا تھا کہ کہیں حلیمہ کی کسی بات کو نہ دل پر لے لیا ہو...... جھلی ہے وہ پر تم......“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ حاجرہ نے آسمان کی طرف نظر کی تھی۔

”آپ کو میرا اتنا خیال کیوں ہے؟“ اُس کا لہجہ جانے کس چیز کے وزن سے بوجھل تھا...... سلیم جیسا سادہ انسان اُس پر غور نہیں کر سکا۔

”تمہاری حفاظت کی زبان دی ہے تمہارا خیال کیوں نہ ہو...... تم کر کیا رہی ہو آخر؟“ سلیم نے الجھ کر سوال کیا جبکہ حاجرہ کے چہرے پر لفظ ”زبان“ سن کر طنز سا بکھر گیا تھا۔ دن کے بوڑھے وجود سے روشنی کا پردہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تنگ پڑنے

لگا......!

’’پاکستان کی دوسری سالگرہ تھی کل سب نے منالی تو آج میں منانے نکلی ہوں...... یہ سبز جھنڈیاں اکٹھی کر رہی ہوں جو جوش سرد پڑنے پر اپنی بے حرمتی پر بہت ہلکی ہو کر اُڑتی جا رہی ہیں۔ یہ پاکستان کی واحد نشانی اور ہم سب کا حوالہ ہیں انہیں ہم محض ایک دن کے لیے نہیں استعمال کر سکتے...... مجھے بہت دکھ ہے یہ سب دیکھ کر، وطن سے محبت صرف ایک دن کی کیسے ہو سکتی ہے؟ انہیں یوں قدموں تلے روندتے ہوئے کسی کا دل نہیں کانپتا جن کو حاصل کرنے کے لیے ان گنت انسانوں نے اپنا آپ روند دیا تھا......‘‘ اُس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں......

سلیم نے لب بھینچ کر بڑی حیرانی کو اُس کو تکا۔

وہ در حقیقت لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔

’’میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں حاجرہ بی بی، مگر......‘‘ وہ کہتے ہوئے جھجک گیا۔ جیسے مناسب الفاظ تلاشتا ہو کہ کیا وضاحت کرے۔

’’تم ایسا سوچ رہی ہو اور کوئی اس طرف خیال نہیں کرے گا...... ہمارا گھر پہلے ہی اتنا چھوٹا ہے اسے کہاں رکھو گی؟‘‘ اسے جگہ کی فکر پڑ گئی تھی۔ حلیمہ یہ سب کچرے کے زمرے میں لا کر گھر میں نہ رکھتی اور وہ حاجرہ کے جذبات مجروح کرنے سے بچنا چاہ رہا تھا۔

’’میں نے جو کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ میں صرف اپنے ضمیر کو جواب دہ ہوں...... اور یہ جھنڈیاں۔‘‘ وہ آنسو پونچھ کر مسکرائی اور اپنی قیمتی متاع تھپتھپائی۔

’’اپنا تکیہ بنا کر رکھ لوں گی ساری رات اس کی خوشبو سونگھتی رہوں گی آپ نہیں جانتے اس کے لیے میں نے اپنا گھر کھویا ہے اپنے پیارے رشتے...... ماں باپ، بھائی سہیلیاں اور وہ......‘‘ پنچھیوں کے پر کرب ناک انداز میں پھڑپھڑائے اور اُس کے حلق کے گیلے سرنگ سے باقی الفاظ پیچھے کو پھسل گئے...... اس ایک کا ذکر لبوں تک لانے کی تاب وہ نہیں رکھتی تھی۔ ’’اور جو چیز اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کی جائے نا اُس کی ناشکری کرنے سے حال بہت برا ہوتا ہے...... مجھے تو اپنے ضمیر کو جواب دینا ہے نا۔‘‘ وہ دھیمی آواز میں کہہ کر سلیم کے سامنے سے گزرتی گھر کی اور جانے لگی...... جھنڈیاں کسی خزانے کی طرح اُس کے سینے سے لگی تھیں۔

ڈوبتے دن میں سلیم کے گرد سناٹے سے چکر رہے تھے۔

وہ روتے ہوئے اس کا دل میچ رہی تھی...... اس کا کرب کتنا گراں گزرتا تھا۔ وہ اتنی عمر کی نہیں لگتی تھی لیکن وقت سے پہلے اس کا حسن سوگواریت میں ڈوب چکا تھا۔

’’واقعی...... بات تو ساری ضمیر کی ہوتی ہے نا۔‘‘

☆☆☆

ہندوستان نہیں بٹے گا
گاندھی کا خواب زندہ رہے گا
پاکستان نہیں بنے گا......

کچی گلی میں پسینے سے شرابور غیر مسلم بچوں جلوس ہنگامہ مچاتا ہوا جا رہا تھا...... حالانکہ اب راہیں ہموار ہو چکی تھیں۔ جون 1947ء کے منصوبے تحت برطانیہ حکومت نے جولائی کے وسط میں برصغیر کو تقسیم کرنے کے لیے قانون آزادی ہن نا صرف منظور کیا تھا بلکہ لارڈ ولول کی ناکامی کے بع آخری وائسرائے کی حیثیت سے اختیارا سنبھالنے والے ماؤنٹ بیٹن کو بھی پسپائی کا سا کرنا پڑا تھا......

حاجرہ نے سنا تو پلکیں بھیگ گئیں۔ تابش پ اپنے رہنماؤں کا جادو طاری تھا۔ اُن کے نظریا حقائق اور اُصولوں کے نچوڑ تھے تب ہی تو عوام آزادی کی اصلی روح جاگ پڑی تھی...... لیکن گڑھ تو ویران پڑتا جا رہا تھا۔ اُس کی ساری شادا انسانی چیخوں، لہوؤں کی خنکی اور زیادتیوں کی آ میں خشک پڑتی دکھتی تھی۔ حاجرہ کو ان دنوں اپنی سے نفرت ہو چلی تھی جن کی فرعونیت سے لباس

جارہے تھے...... شہاب الدین کی حویلی پر قدم پڑنے کی جرأت کسی کی نہیں ہوئی تھی...... وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ جرأت اُس کا بھائی کرنے والا ہے۔

بھون کے گھر میں اس دن چلچلاتی دھوپ میں تلسی کا پودا مرجھایا کھڑا تھا اور گلی سے بلند ہوتا شور اُسے صاف سنائی دیتا تھا جب اشوک پسینہ پونچھتا گھر میں داخل ہوا۔

”کہاں گئے تھے؟“ حاجرہ نے پہلا سوال یہی کیا۔ وہ آج تک ”وعدہ“ نباہنے کے درپے تھی اسی لیے گھر میں صرف اشوک سے خود مخاطب ہوتی تھی۔ اشوک چھاؤں میں آگیا۔

”تابش کے پاس سے آرہا ہوں......“

”کیسا تھا وہ......؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

اشوک نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ کیسی ہر چیز سے بیزار ہوگئی تھی وہ...... زندگی کا جیسا مقصد ہی چھن گیا ہو۔ کوئی پکار لیتا تو اُٹھ پڑتی ورنہ پڑی لیٹی رہی۔ بھیا اُس پر کڑی نظر رکھتے پر وہ تو زبان دے چکی تھی نا، مجال ہے پھر کہ تابش سے اب ملتی ہو...... اشوک کو اس کا دکھ بہت کاٹتا تھا پر بھلائی شاید اسی میں تھی۔ شیکھر گھر آتا تھا تو بات کر لیتی تھی بھلے جذبات سے عاری اور چھوٹے چھوٹے بے معنی جواب...... پر تابش پاکستان چلا جائے گا تو سمجھوتا کر جائے گی۔ اشوک نے گہری سانس آزاد کی۔

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہی ہوگا۔“

”حالات بدتر ہوتے جارہے ہیں وہ لوگ جاتے کیوں نہیں؟“

”اُنہیں انتظار ہے کہ شاید یہ علاقہ پاکستان ں شامل ہوجائے...... کاکا بھی راضی نہیں ہورہے۔“

”وہاں سب کیسے رہیں گے اشو......؟“

”کلیم داخل کروادیں گے تو وہاں بھی اُنہیں سب مل جائے گا، مسئلہ اُس جگہ کو چھوڑنے کا ہوتا ہے ہاں انسان اپنی آدھی عمر بتا چکا ہو۔“

”وہ وہاں خوش رہیں گے اشوک......“ اشوک نے یکایک محسوس کیا کہ اُس کی آواز بھیگی ہوئی ہے۔ اُس نے سر اُٹھایا تو بے آواز آنسو رخساروں کو طے کر کے ٹھوڑی پر لٹک آئے تھے۔ تابش سلیم اور اُس کا خاندان واحد موضوع تھا جس پر احساس ہوتا تھا کہ اس بے حس لڑکی کے اندر ابھی بھی جذبات تلاطم پیدا کرسکتے ہیں......

”وہ خوش رہیں گے اور تم؟“

”میں بھی خوش رہوں گی۔“

”اچھا ایسے رو کے حاجرہ......“ اشوک کے کہنے پر اُس کے رونے میں مزید تیزی آگئی۔ وہ اُسے اکثر ”آنندی“ کے بجائے حاجرہ مخاطب کرتا تھا، اُسے خوشی دینے کی معمولی سی کوشش...... کچھ پل وہ اسی طرح ہچکیوں سے روتی رہی۔

”روتی تو یہ بدبخت آنکھیں ہیں اشو...... ورنہ میں کہاں اتنی کم ظرف ہوں کہ تمہارے تابش صاحب کو خوش نہ رہنے دوں...... کیا ہے کہ جب بھی روؤں تو وہ لازمی اُداس ہوجاتا ہے۔“ وہ اُنگلی سے آنسو اُٹھا کر خود ہی ہنس پڑی۔ اشوک ساکت سا اُسے دیکھتا رہ گیا وہ بے پروائی سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔

سخت گرمیوں کے صبر آزما روزے شروع ہوئے تو فصلیں پگھلے سونے کا نظارہ پیش کرنے لگی تھیں۔ گھر گھر میں ریڈیو پر نشر ہوتی خبروں کی آوازیں سنائی پڑتی رہتی تھیں...... فیصلے عجلت میں کیے جارہے تھے اور سب کچھ طے پاتا جارہا تھا۔ دونوں ملکوں کی زمینی حد بندیاں جاری تھیں...... فضائی حد بندی ہورہی تھی...... مسلمانوں کے عظیم رہنماؤں نے فتح کے جھنڈے گاڑھ دیے تھے اور انسان اپنے آپ کو پانے جارہا تھا......

کشن گڑھ پاکستان کی حدود میں نہیں آیا تھا بہت سے مسلمانوں کے گھر خالی ہورہے تھے۔ راتوں کی ہجرت تیز رفتاری سے جاری تھی۔ سمراٹھ کا آزادی سے کچھ دن قبل حاجرہ سے سامنا ہوا تو وہ اُس کے چہرے کے آثار کھوجنے لگی۔ اُسے وہاں

شکست، حقارت، نفرت آمیز احساسات کے ساتھ انتقام کی آگ کے شعلے بھڑکتے نظر آئے۔ پچھلی رات اُس نے کھڑکی سے لگ کر سمراتھ کی اپنے دوستوں کے ساتھ سنی مبہم گفتگو سے یہی سمجھ پائی تھی کہ وہ کوئی سوانگ رچنا چاہ رہا ہے...... پھر اُس کی تسلی کے لیے یہ کافی ہوگیا کہ اشوک نے باتوں باتوں میں اُس سے کہا تھا کہ کالی چرن کو اُس نے حویلی کا کواڑ بجاتے دیکھا...... قریب جانے پر پتا چلا کہ پولیس اور خاکساروں کے تصادم میں کافی فساد برپا ہوا، گولیاں بھی چلائی گئیں اور تابش کے ایک مسلمان دوست نے سپاہی کا سر پھاڑ دیا جس کی پاداش میں وہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا ہے...... تابش نے بس اتنا سنا اور لکھنو روانہ ہوگیا وہ کشن گڑھ میں نہیں ہے......!

اچھا ہوا وہ سمراتھ سے دور ہے۔

سرمئی پڑتی مغرب میں روزہ افطار کا سائرن بجنے لگا تو وہ اپنے لیے پانی اور کھجوریں لے کر چھت پر چڑھنے لگی۔ سمراتھ نے پائپ سے منہ دھوتے ہوئے اُس کی حرکات پر نظر ڈالی اور اُس کے پیچھے شک کی آڑ میں چھت پر آگیا۔ اُوپر وہ تخت پر دوپٹا اچھی طرح سر پر لپیٹے آنکھیں موند کر دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ سمراتھ نے ضبط سے لب بھینچ لیے۔

”تم نے برت رکھا ہوتا تو تمہیں خبر ہے تمہارا بڑا بھائی تم سے کتنا خوش ہوتا...... تمہارا بھوکا رہنا بھی بیکار جاتا ہے آنندی۔“ وہ افسوس سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا تو اُس نے سکون سے پانی کے گھونٹ اُتارے اور اطمینان سے اپنے ”بڑے“ بھائی کے احترام میں تخت سے اُتر کر زمین پر کھڑی ہوگئی...... فضاؤں میں مقدس سی خاموشی تھی جو روح میں اُتر جاتی تھی۔

”برت میں رکھ لیتی مگر شاید کسی کی حفاظت یا لمبی عمر کے لیے رکھا جاتا ہے ناں؟ اور میں وہ جس کے لیے رکھتی اُس پر آپ ہی کا اعتراض ہوتا...... اور مقصد تک آپ مت جائیں یہ میرے اور اللہ کا معاملہ ہے۔“

”اپنی بکواس بند کرو۔ تم بہت خود سر ہوگئی ہو...... جانتی ہو شیکھر کٹر ہندو ہے وہ تمہارا کیا حشر کرسکتا ہے تمہیں اندازہ نہیں ہے ابھی۔“ وہ چبا چبا کر بولا جیسے اسے کھا جائے گا۔

”مجھے یہ ہدایت اللہ نے دی ہے میرے لیے آسانیاں وہی پیدا کرے گا......“ اُس کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔ ایک پل کو تو سمراتھ بھی کچھ بول نہیں سکا۔ پھر استہزائیہ ہنسی حاجرہ کے اردگرد پھیلتی چلی گئی۔

”اپنے اللہ سے میرے لیے ہدایت کیوں نہیں مانگتیں؟“

”میں نہیں مانگ سکتی......“ اس کے سنجیدہ جواب پر اس نے مزید اُونچا قہقہہ لگایا مگر وہ اسی انداز میں کہتی گئی۔ ”میرے مانگنے سے اللہ شاید ہدایت نہیں دے گا...... کیونکہ ہدایت تو صرف اُنہیں ہی بانٹی جاتی ہے جو اُس کے طلب گار ہوں، ہمیں اللہ کی ضرورت ہوتی ہے اللہ کو ہماری نہیں......“

”اُس مسلم لڑکے نے تمہارا دماغ خراب کردیا ہے تم ایک ہندو ناری ہو اور اسی مذہب کی پیروکار رہو گی...... کوئی اتنی آسانی سے اپنا اصل نہیں چھوڑ سکتا آنندی، تمہیں میں چھوڑنے بھی نہیں دوں گا۔“ اُس کی بات پر حاجرہ کے لبوں پر شگوفے کی مانند ہنسی چمکی اور پھوٹ کر واضح ہوگئی۔ نظریں اُٹھا کر اُس نے بہت عرصے بعد محظوظ کن مسکراہٹ سے اُس کو یوں دیکھا جیسے کسی بچے کی معصومیت کو داد دی جاتی ہے وہ ایک قدم آگے آئی اور بڑے پیار سے مدھم بولی۔

”آپ کو دی گئی زبان پر ایمانداری سے قائم دیکھ کر بھی آپ کو یقین نہیں آتا کہ میں کون ہوں اور میرا اصل کیا اشارہ کر رہا ہے؟“

اُس کی مصنوعی معصومیت نے سمراتھ کا چہرہ سرخ کردیا۔ چھت کی منڈیروں پر نیلگوں اُجالے نے پر پھیلانے شروع کیے ہوئے تھے اور سیاہی اُن

Vladar Azeem

میں گھلتی جا رہی تھی......!

"تمہاری آنکھوں پر اہنکار کا پردہ ہے ورنہ تمہیں نظر آتا کہ اُس نیچ انسان نے تم سے صرف کھیلا ہے...... ایک مسلمان اپنے مخالف مذہب کی لڑکی سے کبھی محبت نہیں کر سکتا، اُس نے ہمارے اعتبار کا فائدہ اُٹھا کر ہماری عزت پر نقب لگانے کی کوشش کی ہے۔"

"میرے رشتے کو غلیظ گالی مت دیں۔" اُس کے لہجے کی مضبوطی تھی کہ آواز میں کرختگی اُتر آئی۔ "آپ کا متر شیکھر متوقع شوہر ہو کر بھی جس طرح کی حرکات کا مظاہرہ کرتا ہے کاش آپ دیکھ سکتے کہ کس کے دل میں پاکیزگی ہے اور کون سا انتخاب نیچ......"

"بس......" اُس نے ناگواری سے ہاتھ اُٹھا دیا پھر افسردگی سے لب کشائی کی۔ "میں نے تمہیں جب راستہ دکھانے میں مدد دی وقت برباد کیا...... تمہاری ریکھاؤں میں بربادی ہی لکھی ہے، مجھے تجھ سے کتنی محبت تھی آنندی......" اُس کے جذبات اتنے خود غرض ہوتے تھے کہ دل پگھلانے کے بجائے مکاری کی بو آتی تھی۔

"اور آپ کو بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ اس محبت کا قرض مجھے کتنی قیمتی چیز سے ادا کرنا پڑا ہے۔"

وہ آنکھوں کے بھیگے گوشوں کے ساتھ تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی تھی۔ اُس کا ہلدی کا فنکشن جلدی رکھا گیا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ تابش کے آنے سے پہلے ہی چلی جائے...... وہ خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی وقت پڑنے پر نجانے کیا کرے گی۔ پھر تابش تو نہیں آیا چند دن بعد وطن آزاد ہو گیا۔

حویلی میں سرزمین اور اُس کی بھابیوں کی خوشی دیدنی تھی۔ اقبال بیگم اور شہاب الدین عبیرہ سے ملنے گئے ہوئے تھے کہ وہ جی سے تھی اور سرزمین اُڑتی اُڑتی پھر رہی تھی۔ اُفقی کناروں پر سرخ دھاریاں ایسی پھری ہوئی تھیں جیسے اپنی جیت پر کسی انسان کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔ سرزمین نے اپنی بھابیوں کی ریشمی قمیصیں اکٹھی کیں اور اپنے دوپٹے لے کر جھنڈا کاڑھنا شروع کر دیا۔

"یہاں سے جاتے ہوئے جھنڈا حویلی کی اُونچی منڈیر پر گاڑھ کر جائیں گے۔" وہ خوشی سے آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ سامان باندھتی اُس کی بھاوجیں اور بھائی ہنس اُٹھے۔

"لڑکی پاگل ہوئی ہے......" اور پاگل بس جھنڈا سیتی رہی۔ دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ گلی میں نکلو اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر فتح کے نعرے لگاؤ کہ آج انسان آزاد ہے اور اس کی بقاء قائم ہوئی...... مشعلیں لے اور آخری دفعہ ہر غم زدہ انسان کو روشنی دکھا آئے کہ قربانی رائگاں نہیں گئی...... اُسے آن واحد میں حاجرہ یاد آئی وہ اُسے بھی تو مل کر جائے گی اور یقین دلائے گی کہ حالات سازگار ہونے پر سرزمین اس کے پاس آتی رہے گی...... وہ اس حویلی کا خیال رکھے جو اُن سب کے اچھے وقتوں کی امین تھی۔

لیکن پھر اچانک زمین میں بھونچال آ گیا......

ڈھول پیٹنے کے زوردار شور اور "ہر ہر مہادیو" کے نعروں نے انسانوں کے قدموں سے زندگی کی لہر کو کھینچنا شروع کر دیا۔ اور جب مسجد سے آذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور مندر کے گھنٹے بھی جھول رہے تھے تو اُونچی منڈیر پر کھڑی سرزمین نے دیکھا فرعون آخری حملہ کرنے ہجوم کی صورت اژدھے جیسی زبانوں میں پھنکارتے زمین پر دندناتے چلے آ رہے تھے...... دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

گنڈاسوں، کلہاڑیوں، اسلحے، بلم، چھریوں اور خنجروں کی آوازوں نے فضاؤں میں چھنکار پیدا کر دی تھی۔ مسلمان اندھا دھند بھاگنا شروع ہو گئے...... کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ تیل چھڑک کر گھروں میں شعلے بھڑکائے جانے لگے مسجدوں کے صحن میں الاؤ روشن کر کے لوگ زندہ اُٹھا اُٹھا کر آگ میں جھونکے جانے لگے...... عزتیں سرعام مسلی جانے لگیں اور گردنیں یوں چہار سمت اُڑنے لگیں جیسے گرم دنوں میں کشن گڑھ کی گلیوں میں مختلف مذہب

کے بچے مٹھی بھر بنٹے، گولیاں کھیلنے کے لیے زمین پر پھینکا کرتے تھے۔

سرزمین نے تیزی سے خود کو پیچھے کیا اُس کا بھائی بھابھی پچھلی کھڑکیوں سے کود گئے تھے اور بہت سے لوگ یہی کر رہے تھے...... کسی بھی شے کی پروا کیے کوئی کھڑکی کودتا کوئی چھت سے کود کر ریڑھ کی ہڈی تڑوانے لگا، کسی کے پاؤں مڑ گئے اور کہیں بھیجے بکھرنے لگے...... حویلی کے صحن میں سرزمین کا بھتیجا مم مم کرتا مٹی کھا رہا تھا۔

فضا انسانی چیخوں اور دھوؤں کے بگولے میں آنے لگی۔ غیر مسلم بچے قیمتی اشیاء اور سامان لوٹنے لگے اور چھتوں سے تماشا دیکھتے ہوئے اُن کی مائیں اس پر پھولے نہ سمائیں...... لڑکیاں بے آبرو ہو رہی تھیں، جوان بھائی زندگی کی آخری ہچکی لیتے یہ مناظر دیکھ رہے تھے اور زمین لرزنے لگی تھی۔

”اللہ کا واسطہ ہمیں جانے دو...... وے ویرا ہم پہ رحم کھا...... ہم تمہاری بہنیں ہیں، ہمیں اپنے وطن جانے دو......“

”میری بیٹیوں کو جانے دو...... مجھے مار ڈالو...... میری بوٹی بوٹی کر ڈالو...... میری جوان بیٹیوں کی بے حرمتی بوڑھے باپ کی آنکھوں کے سامنے مت کرو...... میری سفید داڑھی پر نظر ڈالو۔“

”میرا بچہ...... میرا اکلوتا بیٹا، اپنے بھگوان کو مانو اسے کچھ مت کرو...... میری لاٹھی ٹوٹ جائے گی، میں کس کے سہارے وطن لوٹوں گا......“

کتنی ہی آوازیں تھیں جو ایک دوسرے کے بین اوڑھ کر منہ پر ماری جا رہی تھیں اور ظالموں کی رسی دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی تھی...... پلک جھپکتے ہی گھروں کے صحن خون سے نہا کر باہر گلیوں میں بہتے چلے آئے...... ہر طرف آگ اور خون تھا اور اس سب میں سب سے آگے وہ...... سمراٹھ بھون لال...... جس کی سازش آج پوری ہونے کو آئی تھی۔

سرزمین سیڑھیوں سے بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور اسی وقت پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے حویلی کا پھاٹک دو بار کھلا اور بند ہوا۔ وہ پچاس ساٹھ لوگوں کا لشکر تھا جو دوسرے گاؤں سے بھی شرکت کو شامل تھا مگر حویلی میں پہلا قدم رکھنے والا سمراٹھ...... سرزمین اُچھل کر پلٹی وہ شیطانیت آنکھوں میں بھرے فاتحانہ انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

”تو باقی سب دم دبا کر بھاگ گئے...... چلو انارکلی تو یہیں چھوڑ گئے۔ مسلمانوں کی عورتیں تو یوں بھی ہمارا تحفہ......“

اُس کی غلیظ بات پوری نہیں ہوئی تھی اور سرزمین نے خوف کو پسِ پشت ڈال کر پوری نفرت سے اُس کے چہرے پر پانچ اُنگلیوں کی مہر ثبت کر دی۔ اُس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا تھا۔

”معصوموں پر ظلم توڑ کے خود کو مرد سمجھتے ہو...... اس تھپڑ سے وہ تماچا کہیں زیادہ کاری ہے جو مسلمان مردوں نے آزادی کی صورت تم نیچ لوگوں کے منہ پر مار کر شکل مسخ کر دی ہے۔“

سرزمین کے انگ انگ میں چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں...... لیکن سمراٹھ پر تو تیزاب پھینک دیا گیا تھا۔ طیش سے اُس کی کانوں کی لوئیں سلگیں اور اگلے پل وہ جنونی انداز میں اُس پر درندے جیسی طاقت میں جھپٹا تھا۔ حویلی میں کچھ اور لوگ گھس گئے اور کونے میں گھبرا کر روتے بچے کو دیکھ کر ان کی رال ٹپک گئی۔ سرزمین ان کے ارادے بھانپ کر سراسیمگی سے چلائی مگر اُس کی آنکھوں کے سامنے اُونچے اُونچے قہقہے لگاتے شیطانوں نے بچے کے وجود کو تراشنا شروع کر دیا...... سمراٹھ نے اُس کے بال کاٹ کر جس لمحے حویلی کی دہلیز پر بکھیرے سرزمین کی درد انگیز چیخ دیوار پار تلسی والے گھر میں حاجرہ کے کانوں تک گئی تھی۔

نجانے اس معصوم لڑکی کو سزا دے کر اُس کی کمینگی کے کس جذبے کی تسکین ہو رہی تھی...... تابش اور حاجرہ کی محبت کا جرم...... مسلمانوں سے نفرت کی انتہا...... اور اتنے وقت سے پلتا بغض اُس نے گلی میں نکل کر خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے باقی

لوگوں کو آواز دی۔

”اوئے شیکھر۔ چل اسے پکڑ...... اور دعوت سمجھ کر عبرت ناک موت کے گھاٹ اُتار دے......“ چند آدمی اُس کی طرف لپکے اور وہ خود حویلی کا خزانہ سمیٹنے اندر گھس گیا۔

اپنے کمرے سے نکل کر حاجرہ پاروتی کے پاس آئی جو نچڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ ساکت اور بے دم...... حاجرہ نے قریب جا کر سخت پریشانی کے عالم میں اُسے ہلایا۔

”باہر یہ شور کیوں ہو رہا ہے اتنا......؟“

”مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے...... آج خون کی ہولی بہت دیر تک تھمے گی۔“ وہ آنسو پیتی بولی۔ حاجرہ کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔ ”تم یتیم ہو گئیں آنندی...... کپل نے آ کے بتایا بھون باپو کی چوک میں کسی مسلمان نے ہتھیا کر دی کستوری مائی بھی ساتھ تھی کچھ خبر نہیں کہ......“ وہ کچھ اور بھی کہتی گئی مگر حاجرہ نے کچھ سنا ہو تب۔ اُس کی سوئی بس پاروتی کی پہلی ہی خبر پر اٹکی تھی...... مسلمانوں کو نکالا جا رہا تھا تابش کا حویلی میں موجود نہ ہونا...... اشوک کی بات کہ کالی چرن کی خبر، پر کالی چرن آخر کیوں سندیسہ پہنچانے آتا؟ کیا یہ سمراٹھ کی کوئی چال تھی اور حویلی والے......؟ وہ اندھا دھند باہر کو بھاگی۔

گلی میں مسجد کے ساتھ کتنے ہی بھیڑیے لاشوں کو قدموں میں کچلتے حوا کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ حاجرہ کی نظر وہاں تک اُٹھی تو پتھرا گئی۔ وہ شل سی اُس معصوم لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کا لباس ہزار گوشوں سے پھٹا تھا اور چاک لٹک رہے تھے...... بال بے دردی سے اُکھڑے تھے اور کچھ سر پر رہ گئے تھے اور شکل پر چھریوں کے اتنے گھاؤ تھے کہ وہ اپنے ہی آپ میں سمٹتی خون میں نہائی دکھائی نہ پڑتی تھی کہ رو رہی ہے یا اپنی عزت کا خوف لیے پتھر ہو چکی ہے۔ یہ وہ تھی جس کے وقار کے سامنے حاجرہ ان گنت بار متاثر ہو جاتی تھی۔ وہ آج سرکس کا تماشا بن چکی تھی۔

حاجرہ نے پوری قوت سے چلا کر اُنہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”رک جاؤ...... میں کہتی ہوں چھوڑو اُسے۔“

اُس کی دھاڑ کے ساتھ ہی سرزمین جو اپنی جان دینے کے لیے چھرا اُٹھانا چاہتی تھی ہوا میں بلند ہوا خنجر اُس کی پشت سے ٹکرا کر پیٹ میں کروٹ بدلتا زمین میں گڑھ گیا۔ خنجر کی نوک سے خون زمین کی خاک کو سیراب کرتا جا رہا تھا...... اور آسمان کو دیکھتی لڑکی کی آنکھوں میں زندگی کی رمق بجھتی جا رہی تھی......

حاجرہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی اُس کے پاس پہنچی جو تڑپ رہی تھی۔ اُس کے اُوپر جھکی حاجرہ کے لیے زندگی کے معنی بے مایہ ہو گئے تھے...... سرزمین زمین پر ہاتھ مارتی کلمہ ادا کر رہی تھی۔

”میری...... کلمہ کی گواہ بنو...... مجھے کلمہ...... پڑھاؤ......“ اُس نے زاروقطار روتی حاجرہ کا ہاتھ تھاما جو بلا کا سرد تھا۔ پھر ٹوٹ ٹوٹ کر دونوں کلمہ بلند کرنے لگیں......

”ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ سرزمین...... میں تمہارے بھائی کو کیا جواب دوں گی خدا کے لیے مجھ پر یہ بوجھ مت ڈالو......“ وہ سرزمین کا پیٹ پکڑے جھنجوڑتے ہوئے اُسے جگانے لگی...... اُس کا منہ کھلا تھا زبان اب ہلنے سے انکاری ہو گئی تھی۔ اور آنکھیں وا رہ گئیں......

”تمہارے لیے یہ جگہ نہیں مگر پاکستان تو ہے جو تم جیسی پریوں کی جنت ہے...... اللہ کے پاس مت جاؤ......“ مگر وہ جا چکی تھی۔ سرزمین کا سر اُس کے سینہ سے دور ہوا تو وہ دور جا چکی تھی...... اللہ کے پاس۔ حاجرہ جھٹکا کھا کر کرلاتی ہوئی پیچھے ہوئی۔ تماش بین فرعونوں کو سانپ سونگھ چکا تھا۔

”یہ کس کی لڑکی ہے......؟“ کسی نے پوچھا۔

”یہ تو بھون لال کی چھوکری لگتی ہے......“

”ہاں ہاں اپنے شیکھر کی ہی تو منگ ہے......“

”پر یہ باتیں کیسی کر رہی ہے...... اللہ، جنت ہندو کی بیٹی ہو کر......“

”نہیں ہوں میں ہندو کی بیٹی......“ سر اُٹھا کر

وہ کسی قدر غراہٹ سے چیخی۔ ”سنا تم لوگوں نے...... نہیں ہوں میں ہندو کی بیٹی، آدم کی بیٹی ہوں میں...... حوا کی بیٹی، جن کے بچوں پر تم لوگ ظلم توڑ کر خود پر رحم کا گھیرا تنگ کر رہے ہو...... اللہ سب دیکھ رہا ہے اور وہ ان بے قصوروں کی فریاد سن کر تم سب کے لیے جہنم تیار کر رہا ہے جس میں تم سب لوگ جل جل کرر ہوگے پر مر نہیں پاؤ گے...... تم سب کی زندگیوں پر لعنت بھیجتی ہوں میں جو بزدلوں کی طرح اپنی شکست برداشت نہ کر سکنے کا بدلہ کمزور لوگوں سے لے رہے ہیں......“

وہ ہذیانی انداز میں حلق پھاڑ کر چلا رہی تھی جیسے اپنی آواز سے ہی سب کی جان کھینچ لینا چاہتی ہو...... ہر طرف سکوت چھا چکا تھا تو تماشا ختم ہوا۔ ایسے میں ایک آدمی بھڑک کر بولا

”یہ مسلمان ہو گئی ہے۔ اللہ سے ڈرا رہی ہے...... اس کی ہمارے بیچ کوئی جگہ نہیں، مار ڈالو اس پاپی کو...... اپنے دھرم سے ہٹنے کی سزا صرف موت ہے۔“ مجمعے میں طیش کی لہر دوڑ گئی اور حاجرہ بے اختیار دو تین قدم پیچھے ہٹی...... موت نے اُسے ہوش میں لا کھڑا کیا تھا۔ اسی وقت کہیں سے اشوک زخمی سا بھیڑ چیرتا نمودار ہوا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگا...... دو تین خنجروں نے اُن کا تعاقب کیا لیکن شیکھر اور حویلی سے نکلے سمراٹھ نے سامنے آ کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔

”شانت شانت ابھی بدلہ پورا نہیں ہوا...... میری بہن کو مسلمانوں نے ورغلایا ہے اور ہمارا ایک گناہ گار ابھی باقی ہے...... تابش لکھنؤ سے لوٹتا ہی ہو گا اور وہ میری بہن سے ملنے کی کوشش ضرور کرے گا...... اسے ختم کرنے کے لیے اپنا جذبہ و مردانگی ذرا سنبھال کر رکھ لو۔“ اُس کی مکار مسکراہٹ نے انگاروں پر پانی چھڑکنے کا کام کیا...... ایک اہم کڑی تو باقی تھی۔ سمراٹھ کی سرخ آنکھوں کی حدت بڑھتی جاتی تھی......!!

☆☆☆

ہیبت ناک اندھیرا ہر روشنی نگل چکا تھا۔ مختصر سے گھر کے دونوں کمروں سے زرد روشنیاں لپک رہی تھیں اور اباجی کی کوٹھی اندھیری تھی۔ سلیم نے عشا کی نماز کے بعد بیرونی دروازہ بند کیا اور نلکے سے پانی پیا...... پھر صحن کے وسط میں آ کر وہ ٹھٹک گیا۔ جو وہ کرنے والا تھا اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے ایک بار پھر خشک پڑتا حلق تر کرنے کی ضرورت ہے...... اُس کی نگاہیں آدھ کھلے دروازے پر ٹکی رہیں پھر ہمت کرتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ایک پل سانس درست کر کے اُس نے کندھے جھٹکے اور حاجرہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر پٹ بھیڑتا دروازے کے پیچھے گم ہو گیا......

صحن میں چولہے کے پاس انگاروں پر دودھ گرم کرتی حلیمہ کے گرد ڈھیروں سناٹے اُتر آئے تھے......

کون ہے وہ حاجرہ...... اور اس کا شوہر سلیم......؟

اُس کی ذات کی دھجیاں بکھرنے لگیں......!

☆☆☆

سارا وقت روتے رہنے کے سبب اُس کی آنکھوں میں اب مرچیں بھری ہوئی تھیں اور حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے...... دونوں بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد لپیٹے، گردن ایک سمت کو لٹکائے کئی گھنٹوں سے اُس کی کمر تختہ ہو رہی تھی اور آنکھوں کے پپوٹے سوج رہے تھے۔ لیکن آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ تھمتا نہیں تھا...... گاؤں میں طوفان کے بعد کا خوف ناک سکوت چھایا تھا اور ہو کا عالم تھا۔ دونوں بہن بھائی غم کی شدت سے ایک لفظ نہیں بول پا رہے تھے......

”حاجرہ پانی پیو گی؟“ اشوک نے بہت دقت سے زکام زدہ آواز میں اُس سے پوچھا۔ بو ہوئے اُس کو گلے کی تکلیف سے دوچار ہونا پڑ دونوں چھت پر بنی کوٹھڑی میں بیٹھے تھے...... سر کو دفنانے کے بعد سے اشوک اُسے یہیں لایا اُسے خوف تھا کہ شدت پسند ہندو اُس کی بہن ک

مار ڈالیں گے......

حاجرہ کے نفی میں سر ہلانے پر بھری آنکھوں سے پانی چھلک کر رخساروں پر اُلٹ گیا۔ اُس کے پاس ایک یادیں بچی تھیں...... اُن کا اختتام بھی کرب انگیز موڑ پر ہوا تھا۔

”تابش کو کسی طرح حفاظت سے یہاں سے بھیج دینا اشو...... اسے میری زندگی کی آخری خواہش مجھ لو۔“ وہ نڈھال ہو کر بول رہی تھی...... دل جانے کیوں بار بار کہتا تھا کہ وہ یہیں آئے گا اپنے خاندان کے پاس...... اشوک نے افسردگی سے اس کی طرف یکھ کر جواب دیا۔

”وہ میرا دوست بھی ہے حاجرہ...... مجھے اس کی فکر نہیں ہوگی؟“

”کیوں ہوگی...... مت بھولو کہ ہماری رگوں میں بھی سمراٹھ جیسا خون دوڑتا ہے۔“ وہ حد درجہ تلخی سے بولی۔ شاید اب کڑواہٹ اُس کے اندر سے ختم نہیں ہو سکے گی۔

”خود کو اُن سے مت ملاؤ...... ہم اُن جیسے نہیں ہیں۔“

وہ شدید ناراضی سے دوسری طرف منہ پھیرے ایک بار پھر رونے کو ہو گئی۔ اپنے آپ سے خفا ہو چکی تھی اور پوری دنیا سے...... پھر جب وہ پتھر کا سمہ بنی منجمد بیٹھی تھی تب وہ آ گیا۔ وہ تابش سلیم...... س کا سامنا کرنے کی ہمت اُس میں نہیں تھی...... شوک اور وہ حویلی کی چھت سے اُتر کر اُن کی چھت پر کودے تھے۔ وہ ساکت سی اس شخص کو کتنے ماہ کے عد دیکھتی رہ گئی۔

”کچھ ہی دیر میں رات ہو جائے گی تب تک تم ہاں بیٹھو تابی...... اندھیرے میں نکلو گے تو کسی فلے میں شامل ہونے تک فسادیوں کی نظروں میں نے سے بچے رہو گے۔“

اشوک نے حاجرہ کے سامنے اُسے مشورہ دیا۔ دونوں روئے روئے لگتے تھے لیکن اُس کے سامنے ط کر رہے تھے...... اپنی اپنی عمروں کے یادگار سال ایک دوسرے کے ساتھ گزار کر جدا ہو جانا آسان نہیں ہوتا...... زندگی بھر دل کے اُن خانوں میں کسک اُٹھتی رہے کہ پھر کبھی شکل دیکھنا بھی نصیب ہو نہ ہو...... ایک ساتھ بہت سے غم تھے۔ بہت سے انسانی جذبوں کے عذاب تھے جن سے دونوں گزر رہے تھے...... حویلی اب کھنڈر بنی نظر آتی تھی، اس کی رونقیں بجھ چکی تھیں۔

حاجرہ اور تابش ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے، اُس کی آنکھیں بار بار گیلی ہوتی تھیں جنہیں وہ بازو رکھ کے آستینوں سے پونچھ ڈالتا...... اشوک وقفے وقفے سے خاموشی کو توڑ لیتا۔

”باقی سب لوگ تمہیں پاکستان میں مل جائیں گے تابی......“ اُس کا کندھا تھپتھپا کر اُس نے تسلی دی تابش نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ان شاء اللہ...... سب پہنچ جائیں گے، میں اُنہیں ڈھونڈھ لوں گا۔“

”ہماری طرف سے دل میں کوئی......“

”ایسی بات کر کے دل مت جلاؤ...... تم ہمیشہ اپنا خیال رکھنا۔“ تابش نے کندھے پر ہاتھ مار کر ناگواری دکھائی تو اشوک زخمی سا ہنس دیا۔ حاجرہ کو لگا اُس کا دل ان کی باتوں سے پھٹ جائے گا......

سورج تقریباً ڈوب گیا تھا اور آسمان میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ تب اچانک بے ہنگم انداز میں دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا...... اشوک نے تیزی سے اُچک کر گلی میں جھانکا۔ چار پانچ افراد مکروہ شکلوں کے ساتھ دروازہ پیٹ رہے تھے اور کچھ حویلی سے گھس رہے تھے...... اتنے میں کپل (سمراٹھ کا بارہ سالہ بیٹا) حواس باختہ اوپر آیا۔

”چاچو کچھ لوگ اندر آ رہے ہیں...... کہتے ہیں ہم نے مسلمانوں کو پناہ دی ہوئی ہے۔“ پھر اُس کی نظر تابش پر پڑی۔ ”چاچو تابش...... مسلمان......“

”کپل چپ......“ اشوک نے اتنی سختی سے ہونٹوں پر اُنگلی جمائی کہ وہ الجھ گیا۔ حاجرہ بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی اور تابش کے بازو کو وحشت سے

کھینچا۔

"تابی جاؤ تم...... جلدی کرو تابش وقت نہیں، یہاں سے پچھلی چھت کو کود جاؤ...... اللہ تمہاری حفاظت کرے گا پیچھے مڑ کر بھی مت دیکھنا۔" وہ اُسے گھسیٹتی ہوئی دیوار تک لے گئی جیسے ابھی دھکا دے دے گی...... تابش نے دونوں ہاتھوں سے اُسے تھاما۔ اس صورت حال کا کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

"مجھے ان کا سامنا کرنے دو...... یہ ایسے بھاگ کر نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں۔ تابش، نہیں۔ جذباتی مت بنو...... تمہیں [illegible] اللہ کا واسطہ، تمہیں کچھ ہوگیا تو میں زندگی بھر خود [illegible] نہیں کرسکوں گا...... تم بس کود جاؤ اور ہماری [illegible] ت کرو۔" اشوک نے تیزی اُسے جھنجوڑا۔

وہ لوگ اندر گھس آئے تھے اور سب سے پہلے شاید سمراٹھ کے قدموں کی آواز تھی...... تابش نے لمحے بھر کو حاجرہ کو دیکھا اور پھر اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"تو چلو پھر......"

حاجرہ پورے قد سے ہل گئی۔ آنکھوں میں خوف بھر کر اُس نے اشوک کو دیکھا تو وہ جیسے سب سمجھ چکا تھا...... تابش، اشوک، حاجرہ اور چند قدموں پر موت......

"میری بہن یہاں رہے گی تو گھٹ گھٹ کر بہت جلد مر جائے گی...... اور مجھے اپنی ناک سے زیادہ اپنی بہن کی خوشیاں پیاری ہیں، میں ہمیشہ تم لوگوں کے لیے دعا گو رہوں گا اب جاؤ......" اشوک کی آنکھوں سے درد پھسلا اور حاجرہ کا جی کیا اُس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے...... اشوک کے ہاتھ پر آخری بوسہ دے کے دونوں نے ایک ساتھ دیوار پر قدم جمائے اور ایک ساتھ چھلانگ لگا دی...... عین اسی وقت سمراٹھ آخری سیڑھی پر پہنچ کر چیخا۔

"اشوک......" غصہ، صدمہ اور بے یقینی...... اُس کی آنکھوں میں کیا تھا جو نہیں تھا۔ اشوک سکون سے اُسے دیکھنے لگا وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھا......

"جاؤ پکڑو اُنہیں شیکھر...... اشوک تم نے مجھ سے غداری کی۔" وہ غصے میں دیوانہ ہونے لگا...... حاجرہ کی حرکت، تابش کا بچ نکلنا اور اشوک کا ہاتھ...... سمراٹھ کے لیے موت سے بدتر تھا۔

"میں شما چاہتا ہوں بھیا! خونی رشتے تو خدا کی عطا ہوتے ہیں...... مگر دلی رشتوں میں "نمک" کا رشتہ بھی شامل ہوجائے تو وہ انسان کی جان پر "احسان" قائم کردیتا ہے۔ ہم نے بہت مرتبہ اُن کا نمک کھایا تھا...... میں نے آپ سے غداری نہیں کی بھیا...... میں نے بس اُن سے "وفا" نباہی ہے......"

سمراٹھ ششدر سا اُسے دیکھتا رہا۔ ساری بازی الٹ گئی تھی۔ آنندی چلی گئی، تابش بچ کر نکل گیا اور اس کے ہاتھ بس شکست و ریخت...... توہین، ذلت۔

وہ پتھر تھا۔ اُس کے پتھر جسم سے سارے منفی جذبے مل کر ٹکرائے تو الاؤ کو بھڑکا گئے...... نیچے پڑا خنجر اُس نے اُٹھایا جس کی خیرہ کن دھار مٹیالی روشنی میں بھی موت کی چمک رکھتی تھی۔ اشوک کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹیں اور لب کھل گئے...... کیا وہ بھائی کو مارنے جا رہا تھا؟ اُس کی نفرت سگے خون سے بڑھ کر تھی؟

ہاں وہ تھی...... وہ دانتوں پر دانت جما کر کچھ قدم آگے آیا...... اور ہوا میں ہاتھ لہرا کر پوری قوت سے خنجر اشوک کی سمت پھینک دیا......

"کچھ موتیں انسان کے ہاتھ ہوتی ہیں کیونکہ اللہ انسان کی رسی دراز کر کے آزما رہا ہوتا ہے...... مگر جہاں وہ نہ چاہے موت کو موڑ بھی دیتا ہے......"

کپل کو نجانے کیا سوجھی کہ وہ حاجرہ کو دوسری طرف سے دیکھنے کے لیے بھاگا...... لمحے کے ہزارویں حصے میں اشوک کے سامنے سے خنجر اُچھلا ہوا تو وہ چلایا...... کپل نے رخ سامنے کیا اور تیز دھار خنجر عین اُس کے قلب کے مقام پر گڑ گیا...... سمرا

کی رنگت فق ہوئی اور دھند بھرتی آنکھوں کے ساتھ اُس نے اپنے بیٹے کے اُوپر اشوک کو دیوانہ وار جھکتے دیکھا تھا......

کچھ نیتیں ہوتی ہی اتنی خراب ہیں......کہ خود پہ اُلٹ جاتی ہیں۔“

قصہ اپنی جزائیات پر اب ختم ہوتا ہے......!!

مگر داستانیں ہیں کہ جاری رہتی ہیں......

رات کے سائے کائنات کے ہر کھیت پر مسلط ہو چکے تھے۔ جگہ جگہ دھرتی، پیڑ، ندیاں کنارے، چوپال، چھتیں، اسٹیشن اور کھیت ہر طرف لاشوں سے ایسے بھرے ہیں مانو دنیا پر تمام انسان ختم ہو گئے ہیں......اور اب روزِ محشر کے دن اُٹھیں گے۔

حاجرہ اور تابش سارا وقت اتنی لاشیں اُلجھ کر آئے تھے کہ پاؤں شل تھے......درختوں پر لٹکے انسانی اعضاء، گدھ نوچتے جسم اور ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں انسان فروشوں کے کھنڈروں میں ایسی گونج رہی تھیں کہ دونوں کو اپنے دکھ بہت چھوٹے پڑتے دکھائی دیے تھے۔ راستے میں دونوں کتنے ہی قافلوں میں ملے پھر مکئی اور کماد کے کھیتوں میں چھپے دشمنوں کے حملوں پر سب لوگ پتنگوں کی صورت تتر بتر ہو جاتے۔ ساری رات مسلسل چلتے رہنے پر بھی منزل قریب نہ آئی تھی۔ اسٹیشن ویران پڑے تھے اور اسٹیشنوں [illegible] ھے مسلمانوں کے سیاہ مٹکے پانیوں [illegible] ہنوز بھرے بھرے اپنے پیاس بجھانے والوں [illegible] یتیم تھے

[illegible] کے تیسرے پہر وہ پھر سے ایک قافلے کے سنگ ہوئے۔ قافلہ بے حد طویل تھا اور اُن کا رخ راوی کے پُل کی طرف تھا...... وطن پہنچنے کا جوش پیروں کو تھکنے نہ دیتا تھا......! دن چڑھے راوی کا کنارہ نظر آیا تو کلمہ کے نعروں سے مسلمانوں کی خوشی دیدنی تھی۔

دن بے حد روشن صاف اور اتنا سرخ دکھائی دیتا تھا جیسے اپنی عوام کو پاکستان میں قدم رکھتا دیکھ فخر سے شرما بھی رہا ہو...... حاجرہ اور تابش نے ایک دوسرے کی سمت دیکھتے ہوئے پورے دل سے مسکراہٹ ایک دوسرے کو لوٹائی اور دل کو نہال ہونے دیا۔ اپنا وطن جنت ہی ہوتا ہے......اور جنت ہر کسی کے نصیب میں کب ہوتی ہے۔

”تم میرے ساتھ ہو حاجرہ...... میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“ تابش نے اُس کی سمت دیکھ کر کہا تو جواباً وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”اس کا حساب بعد پر چھوڑتے ہیں......“

دونوں پچیس تیس ہزار کے قافلے کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ یہاں بھی انسانی لاشوں کے نیچے کہیں زمین چھپ چکی تھی۔ راوی کے پُل پر انگریز افسر وردی زیب تن کیے پہرہ دے رہا تھا اور اس راوی کے دونوں طرف مہاجرین و شرنارتھیوں کے کیمپ دور دراز تک پھیلے نظر آ رہے تھے۔

قافلہ دھیرے دھیرے اللہ اللہ کرتا پُل پار کرنے لگا۔ پاکستان سے آنے والوں کے لیے اور ادھر سے پاکستان جانے والوں کے لیے وقت تقسیم ہو چکا تھا......اور اسی تقسیم کے مطابق دونوں طرف سے قافلے گزرتے تھے۔ حاجرہ سوچ رہی تھی کہ اب ساری آزمائشیں جھیل کر وہ منزل مقصود پر پہنچ چکے ہیں......یہاں نئی زندگی اُن کی راہ تک رہی ہے......

نئی زندگی واقعی اُن کی راہ تک رہی ہے کیونکہ پاکستان کی سرزمین میں سفاکی نہیں ہے......لیکن پھر قافلے مین بے نظمی پیدا ہو گئی۔ دھکم پیل میں حاجرہ کا ہاتھ تابش سے چھوٹ گیا اور وہ پُل پار کر گئی۔

یہی وہ لمحہ تھا جو اُس کی زندگی پر آ کر ٹھہر گیا۔

نگران افسر کی فطری ناانصافی نے بیچ میں آ کر پُل پر راستہ روک لیا۔

”مہاجرین کا دورانیہ وقت تمام ہوا، اب شرنارتھیوں کی باری (پاکستان سے ہندوستان کو آتے قافلے کی) باقی باندہ قافلے کے لیے پُل کچھ گھنٹے بعد فارغ ہو گا۔“

اُس کے اعلان نے حاجرہ کی آنکھوں کی جوت سرد کر دی......دونوں کے درمیان ایک پُل آ گیا تھا۔

اوران کے بیچ صدیوں کا فاصلہ حائل کر گیا۔ اُس کے دل کو پنکھ لگ گئے، ایک بات جی میں آئی کہ افسر کو دھکا دے کر تابش کا ہاتھ کھینچ لے اتنا سا تو فاصلہ تھا...... بس اتنا سا...... اور اتنے میں ہی انتظار میں کھڑے قافلے پر سکھوں، کھتریوں اور ہندوؤں نے حملہ کر دیا۔ جیسا کہ پہلے سے ہو رہا تھا...... میدان ایک بار پھر جنگ کا نظارہ پیش کرنے لگا۔ حاجرہ نے تابش کو مقابلہ کرنے جاتے دیکھا تو چیخ کر روکنا چاہا مگر آواز دب کر رہ گئی تھی۔

تمہاری ریکھاؤں میں بربادی لکھی ہے......

اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

کہتے ہیں جس کے نام سے چوڑیاں لو، اُس جوڑے کی شادی ہو جاتی ہے

برچھوں کی چمک...... تلواروں کی چھنکار، اور لہوؤں کے چھینٹے۔ اُس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

حضرت پیر کے میلے سے خریدی چوڑیاں ٹوٹ کر بہہ گئی تھیں۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے اور تب ہی اُس نے دیکھا...... وہ روح فرسا منظر، جب وہ اُس سے تھوڑا ہی دور تھی...... تابش کو تلوار لگتے اور خون کے چھینٹوں کے ساتھ زمین بوس ہوتے......

اُس کا دل شق ہوا۔ تابش سلیم...... حاجرہ کا تابش اوندھے منہ زمین پر گرا اور اُٹھ نہ سکا۔ دھول اُس کے جسم پر سفید کپڑا سا تان گئی۔

تابش سلیم کے نام کی ایک فلک شگاف چیخ اُس کے لبوں سے برآمد ہوئی اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی نیچے گرنے لگی۔ نیچے اور نیچے، وہ فضا چیخیں سننے کی اتنی عادی ہو چکی تھی یا لوگ بہرے ہو چکے تھے کہ کسی کے کان سے خون نہ رسا...... نہ کہیں کوئی ارتعاش پیدا ہوا۔ قتل و غارت ہنوز جاری تھی۔ یہ انسانیت کا نجانے کون سا بدترین درجہ تھا۔ اور قیامت سے پہلے کا کون سا وقت۔

"کسی بھی انسان کے لیے ہر چیز، ہر حد سے بڑھ کر قیمتی صرف اُس کا "وطن" ہوتا ہے اور قیمتی چیزیں بڑی بڑی قربانیاں دے کر حاصل کی جاتی ہیں۔"

پھر وہ چیز ہمیشہ کے لیے قائم رہتی ہے...... اللہ اُس کی حفاظت کرتا ہے، وہ کبھی نہیں مٹتی...... جیسے ہمارا پیارا "وطن"......!!!

☆☆☆

پکی پُلیا پار

پاکستان ایک ایسی نئی نویلی دلہن تھا جس کو دیکھنے کے لیے آنکھوں میں اشتیاق بھرے لاکھوں پناہ گزین داخل ہو رہے تھے...... اور کیمپوں میں دور تک انسان ہی انسان بکھرے دکھائی پڑتے تھے۔ درختوں کے جھنڈ میں، ٹیلوں کے آسرے، فوجیوں کے چھوڑے بارکوں کے اندر اور اکثر جگہ شامیانوں کی چھت بنائے...... پاکستان نے سب کے قدموں کے چھالوں کو اس قدر محبت سے چوما کہ وہاں کی مٹی ہی مانو شفاء بن گئی...... ساری تھکن دھرتی نے اپنے سینے میں جذب کی اور اب تمام لوگ ٹولیاں بنائے اپنے اپنے ظلم و ستم کی داستانیں سناتے دل پر پھائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

امدادی کمیٹیاں شام و سحر الاؤ دہکا کر میدان میں چائے پکاتیں اور کھلے دم سے ایک ایک کو بلا کر میٹھی چائے پلائی جاتی۔ کھانے میں دال اور نرم گرم روٹیاں تقسیم کی جاتیں...... اکثر صبح نان چنے بھی آ جاتے۔ دوپہر کو بھی عورتیں خود بھی تنکوں پر دال پکاتیں اور سفید چاول اُبالتی پائی جاتیں۔

گراموفون کے ریکارڈ اتنے بجتے کہ جی اُوب جاتا تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں...... یہاں بھی، سیاست کی باتیں، غیر مذہب لوگوں کے لیے گالیاں کوسنے...... لیگی رہنماؤں کے کراچی پہنچنے کی خبریں...... اور تمام دفتری ریکارڈ جو پاکستان چھوڑنے سے پہلے شرپسند جلا کر راکھ کر گئے تھے...... سرکاری عمارتیں گرا گئے تھے...... کھلے آسمانوں تلے کام......!

Nadia Azeem

سلیم نہایت سادہ دل، درد مند انسان ہے۔ تین بچوں کا باپ۔ انتہائی ذہین بچے۔ بیوی حلیمہ، ہر سمے معاشی تنگی کا رونا روتی اور ایک بیمار بوڑھے باپ کے ساتھ گھر کا اکیلا سربراہ......!

تقسیم سے پہلے تک غیر مذہب ایک امیر کبیر فیملی کی کوٹھی میں ملازم رہا۔ ایکسٹرا تنخواہ کا ڈرائیور بھی، پھر بھی تنخواہ اتنی کہ لفظ "ایکسٹرا" کو شرم آجائے۔ ہاں جی! لیکن گزر بسر تو ہوئی ناں، اب تو فارغ ہوا تو شرمندہ کرنے جتنی تنخواہ کے بھی لالے پڑے۔

درمیانہ قد، مضبوط کاٹھی اور چست...... بے روزگار اور قبول صورت سلیم۔

دور سے دھول جمی رنگت کے پیچھے نظر آتے تیکھے نقوش، دلکش عنابی لبوں کا کٹاؤ، آنکھوں کی کانچ میں تیرتا گہرا دکھ جو اندر تک اُتار لیتا، سوگوار تاثرات اور باوقار چال والی حاجرہ جس کے سر پر دوپٹا کس کے جما تھا اور پھر پیچھے تک پورے جسم کو ڈھانپے جاتا تھا...... آگے سلیم، پیچھے فرماں برداری سے سر جھکا کر چلتی حاجرہ...... کو حلیمہ نے دیکھا تو پہلی نظر میں انگشت بدنداں رہ گئی۔ گزشتہ رات سلیم گھر میں نہیں تھا...... ایک رات بعد جیسی قیامت اُٹھا کر وہ لایا اُسے قدموں تلے زمین کھلتی محسوس ہوئی۔

سلیم عادت کے مطابق سلام جھاڑ کر نلکے کے پاس گیا اور منہ پر چھینٹے مارنے کے بعد واپس حاجرہ کے پاس آیا جو ساکت کھڑی زمین کو گھورے جارہی تھی اور حلیمہ اُسے۔

"حاجرہ بی بی اسے اپنا گھر سمجھیں، آپ یہاں ہر طرح کی حفاظت کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔" اُس کے احترام سے کہنے پر حاجرہ کسی چابی بھری گڑیا کی مانند سپاٹ سی ایک کونے میں جا کر زمین پر بیٹھ گئی...... اُس کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اُسے خود ہوش نہیں وہ کچھ بولی تھی کہ نہیں...... منزل اتنی قریب آ کے بھی چھن جائے تو کوئی بھی توازن کھو سکتا ہے۔ وہ تو پھر بھی باشعور انسان تو لگ رہی تھی...... سلیم اور حلیمہ کے تینوں بیٹے اُسے بڑے شوق سے دیکھنے لگے تو حلیمہ مشتعل ہو کر سلیم کے پاس کمرے میں گئی۔

"یہ کون ہے؟" وہ پیچھے سے پکار کر بولی۔ سلیم کچھ تلاش کرتا ادھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔

"یہ حاجرہ سلیم ہے۔" پُرسکون انداز۔

حلیمہ کا اُوپر جاتا سانس اُوپر ہی اٹک گیا۔

"حاجرہ...... سلیم؟" ٹوٹ ٹوٹ کر دو لفظی سوال پھوٹا۔

"ہاں یہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئی ہیں۔ ان کا یہاں کوئی نہیں ہے، اپنا پورا خاندان کھو چکی ہیں اور۔"

"اور تم میرے سر پر سوتن اُٹھا کر لے آیا، سلیم تمہیں شرم نہیں آئی میری ساری ریاضتیں مٹی کرتے ہوئے۔ میں نے اتنے سالوں سے غربت کاٹی ہے تمہارے ساتھ، تمہارے بچوں کی ماں ہوں تمہارے بیمار باپ کی ہر خدمت کی اور میرے اس احسانات کے بدلے تمہیں اس سے بڑی سزا کوئی اور نہیں ملی تھی؟"

وہ گال پیٹ کر بے نقطہ بولنا شروع ہوئی تو سلیم کو کچھ پل کے لیے ہکا بکا کر کے رکھ دیا۔ ابھی تو وہ جوش میں تھی آہستہ بھی بولتی تو گھر اتنا مختصر تھا کہ دروازے کے پار تک آواز باآسانی اپنا متن بیان کرتے پہنچ جاتی اور حاجرہ تو صحن میں تھی۔ یہیں چند قدم دور، خفت سے سلیم نے اُس کے منہ پر ہتھیلی جما کر خاموش کرایا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے حلیمہ...... کچھ سن تو لیا کر، جاہلوں کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ دماغ درست ہے تیرا، ایسا کچھ نہیں ہے۔ اُف۔ کیا کیا سمجھ لیا تُو نے۔" وہ کراہ کر آنکھیں میچ کر بولا تو چہرہ سرخ پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن حلیمہ کی آنکھیں کھلی تھیں اُس کا اپنے شوہر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔

"اُس کے نام کے ساتھ لگا "سلیم" مجھے سب سمجھاتا ہے سلیم، تم ہی نے کہا تھا ناکہ حلیمہ سلیم صرف

میں ہوں۔ پھر وہ سلیم کیوں ہوگئی۔ ہاں میں تو اب جاہل لگوں گی ناں عزت و احترام والے جو آگئے ہیں۔'' وہ اسی طرح بے قابو ہو کر شاکی لہجے میں بولتی جارہی تھی اور سلیم اتنا بے بس ہوا کہ ہنس پڑا، حلیمہ پھر کچھ اور سمجھی۔ سلیم نے اُسے اپنے ساتھ بٹھایا۔

''سکون سے میری بات سن۔ سلیم شاید اُس کے شوہر کا نام ہے، اب دنیا میں ایک تیرا شوہر سلیم تو نہیں ہوسکتا ناں...... میں مہاجرین کے کیمپ گیا تھا اپنے دوستوں کی خبر گیری کرنے۔ وہاں اُن کی زبانی پتا چلا کہ یہ بی بی اور ساتھ شاید اُس کا شوہر اُنہی کے ساتھ تھے۔ آخری وقت میں بدقسمتی سے بقیہ قافلے میں پر حملہ ہوگیا اُس کا شوہر مارا گیا اور یہ بے ہوش ہوگئیں۔ ان کے ساتھ اور کوئی بھی نہیں تھا تو انہوں نے ترس کھا کر اسے اُٹھالیا تھا۔ یہ صدمے سے اتنا چور ہیں کہ کچھ بولتی ہیں نہ کھاتی ہیں، کتنے ہی پہر دورے پڑتے رہے تھے، پھر میں وہاں ملنے گیا تو اسد کی ماں نے اس کے بارے میں بتایا۔ میں قسم کھاتا ہوں حلیمہ اس نے تو میری طرف دیکھا بھی نہیں، اُنہیں گھر مل گیا ہے مگر وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار نہیں ہوئے۔''

''اچھا، پھر یہ تیرے ساتھ چل پڑی۔ یہ تھا صدمہ؟'' وہ چمک کر بولی تو سلیم نے اس کے طنز کو صبر سے برداشت کیا۔

''انسان خود غرض بھی تو ہوتا ہے اتنی نیکی کو اُنہوں نے بہت جانا اور کہنے لگے کہ اُن کا گھر خود بہت چھوٹا ہے اور پاؤں جمانے میں نجانے کیسی مشکلات سے سامنا ہو۔ اسے یہاں چھوڑ تو جائیں پر جوان بچی ہے نہ کوئی آگے نہ پیچھے اپنا بھی ہوش نہیں...... کچھ نحوستوں کے مارے امیر عیاش لوگ سہارے کے مارے لے گئے تو نجانے کیسا سلوک کریں جو کچھ آج کل سننے میں آرہا ہے وہ تو اللہ کی پناہ...... تم یہیں کے رہائشی ہو گھر میں بیوی بچے بھی ہیں اعتراض کوئی نہیں کرے گا عزت بھی محفوظ رہ جائے گی، نیکی کی نیکی اور پھر کچھ وقت میں سنبھل گئی تو خود ہی کچھ پتا بتا دے گی، مسلمان ایک دوسرے کے لیے کتنا کچھ کررہے ہیں کچھ تم بسم اللہ کرو۔'' وہ یہ سب دہراتے جیسے تھک گیا ہو۔ ایک گہری سانس آزاد ہوئی۔

''باتیں دل کو لگی تھیں اور کیسی معصوم صورت ہے بے چاری، ہم سہارا دے دیں گے تو کیا ہوگا۔ سب سے بڑا سہارا تو اللہ کا ہوتا ہے ورنہ انسان کی کہاں اتنی اوقات بس اتنی سی بات ہے اور تُو دل میں میل نہ رکھ، وہ مہمان ہے ہماری۔ بس اتنا کہوں گا حلیمہ کہ اُسے میں یہاں لایا ہوں، تو تم بھلے اسے میرا حکم ہی سمجھو مگر مانو۔''

اُس کا ایک ایک لفظ مضبوطی کی چغلی کھاتا تھا مگر حلیمہ کو سراسر کہانی لگا۔ ایک گھڑی گئی کہانی اور بس...... اسی لیے وہ کسی قدر طنز سے گویا ہوئی تھی۔

''مہمان...... اور وہ بھی ایک بے روزگار انسان کی۔''

حاجرہ پر کسی چیز کا اثر نہ ہوا۔ نہ رویے کا نہ طعنوں کا...... وہ بس پاگلوں کی طرح اپنی نرمی سفید ہتھیلیوں کو تکتی جاتی تھی۔ وہ لاوارثی کے ایسے سرد اندھیر قلعے میں بندھی جس نے اُس کی پانچوں حسوں سے بری طرح کھیلا۔ کتنے دنوں بعد اُس کے کانوں میں پہلی آواز گونجی تو اُسے احساس ہوا وہ زندہ ہے۔

وہ آواز تابش کی ہونی چاہیے تھی، مگر نہیں تھی۔ وہ پہلی آواز ''سمراٹھ'' کی تھی جو بازگشت بنتی گئی۔

''تمہاری ریکھاؤں میں بربادی لکھی ہے...... تمہاری ریکھاؤں میں بربادی لکھی ہے......''

اُس کے دل سے درد کی لہر بھی اسی دن اُٹھی تھی۔ کیسا لمحہ تھا وہ جب اُس کے بھائی کے لبوں سے نکلے الفاظ اُس کے لیے بددعا بن گئے تھے...... کیا ماں جائیوں کی بددعا اسی طرح لگ جایا کرتی ہے؟ وہ تو اُن کے لیے سب کچھ چھوڑ چکی تھی۔ اتنے ماہ اپنے وعدہ پر بھی قائم رہی...... لیکن سمراٹھ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہا تو وہ بھی پھر کس بنیاد پر اس وعدے کا پاس رکھتی؟

کیا اللہ اُس سے ناراض ہو گیا تھا؟

جھاڑو پھیرتی حلیمہ نے اُسے زمین پر بیٹھا دیکھ کر غور کیا تو اُس کی آنکھوں سے پانیوں کا جھرنا بھی بہہ رہا تھا...... پھر وہ دیکھتے دیکھتے ہاتھوں کو آپس میں اس طرح جنونیت میں مسلنے لگی جیسے جلد پھاڑ دینا چاہتی ہو پر اپنے ہاتھوں کی یہ لکیریں مٹانا چاہتی ہو...... حلیمہ شل رہ گئی۔ وہ اس لڑکی کو کچھ اور زیادہ ناپسند کرنے لگی جس سے اسے خوف سا آیا تھا۔ کچھ دن وہ اسے بار بار آنسو بہاتا دیکھتی رہی پھر تماشا برداشت نہ ہوا تو تیر کی طرح اُس کے سر پر پہنچ گئی۔

”بات سنو بی بی......“ حلیمہ نے اُسے مخاطب کر کے خود کو ہی داد دی کہ اُسے تو تھانے دارنی ہونا چاہیے تھا۔ حاجرہ کا سر اُوپر کو اُٹھا...... ہجر زدہ آنکھیں جلتا انگارہ تھیں۔ ”شادی شدہ ہو تم......؟“ اس کے مضطرب انداز میں پوچھے سوال پر حاجرہ کچھ لمحے چپ اُسے دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

”اُوہ اچھا تو سلیم کون ہے؟ تمہارا باپ؟“

”نہیں......“ کنوئیں سے نکلی آواز پر وہ کتنی ہی دیر اوندھی ہو کر کھانستی چلی گئی۔ معلوم ہوتا ٹھسکے دار کھانسی کی پرانی مریضہ ہے۔ حلیمہ کے شک کو چنگاریاں لگ چکی تھیں۔

”تو حاجرہ سلیم کیوں کہتی ہو...... سلیم کیوں لگاتی ہو؟“ وہ حلق کے بل چیخ پڑی۔ غم کو غصے نے اُسے نیم پاگل کر دیا مگر حاجرہ کو کچھ فرق پڑتا ہو تب ناں۔

”یونہی...... بس......“

تو یونہی بس پر حلیمہ کہاں مطمئن ہونے والی تھی۔ حاجرہ اُس کی آنکھوں کا وہ موتیا بن گئی جو بہت کالا کالا دکھاتا ہے سب...... سلیم صبح کا گھر سے نکلتا شام کو آتا دکھائی پڑتا۔ وہ دیکھ کے جاتا کہ حاجرہ زمین پر بیٹھی مٹی کرید رہی ہے...... واپس آتا تو وہی حال۔ ہر صورت زمین پر بیٹھتی، اور سوتی ڈھیلے بان والی جھولتی چارپائی پر...... نجانے کیوں اس کے لیے سلیم کا دل بار بار نرم پڑ جاتا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی بس نظر جانے اور واپس سمیٹ لینے جتنا تعلق بے ضرر سا...... حالانکہ وہ اس کے لیے محافظ ثابت ہو رہا تھا۔

سکتہ ٹوٹنے کے کچھ دن بعد وہ خود سے اُٹھ کر اُس کے پاس گئی تھی اور سلیم چونک کر کھانے سے ہاتھ روک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔

”سلیم بھائی۔“ اُنگلیاں مروڑتی کشمکش کا شکار حلیمہ کو وہ زہر لگی۔ وہ سب دیکھ رہی تھی مگر سن نہیں رہی تھی۔ ”مجھے تابش کا پتا کرا دیں، وہ مجھے ڈھونڈھتا ہو گا...... میں جانتی ہوں میرا دل کہتا ہے کہ اُس کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا وہ مجھے کیوں یہاں تنہا چھوڑے گا...... کیا آپ سے کچھ ہو سکتا ہے؟“ وہ بھرائی آواز میں بھیک مانگنے کے طرز سے بس ہاتھ جوڑنے کی کس اُٹھائے کھڑی تھی۔ سلیم نے لب بھینچ لیے۔ تابش کا ذکر وہ واحد ذریعہ بنا جس سے حاجرہ کے وجود کے گرد کھڑی برف کی دیواریں پگھلنے لگیں تھیں...... سلیم کا دل پانی ہونے لگا۔

”میں کوشش کروں گا حاجرہ بی بی۔“

”جلدی سلیم بھائی، ریڈیو پر اعلان چلوا دیں یا مجھے واپس کیمپ چھوڑ آئیں۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہو گا اور میں اُسے نہ ملی تو کتنا شکوہ ہو گا اُسے مجھ سے۔“

”میں آپ کو واپس نہیں چھوڑ سکتا، لیکن تسلی ضرور دیتا ہوں۔“ وہ اس کے مغموم چہرے سے نظریں ہٹا کر بڑی دقت سے بولا۔

کچھ دل ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے دکھ سے بھی کرلاتے ہیں مگر حلیمہ کو کون سمجھا سکتا ہے۔ اُس کا سلوک رفتہ رفتہ حاجرہ سے بہت خراب ہوتا رہا۔ گھر کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ حلیمہ کہتی اپنے بیمار لاغر سسر سے اور سناتی حاجرہ کو...... اب تو ٹھیک ہو چکی ہے نا، سب سمجھتی ہے پھر بھی کیوں ٹکی ہے؟ کئی دفعہ شرم ناک الزام لگائے، سر جھک جاتا ہے مگر غیرت نہیں جاگتی آخر کس وجہ سے؟

سلیم مزدوری کے لیے مارا مارا پھرتا تھا۔ کبھی

مل جاتی تھی کبھی نہ بھی ملتی تو اللہ کی مہربانی سے کوئی بھوکا سویا ہے بھلا۔ لیکن حلیمہ جھگڑنے میں نہ تھکتی۔ ایک دن بولی۔

”تمہاری مہمان اب تو وبال جان سے بھی گزر چکی ہے۔ سالوں کے لیے بھی کوئی مہمان بنتا ہے؟“

”تمہیں کیا کہتی ہے؟“ سلیم نے لیٹے لیٹے پوچھا تو اُسے تاؤ آ گیا۔

”ہمارے حالات اچھے نہیں سلیم...... کسی کو کب تک بٹھا کر کھلائیں؟“

”وہ کھاتی کتنا ہے حلیمہ...... کیا ہم سب میں سے کسی ایک انسان کی خوراک برابر بھی کھا جاتی ہے؟“ سلیم نے عجیب طرز سے پوچھا۔ وہ لاجواب ہو گئی تو خاموشی سے کروٹ بدل کر سو گیا...... اُسے حلیمہ کے حوالے سے شکوے ہو گئے تھے، بغیر اُس کے مقام پر سوچے......

وہ اگر شکی مزاج ہے تو ہے...... کوئی بھی شوہر اچانک ایک خوب صورت لڑکی کو لے آ کر گھر بٹھا دے، وہ بھی نامعلوم میعاد کے لیے...... تو پھر کوئی بھی بیوی اتنی ہی غیر محفوظ ہو سکتی ہے جتنی کہ حلیمہ ہے......!

☆☆☆

پکی پُلیا پار کے اس دیس اُس کے شب و روز پژمردہ سے گزرنے لگے۔ تقسیم ہوئے ماہ بیتتے گئے وقت گزرتا گیا مگر زندگی ٹھہری رہی۔ وہ آج بھی اُسی مقام پر کھڑی تھی جہاں چیخ مار کر گری تھی...... تابش تو اُس کے پاس ہر جگہ تھا مگر وہ اُس کی زندگی میں نہیں تھا اور کسی پر بوجھ تھی...... حلیمہ ہنوز تلخ اور جلی کٹی رہتی تھی۔ البتہ سلیم کے بچے اُس کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کرتے تھے۔ تابش کو سلیم ڈھونڈ کر نہیں لا سکا، نجانے اُس نے تگ و دو بھی کی ہو گی یا نہیں مگر حاجرہ بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ زندگی کی پٹڑی پر خود لڑکھڑا رہا تھا حاجرہ اُسے مزید مشکلوں میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

یہ وہ دن تھے جب ہر گھر کے دروازے مستقل مزاجی سے بجتے رہتے تھے۔

امدادی کمیٹیوں کے فرد آتے اور کسی انسان کی صورت ظاہر ہونے پر اپنا مدعا سامنے رکھ دیتے۔

”اپنے مہاجرین بھائیوں کی مدد میں حصہ لیں اُن کا ساتھ دیں۔ قافلے کے قافلے ہجرت کر کے آئے ہیں اور بھی آ رہے ہیں جتنی توفیق ہو۔“

حلیمہ کے سن سن کے کان پک گئے تو جھلا کر بولتی۔

”اے بھیا۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر حصہ لے لیا ہم نے...... اب کہو تو خود کو بیچ ڈالیں؟“ اور منہ پر دروازہ ٹھک سے بند۔

حاجرہ کی نگاہیں اور اور کان انہی دستکوں اور آوازوں کا محور بن کر رہ گئے۔ دل بار بار کھنچتا تھا کہ یہ دستک تابش کی ہے...... اچھا نہیں۔ اب تو پکا وہی ہے...... ہاں اب کی دفعہ تو خوشبو بھی محسوس ہوئی ہے اور دستک بھی تو کیسی لرزتی معلوم ہوتی ہے، جیسے کوئی بندہ منزل پر پہنچ کر خوف سے کانپ رہا ہو۔

تابش کو بہت شوق تھا وطن کی خدمت کرنے کا...... کیا پتا وہ اس طرح مدد کر رہا ہو۔ اور کسے معلوم کہ چندہ اکٹھا کرتے کرتے کبھی وہ اس گھر تک آ پہنچے اور پھر حاجرہ کے لیے سکھ اپنے مفہوم واضح کرے...... وہ اسی طرح خوش کن سوچوں میں گھری رہتی۔

محبوب ہستی سے بچھڑ جانے کا احساس کن عذابوں سے دوچار کرتا ہے یہ صرف وہی جان سکتا ہے جو اس آگ میں سلگ رہا ہو...... اس کو لفظوں سے چھیڑنے کی سکت ایک قلم کبھی اُٹھا ہی نہیں سکتا۔

سلیم شام کو لوٹ کر آتا تو پرندے اپنے گھونسلوں کی، محو پرواز ہوتے تھے۔ ابا جی کی دوائی لاتا اور پلاتے ساتھ پوچھتا بھی جاتا...... اُسے سب کا خیال رکھنا آتا تھا۔

”ہسپتالوں کی دوا ہے اور ساری پانی سے ہی بھری ہے، خاک اثر کرتی ہو گی ابا فکر نہ کرنا جلد

تمہارے لیے خاص دوا بھی لے آؤں گا۔“

حاجرہ دل ہی دل میں مسکرا دیتی۔ اس موقع پہ اُسے اپنی ماں یاد آتی، باپو یاد آتے اور اشوک بھائی کی یاد تو کبھی دل سے جدا نہ ہوتی تھی۔ بس پھر آنکھ ہی بھیگتی...... بھیگتی ہی جاتی۔

شام کو وہ سلیم کے بچوں کو لے کر بیٹھ جاتی اور قرآن پاک پڑھانے لگتی، کبھی اسکول کی بنیادی چیزیں سکھانے لگتی۔ وہ تینوں ہی سرکاری اسکول جاتے تھے اور ذہن کے بہت تیز تھے ایسی ایسی باتیں لے آتے کہ ایک پل کو ان کے ساتھ الجھ کر حاجرہ سب کچھ بھلا ہی بیٹھتی تھی...... حلیمہ بچوں کو جتنا جھڑکتی وہ اس کی مانتے نہیں تھے۔ وہ مزید حسد کا شکار ہونے لگتی...... شوہر پہلے گن گاتا ہے...... بچے بھی اُسے کے ہی گرویدہ ہو جائیں

”چل حلیمہ تُو تو پھر پھکی ہی اُڑا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی جاتی تھی۔

اس سارے عرصے میں دو سال بیت گئے تھے اور حاجرہ گھر کا فرد بن گئی، پھر حاجرہ کو سلیم نے جھنڈیاں چنتے دیکھا تو بہت اُداس ہو گیا تھا۔ کاش وہ کسی کے لیے تو کچھ کر سکتا، حاجرہ کی خواہشات تو تھیں ہی نہیں مگر جتنی وہ اپنی لگتی تھی اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اسے خوشی دے سکے۔

موسم سورج کی کرنوں پر بند باندھ کر بارش کے کچھ قطرے یکجا کرتے اور آسمان پر اُن کرنوں کو برکھا کے پانی پر دوچند کر کے قوس وقزح کی پینگیں بنا ڈالتے تھے۔ موسموں کی ان شرارتوں میں سلیم کو ایک چیز کی شدید طلب ہو گئی تھی اور وہ ”سکون“ تھا۔

انسان ایک تلخی آخر کس حد تک پیے۔ اُسے لگا اُس کا دل بھاری پڑتا جا رہا ہے اور وہ مایوس ہونے لگا ہے۔ اُس کا ساتھ اب تو اُس کی بیوی دینے سے بھی انکاری تھی پھر حوصلہ کون بنے...... وہ کتنی دیر چلتا سوچتا رہا اور بے خبر رہا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ آئے روز معمولی سی مزدوری پھر وہی معمول کی چخ چخ...... وہ ایک جگہ پتھر پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ گالوں پر ٹکا دیے۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر غبار حاوی ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تو اُسے اپنے پیچھے کسی کی آواز سنائی دی تھی۔

”کون ہو تم؟“

”حالات کا ستایا ہوا ایک بے بس انسان۔“ اُس کی بھیگی آواز سے چند الفاظ یوں ہی پھسل گئے تو دوسری طرف کچھ ثانیے خاموشی رہی۔ سلیم نے بیزاری سے دیکھا تک نہیں تھا۔

”میں تمہیں ایک کام دلا سکتا ہوں، کر سکو تو حالات بدل سکتے ہیں؟“ سلیم کے کندھوں پر پڑنے والا ہاتھ نووارد کی آواز کی طرح بہت بھاری تھا اور کام اس سے بڑھ کر بھاری......!

☆☆☆

ہیبت ناک اندھیرا ہر روشنی نگل چکا تھا۔ سلیم کے مختصر سے گھر کے دونوں کمروں سے زرد روشنیاں لپک رہی تھیں اور ابا جی کی کوٹھی اندھیری تھی۔ سلیم نے عشا کی نماز کے بعد بیرونی دروازہ بند کیا اور نلکے سے پانی پیا...... پھر صحن کے وسط میں آ کر وہ ٹھٹک گیا۔ جو وہ کرنے والا تھا اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے ایک بار پھر خشک پڑتا حلق تر کرنے کی ضرورت ہے، مگر اس کے باوجود نجانے کیوں وہ حاجرہ سے وہ سب کہنا چاہتا تھا۔ وہ بھلے اسے جو بھی کہتی لیکن وہ اپنے راز میں کسی کو تو شریک بنائے...... اُس کی نگاہیں آدھ کھلے دروازے پر ٹکی رہیں پھر ہمت کرتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ایک پل سانس درست کر کے اُس نے کندھے جھٹکے اور حاجرہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر پٹ بھیڑتا دروازے کے پیچھے گم ہو گیا۔

صحن میں چولہے کے پاس انگاروں پر دودھ گرم کرتی حلیمہ کے گرد ڈھیروں سناٹے اُتر آئے تھے۔ کون ہے وہ حاجرہ اور اس کا شوہر سلیم؟

اُس کی ذات کی دھجیاں بکھرنے لگیں......!

تو آج اصلیت سامنے آ ہی گئی تھی۔ کیا یہی وہ بھروسے کا صلہ تھا جو سلیم اس سے اتنا عرصہ مانگتا آیا...... شوہر کبھی اعتبار کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اُس

کے حلق میں کوئی کاٹ دار چیز اُتر رہی تھی اور وہ اپنی اُنگلی سے چولہے سے میں انگارے پھرولتی اپنا ضبط آزمانے لگی...... اب بہت ہو گیا تھا۔

کھٹکے پر حاجرہ نے سر اُٹھایا تو سلیم کو سامنے پا کر تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ پہلے کبھی اس کے کمرے میں نہیں آتا تھا...... اس کی آنکھوں میں تیرتا تحیر سلیم نے فوراً بھانپ لیا۔

”بیٹھی رہو حاجرہ بی بی...... میں جانتا ہوں مجھے ایسے نہیں آنا چاہیے تھا مگر مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”آپ مجھے بلا سکتے تھے۔“ اُس نے کچھ برہمی سے کہا پھر گہری سانس بھر کر اعصاب بے اختیار ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ ہنوز زمین پر کھڑی ہی رہی تو سلیم چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”میں نہیں جانتا کہ میں آپ سے یہ سب کیوں کہنے آیا ہوں مگر اس کام سے حامی بھرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس راز میں، میں کسی کو شریک کر سکتا ہوں تو وہ صرف آپ ہیں۔ یہ میرے لیے ناممکنات میں سے تھا مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔“ وہ تمہید بھی تو خاصی لمبی تھی۔

حاجرہ نے بہت تحمل سے پوچھا ”کیسا کام......؟“

سلیم نے نگاہیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا...... زرد روشنی میں انگوری رنگ کا آنچل اُسے پوری طرح سے ڈھانپے ہوئے تھا۔

وہ بھاری ہاتھ سلیم کے کندھے سے ہٹا تو اُس نے بے تابی سے سیدھے ہوتے ہوئے پُراُمید نظروں سے اُس شخص کو دیکھا اور اسی قدر عجلت میں بولا۔

”کیسا کام ہے، میں ہر طرح کا کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

نووارد کی آنکھیں فاتحانہ چمک سے بھر گئیں تو وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے مخالف سمت میں چلتا ہوا ایک گاڑی کے قریب آ گیا۔ سلیم کی آنکھوں میں ناقابلِ فہم تاثر تھا مگر سامنے والے کو جیسے کوئی جلدی ہی نہیں تھی...... گاڑی میں سوار ہو کے بقیہ راستہ پاٹنے تک وہ سلیم کا انٹرویو پوری طرح کر چکا تھا۔ وہ گاڑی ایک پُرشکوہ عمارت کے سامنے رکی تھی، جس کا تہ خانہ بلا کا سرد تھا۔

”خاکسار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے صاحب اسے سلیم کہتے ہیں۔ یہ حالات کا ستایا ہوا غریب شخص ہے اور ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ پھر ہم تو ہیں ہی انسانیت کی خدمت کرنے والے۔“

دونوں نے بات کے اختتام پر قہقہہ لگایا تو سلیم کو بہت عجیب محسوس ہوا۔ اسے وہ پوری جگہ اور لوگ سب ہی عجیب نظر آ رہے تھے سرد اور جذبات سے عاری، کچھ دیر تک دونوں کے بیچ معنی خیز سی باتیں اسی کی ذات کو لے کر ہوتی رہیں اور وہ گونگوں کی طرح دیکھتا رہا۔

”دیکھیں سعید بھائی، آپ فکر مت کریں میں ساری چھان بین کروا لوں گا، ویسے بھی یہ اتنا مسکین سا بندہ ہے کہ کبھی سچ نہیں اُگل سکتا اور ایسے بندوں کی کمزوریاں آپ سے بہتر تو میں بھی نہیں جانتا۔“

اُنہوں نے اس کا صاف مذاق اُڑایا سلیم کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ اپنے فیصلے پر پچھتانے لگا اور جس کام کا سوچ کہ وہ خوش ہو رہا تھا وہ کبھی ہوتا نہیں دکھائی دیا۔ پھر کتنی ہی دیر جب وہ ان کے گھماتے پھراتے سوالات سے اُکتا گیا اور شاید دوسری طرف سے بھی تسلی کر لی گئی تو وہ مدعے پر آئے۔

”بات کچھ یوں ہے ڈیئر! کہ نئے لوگ شور بہت کرتے ہیں اور وہ کام جو وہ کر نہیں سکتے ہامی بنا سوچے سمجھے بھر لیتے ہیں، آپ یہاں تک چل کر آئے ہیں تو مایوس تو نہیں لوٹیں گے...... لیکن ہم جو رسک لے رہے ہیں آپ پر اعتبار کر کے تو ہماری نگاہ آپ پر ہر جگہ رہے گی۔ ہم سے مخلص ہو جائیں سمجھیں عیش ہی عیش۔ ٹرینڈ کرنا ہمارا کام ہے ورنہ دوسری صورت گھاٹا ہر صورت آپ کا ہی ہوگا۔“ سگار کے دھوئیں کے بیچ بات مکمل ہوئی تو سلیم کو اس کے لہجے کی پُراسراریت سے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔

”کام کیا ہے، میں کروں گا۔“

Vadar Azeem

"ایک بندے کا قتل کرنا ہے۔ دل گردہ ہے اتنا؟" سلیم نے کھلے منہ کے ساتھ سوچا کہ وہ یقیناً کوئی مذاق کررہا ہے۔ لوہے کی کرسی پر بیٹھا وہ زمین پر گر پڑا تھا۔

"قتل؟" حاجرہ کی بے یقینی سے آنکھیں پھیلیں اور سوال یوں سرسراتا ہوا نکلا جیسے سانپ پھنکارتا ہو، لیکن تب کی نسبت سلیم اب سنبھلا ہوا لگتا تھا۔

"آپ نے فوراً انکار کردیا ہوگا؟" وہ اتنے یقین سے بولی کہ سلیم کو نظریں چرانی پڑیں۔ وہ تو قائل ہو کے آیا تھا...... حاجرہ کو لگا اُس کی نظروں میں خون خرابا گھومنے لگا ہے۔

"میں انکار نہیں کرسکا وہ تھے ہی ایسے کہ اُن کے سامنے بندہ ایک لفظ مشکل سے بول سکے...... صرف ایک گولی مارنی ہے حاجرہ اور مجھے اتنا پیسہ مل سکتا ہے جو میں نے کبھی اتنا کمایا نہیں۔ میری بیوی کو مجھ سے بہت شکایات رہتی ہیں، میرے بچے یتیموں کی طرح پل رہے ہیں...... میرا باپ ساری رات خون تھوکتا ہے۔ صرف ایک قتل، میں اُس کے بعد کچھ نہیں کروں گا وعدہ...... اور میں کبھی شاید حامی نہ بھرتا لیکن وہ شخص جس کا قتل ہونا ہے وہ خود بہت سے غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے، وہ اتنا برا ہے کہ اُس کا مرجانا بہتر ہے۔ یہ کام میں اکیلا نہیں کروں گا میرے ساتھ دو بندے اور بھی ہوں گے مجھے تو بس وہ اپنے گینگ میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔"

"سلیم بھائی آپ۔" مارے صدمے کہ وہ کچھ بول نہیں پارہی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا سامنے وہی شخص بیٹھا ہے جسے وہ اتنا دنوں سے رحم دل انسان کے نام سے پہچانتی آئی ہے۔ اس کے سامنے دوسرا سمراٹھ بیٹھا تھا جسے اپنے مفاد کے آگے ایک "قتل" نہایت ہیچ لگ رہا تھا۔ کیسے؟

"آپ ایک معصوم انسان ہیں آپ قاتل نہیں بن سکتے سمجھے آپ...... میں آپ کو یہ گناہ ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ وہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، ایک انسان کے دل میں دوسرے کے لیے اتنا غلط عکس پیدا کردینا کہ آپ کو اسے جان سے ماردینا ہی ثواب لگنے لگے...... لیکن آپ باشعور انسان ہیں آپ نے اَن کھائی ہے اس کا مطلب ہے آپ دماغ بھی رکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص کتنا بھی برا ہو وہ اپنے اعمال کا خود جوب دہ ہے آپ کو کہیں سے حق نہیں ہے کہ اُسے مار ڈالیں...... قتل مذاق ہے؟ اگر وہ برا انسان ہے تو قتل کر کے آپ دودھ کے دھلے رہ جائیں گے؟"

وہ بری طرح سے پھٹ پڑی۔ اس کی آواز اُونچی ہوئی لیکن اُس نے پروا نہیں کی اُس کا دماغ بری طرح سے گھوم گیا تھا۔

"مجھے آپ سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی۔ وہ لوگ آپ کی برین واشنگ کرچکے ہیں اور آپ نے ہونے دی...... سلیم بھائی اس دھرتی پر رحم کھائیں یہ آپ کے گناہوں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ کیا پاکستان اس لیے بنا تھا؟ مجھے شدید دکھ ہورہا ہے کہ جس وطن کا سینہ ابھی تک لوگوں کے لہو کی سرخی سے لال ہے آپ وہاں ایک اور خون بہانے چلے ہیں...... یہ قوم ابھی سے کس سمت جانے لگی؟ کیا اس سے بہتر نہیں تھا کہ پاکستان نہ بنتا اگر یہی کام یہاں بھی شروع ہونے تھے؟"

"حاجرہ بی بی، آپ جذباتی ہورہی ہیں۔ ہمارے رک جانے سے کوئی اور نہیں رکتا، میں آپ کی ساری باتیں سمجھتا ہوں مگر دنیا آپ کا کہا مانے گی۔ کیا میرے سیدھے رہنے سے ملک سے ساری برائی دور ہوجائے گی؟" سلیم کی بات میں طنز نہیں تھا حقائق کا نشتر تھا۔ حاجرہ نے ہونٹ بھینچ کر اُسے خود پر سہا۔

"آپ کو پتا ہے ہندوستان برا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ملک کبھی برا نہیں ہوسکتا، ہندوستان اس لیے برا بن گیا کیونکہ وہاں کے لوگ برے تھے...... اور ایک ملک ہمیشہ اپنے قوم کے عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ مت بھولیں یہ قوم "ہم" سے مل کر مکمل ہوتی ہے، ہم

خود کو ٹھیک رکھنے کے بجائے اُس برے طبقے کے ساتھ شامل ہو جائیں تو ہمارے لیڈروں کے ساتھ کون کھڑا ہوگا؟ وہ جو دن رات ایک کر رہے ہیں ہمیں محفوظ کرنے کے لیے پاکستان کو چلنا سکھا رہے ہیں ہم ان ہی کی پشت پر ان کا نعرہ لگاتے ہوئے جرم کرنے لگ جائیں۔ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہو جائیں اور اپنا عیش و آرام چن لیں تو یہ وطن آپ کو بددعا نہیں دے گا؟ وطن ایک ماں کی طرح ہوتا ہے اور اپنے لوٹنے والے کو بددعا دیتا ہے۔ میں جذباتی نہیں ہو رہی میں وہ دکھ محسوس کر رہی ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو بری طرح سے رواں ہو گئے تھے۔

سلیم چپ چاپ بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا...... مگر اُس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ باہر رات ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔

"آپ کو پتا چل جائے کہ وہ کون ہے تو شاید آپ یہ سب نہ کہیں۔ وہ آدمی اسمگلنگ کرتا ہے، کیپسولوں کی۔ انسانوں کی کرپشن کرتا ہے، سود کو وہ علاقے کی جڑوں میں پھیلا رہا ہے کیا اس سے ملک محفوظ رہے گا؟ اور اُسے قتل کروانے والا جانتی ہیں کون ہے، خود اُس کا اپنا بیٹا۔" سلیم نے اپنے تئیں دھماکا کیا کہ وہ قصوروار نہیں ہے۔

حاجرہ کتنی دیر اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لیتی رہی۔ اُس کا دماغ ہر جملے کے ساتھ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ سب وہ شخص کرتا ہو یا نہیں مگر آپ کی یہ خیر خواہ گینگ ضرور کرتی ہوگی۔ یہ سب وہ کر کے جرم کر رہا ہے تو جنت میں آپ کو یہ لوگ بھی نہیں پہنچا رہے، جانتے ہیں سلیم بھائی۔ مجھے آپ میں کچھ خوبیاں تابش کی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنوں کی خدمت کا جذبہ رکھتا تھا اور اپنے وطن کی بھی...... اُس میں یہ خامی نہیں تھی کہ وہ جلد ہار مان لے اور خود غرضی دکھائے۔ لیکن آپ نے یہ سب کر کے دکھا دیا کہ آپ اُس جیسے نہیں ہو سکتے۔"

حاجرہ کے شکوے پہ وہ بری طرح چڑ گیا۔

"ہاں نہیں ہوں میں تابش، وہ فرشتہ صفت ہوگا میں انسان ہوں مجھے انسان ہی رہنے دیں۔ میرے خاندان کو اگر کچھ فائدہ مل سکتا ہے تو میں وہ کام ضرور کروں گا اور یہ سب کا حق ہوتا ہے۔"

وہ برہمی سے کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ حاجرہ نے مدھم لہجے میں دونوں ہاتھ بے بسی سے جوڑ دیے۔ وہ اُن ہاتھوں کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"وہ بھی فرشتہ نہیں تھا مگر آپ تو انسانی سطح سے بھی گر رہے ہیں۔ قتل میں دو چیزیں مر جاتی ہیں، ایک انسان دوسری انسانیت۔ ایک خاندان پوری ایک نسل کی بنیاد ہوتا ہے، اور یہ آپ کا حق نہیں ہے کہ اپنی نسل تباہ کر دیں...... خدا کے لیے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل تاریک مت کریں۔"

"آپ فکر مت کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں...... میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ اچانک حتمی لہجے میں بولی۔ اور مضبوط آواز کے ساتھ اضافہ کیا۔ "اور میں...... آپ کا سب کو بتا دوں گی۔"

"آپ...... ایسا کچھ نہیں کر سکتیں۔" وہ بھی اسی کا انداز اسی کے لہجے میں لوٹا کر چلا گیا...... حاجرہ بے دم پرندے کی طرح چارپائی کے قریب گر گئی۔ ہاتھ پائے پر رکھے اُس کا دل بری طرح سے دھک دھک کیے جاتا تھا۔

☆☆☆

صبح صبح وہ اُٹھی تو نماز میں کتنی دیر روتی رہی۔ اُس نے سلیم کے لیے شدت سے دعا کی کہ وہ اس کام سے پلٹ جائے...... یہ پہلی صبح تھی جب وہ سلیم کے بچوں کے لیے اُن کے باپ کی معصومیت کی دعا کرتے کرتے تابش کے لیے دعا نہیں مانگ سکی تھی۔ آنسو گرتے رہے اور وہ بے بسی میں بس اللہ کو پکارتی رہی جس پر اپنے ہر معاملے میں وہ انتہا کا یقین رکھتی تھی۔

"قاتل معصوم نہیں ہوتا اور مری انسانیت زندہ نہیں ہوتی۔"

وہ ایک نمونہ تو دیکھ ہی چکی تھی۔ صبح وہ کمرے میں رہی کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی...... لیکن سلیم اس سے قبل ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ سارا دن وہ قدموں سے خاک اُڑاتا رہا۔ اُسے حاجرہ سے شکوہ ہوگیا تھا۔

"جب سارا سارا دن دو ٹکوں کے لیے بھکاریوں کی طرح بھٹکو اور کوئی مزدوری ملے بھی تو غلاموں جیسا سلوک...... اور آپ ہمیں انسانیت کے سبق پڑھاتی ہیں۔ عورتیں کبھی نہیں سمجھ سکتیں کہ مرد کن مشکلات کا سامنا کرتے دنیا کی ٹھوکروں پر رہتے ہیں۔" وہ پتھروں کو ٹھوکر مارتا دل ہی دل میں حاجرہ کو مخاطب کرتا رہا...... اُس کی اپنی مجبوریاں تھیں اور اپنی وضاحتیں...... اور حاجرہ کو وہ نہیں سنا سکا تھا۔

اگر یہی سب وہ حلیمہ سے بیان کرتا تو شاید وہ زیادہ اچھا سمجھتی کیونکہ وہ ان حالات سے گزرتی رہی ہے...... حاجرہ تو لگتی بھی اچھے خاندان کی تھی۔ جو صعوبتیں نہ جھیلے وہ باتیں بڑی اچھی کر لیتا ہے۔ اُس کے دل میں پھر سے کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔

ہر بات وطن پر جا کر ختم کرتی ہیں وہ...... اس بات سے کیا تعلق نکلتا ہے وطن کا، دو سال سے کچھ اُوپر ہو چکا ہے عرصہ، لوگ تو اب بھولنے بھی لگے ہیں کہ پاکستان کے لیے پہلے کس محبت و جوش سے نعرے لگاتے تھے۔ اب تو کہتے ہیں کہ پاکستان بن کر کیا لیا، کہتے ہیں جنگ بھی ہوگی۔ سب باہر جانا چاہتے ہیں اپنی زندگیاں آسان بنانا چاہتے ہیں...... پھر میرے کچھ کرنے سے کیا ہو جائے گا؟ ایک میرے کرنے سے...... میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔

وہ شاید خود کو مضبوط کر رہا تھا تسلی دے رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوتا ایک اُس کے کرنے سے۔ ایک انسان بھلا کتنا بگاڑ پیدا کر سکتا ہے؟ رتی برابر اور رتی برابر سے کچھ فرق نہیں آتا۔ ذہنی کشمکش میں وہ اپنی اُس منزل پر پہنچ گیا تھا جو اُس کے خوابوں کی کوٹھی تھی۔ یہاں سے روشن دن جھانکتے تھے جن کی گود میں اندھیرے نہیں چمک ہوتی ہے۔

اُسے کہا گیا تھا کہ اُسے ٹریننگ دی جائے گی، وہ بالکل نہیں گھبرائے گا باقی سب بھی تو اُسی کے جیسے انسان ہیں۔ دل سخت ہو ہی جاتا ہے جب پیسوں کا بوجھ ہاتھ اُٹھانے لگیں۔ اندر پہلے دن والی کیفیت ہر سو چھائی تھی۔

یہ کام اتنا صفائی سے ہوتا تھا کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو یہاں بستے کون ہیں۔ سلیم کو اس شاندار چمچماتی عمارت اور لوگوں میں اپنا آپ نہایت میلا لگتا تھا۔ اُس کے باس نے ملاقات کا شرف اُسے بخشا تو، تو سلیم کو پھر سے پسینے آنے لگے۔ وہ لوگ قتل کو ایک مذاق سمجھتے تھے۔ اُن کے پاس ہنسنے کی ایک ٹھوس وجہ...... ہاہاہا!

"تمہیں نشانہ لگانا سکھایا جائے گا۔ گولیاں ضائع کرنا ہمارے ہاں نہایت شرم ناک ہوتا ہے۔"

اور انسان ضائع کرنا قابلِ فخر؟ سلیم کے کہیں بہت پاس حاجرہ طنزیہ بولی تو اُس نے بری طرح سے سر جھٹکا۔ اُسے ہر حال میں اُن کی انسٹرکشنز سننی تھیں...... بغور!

"کیا زمانہ ہے صاحب! بیٹا ایک باپ کو قتل......" ایک محظوظ کن آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی تو بے ڈھنگی ہنسی چاروں اور شور ڈالنے لگی۔

"نئی بات کیا ہے، بیٹا ہو باپ ہو یا بیوی، دولت سب کروا لیتی ہے۔"

"دولت حاصل کرنے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں خیر۔" وہ اپنے کسی اور مشن کے لیے تیار تھا پھر بھی اس گفتگو میں یوں حصہ لے رہا تھا جیسے معمول کی باتیں کی جاتی ہیں۔ سلیم کے لبوں سے چائے تا حال نہیں اُتری تھی۔

"ہوتے ہوں گے طریقے پر وہ کہتے ہیں نا جس پیٹ میں حرام پلتا ہو اُس سے حلال کام کی توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ باپ نے ساری زندگی حرام کمایا اب وہی حرام اولاد کو ایسا کام کرنے پر اُکسا رہی ہے...... رزقِ حلال ہر باپ تو نہیں کھلاتا آخر۔"

بات کے اختتام پر سعید نے ایسا قہقہہ لگایا جیسے کوئی فخریہ بات کہہ دی ہو۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے تھے اعتراف۔ اُنہیں حرام راس آچکا تھا اور یہی ڈنکے کی چوٹ سلیم کے منہ پر جا کے لگی۔

''رزق حلال؟'' وہ سکتے میں آچکا تھا۔ حاجرہ کی حب الوطنی اپنے ہی طور پر سمجھائی تھی پر حاجرہ کی دعا نے شاید کام کر دیا۔

سلیم کی آنکھوں کے دو خانوں میں اپنے ''تین بچوں'' کی تصویر فٹ آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

''حاجرہ آنٹی! مفلسی کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

دھرتی پر شام کے جمتے سائے میں حلیمہ کے درمیانے بیٹے نے کتاب کھولے کھولے حاجرہ کو مخاطب کر کے پوچھا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اس سے پہلے کہ جواب دے پاتی چھوٹے نے فوراً بولنا شروع کر دیا۔

''اتنا بھی نہیں پتا، تمام مفلس لوگوں کو مار دیا جائے تو مفلسی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے، بس ایسے۔'' وہ اپنے طور داد طلب نظروں سے حاجرہ کو دیکھنے لگا تو حاجرہ کا پہلے منہ کھلا...... پھر بات سمجھ کے ہنس ہنس کے اُس کا برا حال ہو گیا۔ ان کی باتیں اُسے ایسے ہی ہنسنے پر مجبور کر دیا کرتی تھیں۔

''دیکھا، آپ۔ کب سے اُداس تھیں میں نے ہنسا دیا۔'' حاجرہ نے ہنسی سمیٹ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا تو حلیمہ سے یہ لاڈ برداشت نہیں ہوئے مٹھیاں بھینچتی حاجرہ کے پاس آئی۔

''تم آخر کب جا رہی ہو یہاں سے۔ کیا تمہارا عزت سے کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا کہ تمہیں بے عزتی محسوس ہی نہیں ہوتی؟''

اس کے سخت لہجے پر حاجرہ کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔ آسمان پر شور کرتے پنچھی کتنے بھلے تھے کہ اپنا آشیانہ خود بنا لیتے تھے مگر بے چارے انسان!

''میں اب چلی جاؤں گی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''چلی نہ جاؤ تم...... اس کا بندوبست اب میں خود کرتی ہوں۔'' وہ واقعی عاجز آ چکی تھی۔ اور رات کے واقعے نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا...... گو سلیم اسی وقت لوٹ آیا مگر وہ اب کوئی سمجھوتا کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

شام کو تھکا تھکا اور مرجھایا سا سلیم گھر لوٹ آیا۔ وہ حاجرہ سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔

''میں یہاں سے جا رہی ہوں بھائی۔'' حلیمہ کے سامنے اُس نے سلیم کو آگاہ کیا تو حلیمہ کو سراسر ڈھونگ لگا۔ ہمدردی بٹورنے اور اہمیت بڑھانے کا طریقہ۔

''کہاں جاؤ گی؟''

''پاکستان بہت بڑا ہے اور مہربان بھی۔ پھر تابش بھی مجھے مل ہی جائے گا۔ کہیں نوکری کر لوں گی، کچھ نا کچھ ہو جائے گا۔''

''تم پوچھو گی نہیں میں نے کیا کیا پھر؟''

''مجھے حق نہیں ہے۔''

''پر مجھے حق ہے کہ میں اپنے بچوں کے لیے حلال رزق کما کر لاؤں۔''

سلیم کی بات پر حاجرہ کی نظریں ایک لمحے میں اُٹھیں پھر جھک گئیں...... حلیمہ ناسمجھی کے عالم میں دونوں کی گفتگو کا سرا تھامنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم صحیح کہتی تھیں حاجرہ بی بی! مجھے حق نہیں میں اپنی نسل تباہ کروں...... میں جو کچھ کما کر لاتا ہوں میرا اللہ اس سے خوش ہوتا ہے اور مجھے لالچ نہیں ہوتی۔ مگر حرام کما کے میں حرص میں نہیں پڑ سکتا اور نہ ہی ساری زندگی اپنی نیندیں حرام کر سکتا ہوں کہ کب میری اولاد کے ہاتھ میری گریبان تک آ پہنچیں۔''

''آپ کا اللہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ آپ یہ کام کریں۔'' حاجرہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چمکنے لگے تھے۔ اُس کا اللہ پر یقین ہمیشہ ہی جیت جاتا تھا......!

''میں اپنی اولاد کو حلال طریقوں سے پالوں گا

اللہ میری نیت سے مجھے نوازے گا۔" خود اُس کی آنکھیں بھی نم لگتی تھیں...... وہ بڑی مشکل سے اس سب سے ہاتھ چھڑا کر آیا تھا۔ اس پر نجانے کتنی نظریں کتنے وقت تک رہتی تھیں مگر وہ جانتا تھا اُسے اس سب میں نہیں پڑنا تھا...... تو اس کا خوف بھی زائل ہو گیا تھا۔

"ہمارے پاس ہمیشہ ہی راستہ ہوتا ہے سلیم بھائی...... غلط راہ آسان ہوتی ہے اس لیے جلد نظر آ جاتی ہے جبکہ صحیح راہ تلاش کرنی پڑتی ہے۔ میرے پاس بھی آپ کے لیے ایک کام ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی تو سلیم نے ہلکے پھلکے دل کے ساتھ پوچھا۔

"وہ کیا؟"

"بالوشے۔" حاجرہ نے کسی کو سوچتے ہوئے دلکشی سے کہا۔ بالوشے...... بسم اللہ کے لڈو...... میٹھا رزق......!

☆☆☆

"بالوشے...... بالوشے...... بالوشے......"

صبح کی تازگی میں حاجرہ پسی گری کا سفید سفوف بالوشے کی لڈوؤں پر چھڑکتی تو ان کی خوشبو گھر کے سارے صحن میں چک پھیریاں کھاتی باہر تک پھیلتی جاتی تھی اور سلیم کی آنکھیں اسی خوشبو سے کھل جاتیں۔ وہ طمانیت سے کچھ دیر اس خوشبو کو اپنے اندر اُتارتا رہتا اور حاجرہ کو دیکھتا جو اس گھر کا اب لازمی جزو بن گئی ہے۔

حاجرہ نے اُس سے پوچھا نہیں کہ اس کی مطلوبہ چیزیں وہ کن پیسوں سے لے آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ یہ پیسے بھلے قرض کے ہوں پر ناجائز ذرائع کے نہیں ہوں گے...... پہلے دن اُس نے بالوشے کی تین تہ بنائیں، اور سلیم کو دیں تو وہ پوچھے بغیر رہا نہیں۔

"تم نے یہ کہاں سے سیکھا؟"

"میرے ابا بناتے تھے...... میں نے کسی کے لیے بہت محنت سے سیکھے۔" وہ نام نہ بھی لیتی تو سلیم خوب سمجھتا تھا کہ یہ کس کی محبت بولتی ہے۔

"تم نے کیا اسی ذائقے کے بنائے ہیں؟" وہ خوش رنگ مٹھائی کو دیکھ کر خوشی سے استفسار کرنے لگا۔ اس کے بچے دیوانے ہو رہے تھے۔

"اونہوں...... یہ میں نہیں چکھ سکتی۔" اُس نے سر جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ روئی تھی یا دھوئیں سے آنکھیں لال تھیں اور پھر اپنے ہاتھوں میں پڑے سونے کے کنگنوں سے دو اُتارنے لگی۔ امدادی کمیٹیاں اب بھی آتی تھیں کہ جنگ کے لیے چندہ دیں اور ملک کا ساتھ دیں۔ اُس کے پاس اور کچھ نہیں تھا تو جو تھا وہی دے سکتی تھی۔

"یہ واپسی پر چندے کے لیے جمع کروا آیئے گا۔" سلیم نے ہاتھ میں پکڑے تو وہ بھاری اور خالص سونے کے کافی قیمتی دکھتے تھے۔ ایسے ہی دو ابھی اُس کی کلائیوں میں بھی چمک رہے تھے

"تمہیں کتنی محبت ہے نا پاکستان سے......"

"اس لیے کہ یہ میرا اپنا ملک ہے......"

اور عصر قضا ہونے سے قبل وہ لوٹا تو بہت خوش دکھتا تھا۔ اُسے اسے بیچتے ہوئے کوئی شرمندگی تھی نہ کوفت...... واپسی پر اُس نے حلیمہ اور ابا جی کو دن بھر کی روداد سنائی تو وہ زمین پر بیٹھی سنتی رہی۔ بالوشے جلدی بک گئے تھے یہ تو اُسے چندے کے لیے کمیٹی کے دفتر جانا پڑا تو تاخیر پڑ گئی۔

پھر ہر روز یہی ہونے لگا...... حاجرہ بنا کہے اپنی سمجھ کے مطابق بالوشے کی مقدار بڑھاتی جاتی اور زیر لب کچھ دہراتے بناتی جاتی...... سلیم اپنے بچوں کے اسکول بھی جاتا ذائقے اور معیار کو دیکھ کر اساتذہ نے بھی اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر کچھ دنوں میں ہی یہ ہونے لگا کہ مٹھائی کی بات پھیلی تو آس پاس کے گھروں سے بھی مٹھائی طلب کی جانے لگی۔ اور جو واپس اُن کے پاس لوٹتی تھی وہ "تعریف" ہوتی تھی۔

اس ساری صورت حال سے ناخوش صرف "حلیمہ" تھی۔

اُسے اس گھر سے حاجرہ کی جگہ خالی کرنی تھی۔

اس لیے اب ہر صبح وہ جبر کر کے مٹھائی حاجرہ سے سیکھنے لگی۔ حاجرہ اُسے سب بتانے لگی، وہ خود سنجیدہ ہو کر کہتی تھی۔

”میں ایک دن اپنے تابش کے ساتھ چلی جاؤں گی پھر آپ نے سنبھالنا ہے۔“ اور تب ہی وہ حلیمہ کو پاگل لگتی۔ اسے اپنے سلیم کا ”تابش“ بن جانا بہت لرزا دیتا تھا۔

”تم خود کلامی کرتی ہو؟“ مٹھائی بنانے کے دوران اُس کے ہلتے لب دیکھ کر ایک دن حلیمہ نے گہری نگاہوں سے پوچھا تو وہ کچھ لمحے کے لیے لب روک کر بولی۔

”میں درود پاک پڑھتی ہوں...... برکت کے لیے اور ذائقے کے لیے۔ پہلے بسم اللہ پڑھا کرتی تھی۔“ اور حلیمہ کو اُس دن اس خوش ذائقہ اور کامیاب مٹھائی کا راز بھی پتا چل گیا۔

اب حلیمہ یہی کام کرنے لگی...... سب کچھ صحیح ہوتا جا رہا تھا۔ بس کچھ غلط تھا تو وہ حاجرہ کا وجود...... اور اس غلط کو صحیح کرنے کے لیے حلیمہ کو کسی غلطی ہی کی تلاش تھی۔ پھر اسے وہ موقع قدرت نے عطا کر دیا۔

وہ مٹھائی اب خود تیار کر لیتی تھی مگر کام زیادہ ہو جاتا تھا تو حاجرہ ہاتھ بٹا دیتی...... اُس صبح دروازے پر دستک ہوئی تو مٹھائی تیار تھی۔ حلیمہ نے جا کر دروازہ کھولا تو سلیم کا کوئی دوست اُس کو دریافت کرتا تھا۔

”میں سلیم کو بلاتی ہوں۔“ وہ بے خیالی میں مڑنے کو تھی کہ تب ہی...... سلیم غسل خانے میں تھا اور اُس کے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ اُس کے دماغ نے زندگی میں غالباً پہلی مرتبہ اتنی تیزی سے کام کیا کہ وہ خود بھی چکرائی تھی...... خوشی سے!

”آ جاؤ اندر...... سلیم سامنے کمرے میں ہی ہے۔“ دروازہ کھولتی وہ اُسے جلدی سے اندر آنے کا کہنے لگی۔ پھر اُسے لیتی ہوئی ایک کمرے کی جانب جاتی خوشی سے بے قابو تھی۔

”ایک عورت کو مرد کے دل سے صرف ایک چیز جھٹکے میں اُتارتی ہے...... اور وہ ہے ”بدکرداری“

”جاؤ اندر اسی کمرے میں ہے۔“ کانپتے دل کے ساتھ اُس نے سنبھل کر کہا۔ وہ آدمی دروازہ ہلکا سا کھول کر ایک قدم اندر گیا ہی تھا کہ حلیمہ نے انتہائی پھرتی کے ساتھ اُسے اندر دھکیلا اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیا...... یہ اتنا آسان ہو گیا کہ حلیمہ کو ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔

انہوں نے حاجرہ کو سہارا دیا تھا...... اور حاجرہ نے اُن کو مگر وہ اپنے شوہر کو صرف اپنے تک رکھنے کے لیے وہ یہ سب کر سکتی ہے۔

اندر وہ ہکا بکا سا کمرے میں بند ہوا تو حاجرہ آواز پر ایک جھٹکے سے اُٹھی اور بس...... کمرے میں اپنے علاوہ کسی کی موجودگی، وہ اپنے پورے قد سے ہل کر رہ گئی۔ اُسے لگا زمین میں کوئی بھونچال آیا ہے...... اور وقت نے ساکت ہو کر اُسے پتھر کر دیا۔

”تت...... تابش۔“

”حاجرہ یہ تم ہو!“ دونوں کے لبوں سے فقرے لڑکھڑاتے گئے مگر کسی نے کچھ سنا ہی نہیں...... وہ دونوں مقابل تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پہ...... وہ وہی تھا، وہی تابش سلیم...... حاجرہ کا سلیم۔ حاجرہ نے چاہا وہ یہیں مر جائے۔ وہ زندہ سلامت اس کے سامنے تھا اس سے زیادہ بھلا کیا خواہش کی تھی اُس نے...... دونوں کی آنکھیں تیزی سے موتی برسانے لگیں۔ اور قدم تھے کہ زمین پر زنجیر تھے۔

باہر حلیمہ نے اتنے زور سے ٹین کا دروازہ بجایا کہ سلیم جھلا کر باہر نکلا تھا۔ گیلے بالوں سے پانی ٹپکتا تھا اور چہرے سے سخت ناگواریت۔ کچھ بولنے سے پہلے ہی حلیمہ نے اُس کا بازو دبوچ لیا۔

”چلو میرے ساتھ کچھ دکھانا ہے...... بہت اچھا سمجھتے تھے نا، میں نہ کہتی تھی۔ اب تم خود ہی دیکھ لو۔“ وہ تیز تیز بولتی حاجرہ کے کمرے کے سامنے رکی اور بنا سلیم کو بولنے کا موقع دیے دروازہ کھول کر سامنے کا منظر واضح کر دیا...... سلیم تو ایک طرف، خود اُن دونوں کو دیکھ کر حلیمہ مارے خوشی کے گنگ ہی رہ گئی تھی۔

سلیم نے دیکھا کہ وہ حاجرہ تھی جو چوڑے شانے والے مرد کے کندھے پر پیشانی ٹکائے اتنا زار و قطار رو رہی تھی کہ وہ اسے چپ بھی نہیں کروا رہا

تھا...... دروازہ کھلنے پر تابش کا چہرہ اُن کی طرف ہوا تو سلیم نے غور سے پھر اُسے دیکھا...... اور یہ وہی شخص تھا جو اسے دفتر میں ملا تھا۔ یہ چندہ لینے والا وہ شخص تھا جس نے رجسٹر پر پینسل گھسیٹتے سمے بہت چونک کر اُسے دیکھا تھا...... اور کنگن دیکھتے دیکھتے بار بار پوچھتا تھا کہ یہ کس کے ہیں؟

سلیم نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ یہ اُس کی بیوی کے ہیں...... تب اُس نے گھر کا پتا بھی پوچھا تھا کہ کوئی چیز لیتے ہوئے وہ ایڈریس ضرور پوچھتے ہیں۔ لیکن وہ یہاں تک؟

"حلیمہ کیا ہے یہ سب؟" اُس نے کچھ نا سمجھتے ہوئے بیوی کو گھر کا جو نہال ہوئی جا رہی تھی۔

"تم بچے تو ہو نہیں کہ کیا ہے سب اور کیوں یہ ایک غیر مرد کے ساتھ۔"

"یہ تابش ہے سلیم بھائی۔ میں نے کہا تھا نا یہ مجھے لینے آئے گا۔" حلیمہ کی بات کاٹنے والی حاجرہ کی آواز میں تڑپ تھی، آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ اور ہجر کے وہ دکھ جسے اُسے کاٹتے سال لگ گئے تھے

"ایں۔" حلیمہ پر ہونق پن آ کر ختم ہو گیا۔ جبکہ سلیم بھی عجیب سی کیفیت میں گھرا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم نے مجھے ڈھونڈھنے میں کتنی دیر لگائی تم میرے ساتھ ہمیشہ ایسا کرتے ہو۔" وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو سلیم نے وہاں سے ہٹ جانا بہتر سمجھا۔

تابش کتنی دیر۔ اُسے چپ کراتا رہا۔ دونوں کے اچانک تصادم نے اندر چھائے غبار کو دو چند کر دیا تھا۔

"تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کرتی ہو حاجرہ۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ تمہیں لگا تھا میں مر گیا ہوں؟" وہ ہنس رہا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق لہجہ شریر بنا کر بولا تھا۔

حاجرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ ابھی کوئی مذاق نہیں چاہتی تھی...... ہرگز نہیں!

"میں زندہ تھی نا، مجھے یقین تھا تم بھی انہی فضاؤں میں سانس لیتے ہو گے۔ مر کر تم سے علیحدہ ہونے کا سوچا بھی ہو تو کہو۔"

وہ اپنے خط میں لکھی بات دہرا کر بولی تو دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ وہ کتنے مکمل لگتے تھے...... ایک ساتھ ہر بار۔ وہ جدا ہونے کے لیے نہیں تھے......!

"مجھے تم سے ہمیشہ گلہ رہے گا کہ تم اتنی دور چلی آئیں اور ہمارے اتنے خوب صورت اور قیمتی سال درد میں کروٹیں بدلتے رہے۔ مجھے یقین تھا میں تمہیں ڈھونڈھ لوں گا اور اس کے لیے میں نے دروازوں پر دستکیں دیتے اپنے ہاتھوں پر چھالے بنتے دیکھے ہیں حاجرہ...... اُس دن میں راوی پر شدید زخمی ہوا تھا لیکن مجھے میرے عیسائی دوست نے وہاں سے حملے کے دوران ہی اُٹھا لیا تھا۔ کچھ دن میں اُسی کے گھر پر رہا اور واپس آیا تو تم کہیں بھی نہیں تھیں...... میں نے آج تک اپنی زندگی کے اُن تین دنوں کو اتنی باتیں سنائی ہیں کہ وہ بہت شرمندہ پھرتے ہوں گے اب......"

"باقی سب کہاں ہیں تابش؟" اُس نے بڑی حسرت سے پوچھا تو تابش نے دو آنسو اُس کی ٹھوڑی سے چن لیے۔

"سب ہمارے پاس ہیں حاجرہ، سب مل گئے تھے گھر بھی الاٹ ہو گیا سب کچھ حاصل ہو گیا بس ایک تمہاری کمی تھی...... اماں جان اور بابا عبیرہ کے خاندان کے ساتھ پاکستان کچھ دن بعد پہنچے تھے۔ تم بھی یہاں نہ آ جاتیں تو ہم تمہیں ڈھونڈ لیتے ہماری زندگی کی خوشی۔"

"اور سبزمین تابش؟" اُس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں تو تابش نے بہت حوصلے سے اُسے دلاسا دیا۔

"جو نہیں۔ ہے وہ ہم سے بہتر مقام پر ہے...... اور کچھ کھو کے جو پایا جا چکا ہے وہ بہترین ہے۔"

اور تابش کے ساتھ پورے استحقاق کے ساتھ کھڑی حاجرہ نے جب سلیم کے کمرے میں قدم رکھا تو حلیمہ شرمندگی سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ حاجرہ نے دونوں کو الوداع کہنا شروع کیا تو اُس کی آواز میں ہمیشہ والا خالی پن نہیں تھا۔

"اللہ جو کرتا ہے ہمیشہ اچھے کے لیے ہی کرتا

ہے۔ اسی طرح لکھا تھا اور میں شاید آئی ہی وسیلہ بن کر تھی کہ آپ کو اپنی زندگی کے غلط فیصلے سے روک سکوں...... میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی سلیم بھائی آپ میرے محسن ہیں۔ میری زندگی کی آئندہ خوشیوں میں آپ کا بھی ہاتھ ہوگا...... میں بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیشہ سیدھا راستہ تلاش کیجیے گا۔'

ہر ملک کی نئی نسل اُس ملک کی سالار ہوتی ہے اور اُس نسل کو وطن کے لیے قابلِ فخر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی گھٹی میں "ایمانداری" پڑی ہو...... حلال رزق ہماری نسل کو دیانت داری کی طاقت عطا کرتا ہے اور میں جانتی ہوں اس ملک کا مستقبل بہت روشن اور بہت چمک دار ہے۔"

وہ آج ہر فکر، ہر اداسی سے آزاد تھی وہ آج دل سے خوش تھی۔ اپنی کلائی میں پڑے باقی دو کنگن اُس نے اُتارے اور حلیمہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"سمجھ میں نہیں آرہا آپ کو کس رشتے سے پکاروں مگر میں آپ کی بھی شکر گزار ہوں کہ آپ کی نیت جیسی بھی تھی مگر میرے لیے وہ آپ کی نیکی بن گئی۔ میرا اللہ گواہ ہے حلیمہ، میں نے سلیم بھائی کو ہمیشہ بھائی کا مقام دیا ہے...... یہ میرے کنگن ہیں چارپائی کے بازو پر رکھ دیے انکار مت کیجیے گا۔ بہت کم ہیں مگر میرے پاس ان سے بڑھ کر قیمتی چیز آگئی ہے مجھے بس اُس کی حفاظت کرنی ہے...... ان سے آپ مٹھائی کی دکان ڈال لیجیے گا...... اجازت دیجیے جلد ملاقات ہوتی ہے۔"

حلیمہ نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا۔ اپنی شرم ساری اُسے آبدیدہ کر رہی تھی۔ سلیم نے سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کیا اور جب حلیمہ نے دیکھا کہ جس باوقار چال کے ساتھ وہ آئی تھی ویسے ہی جاتے ہوئے وہ ان کے گھر کو سونا کرتی جارہی ہے تب تابش کی شوخی ایک بار پھر جاگ رہی تھی۔

"اچھا تو کیا کہہ رہی تھیں تم، مجھے سنبھال کر رکھنا ہے اب گھر میں؟"

"میں نے کب کہا؟" وہ انجان بن کر بولی۔

"اندر تم نے حلیمہ سے کچھ ایسا ہی کہا ہے۔"

"جھوٹ بولا ہے۔"

"تو نہیں سنبھال کر رکھوں گی؟" شریر انداز۔

"نہیں تمہیں فوجی بننے کے لیے بھیجوں گی۔" وہ ہنسی دبا کر بولی۔

"اس سے پہلے شاید مجھے دولہا بننا پڑے۔" وہ افسوس سے سرد آہ بھر کر بولا تو حاجرہ بری طرح جھینپ گئی۔ تابش نے اُسے دیکھا تو دونوں کے قہقہے فضاؤں میں جلترنگ بجاتے بکھرتے گئے۔

اور پھر ایک گلابی شام جب گھر میں اس کی آمد کے بعد سب رونقیں بحال تھیں اور اس کے چہرے پر سوگواریت کی ہر تہہ مٹ چکی تھی تب ہاتھوں پر تابش کے نام کی مہندی لگنے کے بعد وہ پہلے کی طرح، بلی ایسی چال چلتی ہوئی دبے قدموں تابش سلیم کے کمرے میں گئی اور مہندی والے ہاتھوں کے ساتھ اُس کی فائلوں سے ایک صفحہ کھینچ کر نکالتے ہوئے بے فکری سے وہیں لکھنے بیٹھ گئی۔ مہندی سفید صفحے پر اپنا رنگ چھوڑنے لگی۔

پیارے اشوک!

ان سالوں میں جو ہوا ہے لگتا ہے کہ اب تم سے چھوٹی ہو کر بھی کچھ بڑی ہوگئی ہوں۔ میری دعا ہے تم خوش ہوگے، میری خوشی اسی خط میں دیکھ لو......!

پیارے اشو! تم نے اپنا فرض نبھایا اب میری خواہش فقط یہ ہے کہ تم ایک اچھی اور سچی زندگی گزارو اور مرنے کے بعد ہم دونوں ایک ہی نبی کے امتی کی پہچان سے اُٹھائے جائیں! ہماری یہ داستان صرف محبت کی نہیں تھی۔ اس میں بہت کچھ تھا اور اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے اور میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم جہاں بھی رہو......! کہتے ہیں کسی بھی ملک کی قوم اُس کا غرور ہوتی ہے۔ اتنا خیال رکھو کہ کیا وہ ہم ہیں؟ مجھے بھی خط لکھو......!

حاجرہ سلیم!

تمہاری اچھی بہن منتظر۔

☆☆

زارا ہنجرا

تیری دید میری عید

حبس زدہ شام میں سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ ہانڈی چولہے سے اتار کر وہ چھت پر آ گئی کیونکہ روٹی بنانے کی ذمہ داری امی کی تھی۔ حسب عادت اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا سامنے والے گھر میں کئی مہینوں سے تالا پڑا تھا۔ پرانے کرائے دار جو چلے گئے تھے۔ عجیب ویرانی تھی اور رات میں جو کبھی بھولے سے نظر پڑ جاتی تو وہ گھر بھوت بنگلا لگتا۔ دور دور تک تمام چھتیں سنسان اور خالی تھیں کہیں کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوتا اگر کوئی گاؤں تو ساتھ ساتھ جڑی چھتوں پر بالترتیب بچھی چارپائیاں نظر آتیں۔ الھڑ مٹیاریں پراندے جھلاتی ٹولیوں کی صورت کھڑی ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوتیں، اس نے چشم تصور سے ہی سارا منظر دیکھ لیا۔''

''ہائے ہمارے نصیب!'' اس نے آہ بھری۔

رانیہ والدین کی اکلوتی اولاد تھی ساری زندگی اس نے بہن کی کمی شدت سے محسوس کی اوپر سے کوئی کزن بھی نہیں تھی۔ ایک تایا تھے جو برابر والے گھر میں دو صاحبزادوں شیری اور میقال اور ایک عدد بیگم کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ اتفاق سے آس پڑوس کسی گھر میں اس کی ہم عمر لڑکی بھی نہیں تھی۔ جس کو وہ سہیلی بنا لیتی۔ ویسے شیری بھی کسی سہیلی سے کم نہیں تھا۔ جو تایا ابو کی طرح ہی ہنس مکھ اور زندہ دل قسم کا بندہ تھا۔ شیری کا خیال آتے ہی اس کی نظریں بے ساختہ برابر والی چھت کی طرف گئیں۔

''ہائیں یہ کیا؟'' جنگلے پر غالباً کوئی موبائل پڑا ہوا تھا ایک ہی جست میں وہ وہاں تک آئی تھی۔ چھت پر اس کے علاوہ تو اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے پوری تسلی کی۔

''شیری چھت پر آیا تھا؟'' اس نے موبائل اٹھا کر سوچا کیونکہ اتنا قیمتی سیٹ دونوں گھروں میں اس کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا۔

''ہرا۔ یہ تو ان لاک ہے۔'' اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ غیر دانستہ ہی اس کی انگلی واٹس ایپ پر جا لگی۔ اس کا تو دل تھا انٹرنیٹ استعمال کرنے کا۔ وہ ابھی بند کرنے ہی لگی تھی کہ بے ساختہ نظریں ایک ٹیکسٹ پر جا رکیں جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی بھیجا گیا تھا۔

''اچھا جانی کل تک ضرور بتا دوں گا۔ ٹیک کیئر۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں، اس نمبر کی تمام بات چیت دیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ پچھلے تو کسی دن کی کوئی بات چیت نہیں تھی۔ بس چند میسج آج کے بلکہ تھوڑی دیر پہلے کے تھے۔ ڈی پی بھی خالی تھی۔ کیا پتا یہ کون ہے؟ ذہن بننے لگا۔

پہلا میسج ''ہائی'' شیری کی طرف سے تھا۔

''بتایا نہیں کچھ۔'' انجان نمبر سے پوچھا گیا تھا۔

''ابو رات کو لیٹ آئے تھے تو تفصیلاً بات نہیں ہو سکی۔'' شیری کا جواب تھا۔

''ویسے پکس تو دکھا دی تھیں گھر میں؟'' دوسری طرف سے پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں دکھا دی تھیں۔''

''پکس دیکھ کے انکل آنٹی نے کچھ کہا نہیں۔ مطلب پسند یا ناپسند کا اظہار؟''

''ہاں نا......ابو تو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے البتہ امی نے کہا تصویر میں تو بالکل ٹھیک ہے بس ایک دفعہ ویسے جا کے دیکھنا بھی ضروری ہے۔''

''اوہ۔ تو مسٹر شہریار۔ یہ ہے تمہاری اوقات۔'' اس نے دانت کچکچائے دل تو چاہا موبائل کو پچھلی گلی میں پھینک دے لیکن ابھی باقی کے میسج پڑھنے بھی ضروری تھے۔

''ہمم......اس کا مطلب ہے آدھا فیصلہ ہو گیا ہے۔'' انجان نمبر سے خوشی کا اظہار ہوا تھا شاید۔

''فیصلہ آدھا نہیں ''میری جان'' ڈن سمجھو۔'' یہ شہری کا جواب تھا۔

''خبیث...... آوارہ...... لوفر......'' رانیہ نے دل میں جی بھر کے گالیاں دیں۔

''اچھا پھر کب میری طرف آنے کا پروگرام ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"اچھا جانی۔ کل تک ضرور بتادوں گا۔"

"اف! میرے خدا!" اس کے کانوں سے دھواں نکل رہا تھا کیسے بار بار کسی لڑکی کو جان جان کہہ رہا ہے۔ "گھٹیا انسان ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا۔" اس نے دانت پیسے موبائل زور سے جنگلے پر پٹخا اور اپنی چھت کی طرف کود گئی۔

☆☆☆

"ساری رات کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی کبھی سوچتی کہ اس کا نمبر بلاک کر دوں۔ دھوکے باز، مکار، منافق انسان اس قابل ہی نہیں کہ اب اس سے بات کی جائے۔ پھر سوچتی مجھے ظاہر ہی نہیں کرنا چاہیے کہ مجھے اس کے کالے کرتوتوں کا پتا چل گیا ہے اور ویسے تایا تائی بھی برابر کے شریک ہیں۔ جب اصلیت سامنے آگئی ہے تو ظاہر کرو یا نہ کرو ان کو تھوڑی کوئی فرق پڑنا ہے۔

ساری رات اس دشمن جاں کی باتیں یاد کر کے آنکھیں بھیگتی رہیں۔ صبح کے قریب اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ تمہارا کون سا معاشقہ تھا اس کے ساتھ جو اس کی یاد میں آنسو بہاؤ۔

بس بڑوں نے بچپن میں شاید کبھی رشتے کی بات کی تھی نا۔ اب اگر وہ اپنے قول سے پھر رہے ہیں تو پھر جائیں بلکہ بھاڑ میں جائیں۔

دن چڑھتے ہی وہ اس انتظار میں تھی کہ جلدی ابو دفتر کے لیے جائیں اور وہ امی کے آگے اپنا حال دل بیان کرے۔ اور ابو کے جاتے ہی اس نے دکھڑا سنا دیا تھا۔

"ارے۔ تمہاری تائی تو سدا کی میسنی ہے، میں نہ کہتی تھی تم لوگوں سے...... مگر تم باپ بیٹی کو ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ "اب دیکھ لیا نا؟" امی کی تان تائی پہ جا ٹوٹی تھی۔

"امی۔ آپ ابو کو فی الحال کچھ نہ بتایے گا۔"

اسے لگا کہ اس نے امی کو بتا کر غلطی کر دی ہے اسی لیے ابو کو کچھ نہ بتانے سے منع کیا۔ لیکن امی ٹھہریں پیٹ کی ہلکی نجانے شام تک کیسے ہضم کی تھی کہ ابو کے آتے ہی اگل دی۔

"اور کریں بھائی بھابھی کی طرف داری...... اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں۔" امی کو بھی آج خوب موقع ملا تھا تائی کے خلاف بولنے کا۔

ابو بے چارے نادم سے سر جھکائے بیٹھے رہے ظاہر ہے کیا بولتے اب۔ اور وہ ہذیانی کیفیت میں یہ منظر دیکھتی اپنے سارے ناخن چبا چبا کر کھا چکی تھی۔ جو کہ اتنے مہینوں کی محنت کے بعد ذرا سے بڑھے تھے۔"

"بات کا پتا تو امی ابو کو چل ہی گیا ہے کیوں نہ میں اس شیری سے بھی دو دو ہاتھ کرلوں۔" بستر پر لیٹتے ہی خیال آیا تھا سوئے اتفاق اسی وقت شیری کا میسج آگیا۔

"کنجوس لڑکی کبھی خود سے بھی میسج کر لیا کرو۔"

ابھی وہ اس کے میسج پر جل بھن ہی رہی تھی کہ دوسرا میسج آگیا۔ "ویسے کیا حسین دن تھا آج کہ تم نے ہمارے گھر کو رونق نہیں بخشی...... ہاہاہا۔"

ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ ابھی اس کو آئینہ دکھاتی ہوں۔ رانیہ نے کال ملا کر اس کو کھری کھری سنادیں۔ اور صاف صاف ہر بات اس کے منہ پر مار دی۔

وہ صفائیاں دیتا رہا لیکن ادھر بھی رانیہ تھی کیسے مان جاتی اور بھلا مانتی بھی کیسے...... کانوں سنا جھوٹ ہو سکتا ہے لیکن آنکھوں دیکھا کیسے جھٹلاتی۔ ہاتھ مار کر کال کاٹی موبائل آف کیا اور پر سکون نیند سو گئی اور آج جاگنے کی باری شیری کی تھی۔

☆☆☆

عید میں دو دن رہ گئے تھے۔ آج ابو بکرا لینے گئے تھے۔ یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ ابو بکرا لینے اکیلے گئے تھے ورنہ تو دونوں بھائی اکٹھے جاتے تھے اور اب تو کئی سالوں سے شیری بھی ساتھ جاتا تھا۔ ابو کے دل میں خیال تھا کہ شاید تایا ابا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے مگر ایسا نہ ہوا ان لوگوں نے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بلکہ کل شیری اور تایا ابو بکرے بھی لے آئے تب ابو کو

یقین ہوا کہ خون واقعی سفید ہو چکا ہے۔

ان کا صحن چھوٹا تھا پہلے تو بکرے ہمیشہ تایا ابو کے بڑے سے صحن میں باندھے جاتے تھے لیکن اس بار انہیں اپنے صحن پر باندھنا پڑا۔ تنگ سی جگہ یہ بہت حبس ہو جاتا تھا۔ تو سہ پہر کو وہ بکرا چھت پر لے گئی کہ رات چھت پر ہی باندھ دے گی۔ چھت کی دیوار سے گلی میں دیکھا تو تائی گاڑی سے اتر کر گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ تائی کے ہاتھ میں جو شاپنگ بیگ تھے ان سے اندازہ ہو رہا تھا برانڈڈ چیزیں خریدی گئی ہیں۔ پیچھے ہنستا مسکراتا شیری بھی گاڑی کی پچھلی سیٹ سے تین چار شاپنگ بیگز نکال کے لایا تھا۔ متجسس سی ہو کر ان کی چھت پر جنگلے کے ساتھ کان لگا کے کھڑی ہو گئی کہ اگر صحن میں چلتے چلتے انہوں نے کوئی بات کی تو یہاں سے باآسانی سن سکے گی۔ یہ کام اور جگہ دونوں ہی نئے نہیں تھے۔ وہ بچپن سے اس جگہ کھڑی ہو کر تائی کی باتیں سنا کرتی تھی۔

''شاپنگ مکمل ہو گئی۔ بس شام کو تم جیولری سے جیولری بھی اٹھا لانا۔''

''ہوں۔ تو منگنی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' اس نے ناک سیکڑی۔

''امی سب کچھ ہو جائے گا۔ بس ابو سے کہیے گا جذبات میں آ کر چاچو لوگوں کو کچھ نہ بتا دیں۔ ویسے بھی کل جب منگنی ہو گی تو سارا زمانہ دیکھ لے گا۔'' آہستہ سے کہتے ہوئے وہ آخر میں خوب چہک رہا تھا۔

ادھر رانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔ پھر وہ فوراً نیچے بھاگی ظاہر ہے امی ابو کو بتانا ضروری تھا۔

☆☆☆

آج عید کا دن تھا لیکن معمول سے ہٹ کر نہ تو ابو کے چہرے پر خوشی دکھائی دے رہی تھی اور امی بھی بجھی بجھی تھیں۔ وہ خود بھی تو گم صم تھی...... جو کپڑے اتنے ارمانوں سے لیے تھے آج بے دلی سے پہنے تھے اور اس بار تو ہتھیلیاں بھی خالی تھیں۔

''مہندی لگانا تو یاد ہی نہیں رہا مجھے۔'' اسے اپنی سونی سونی ہتھیلیاں دیکھ کر خیال آیا۔ ''بی بی! مان جاؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔'' دل سے کہیں آواز آئی تھی اور ساتھ ہی کاجل کے بنا سونی آنکھوں میں بے تحاشا نمی...... ''کسی بے وفا کے لیے رونے کا کیا فائدہ۔ فوراً ہی اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

ابو نماز پڑھ کر آئے تو فوراً قربانی ہو گئی۔ کیوں کہ قصائی پہلے ہی بتا گیا تھا کہ پہلا نمبر آپ کا ہے۔

قربانی کا مرحلہ اور گوشت کی تقسیم اللہ کے فضل سے دونوں کام ہی احسن طریقے سے ہو گئے تھے۔ ابو اب فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ وہ امی کے ساتھ مل کر کلیجی پکا رہی تھی۔

''کتنا اچھا ہوتا تھا نا کہ پہلے سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ دیوار کے ساتھ دیوار جڑی ہے۔ لیکن ان لوگوں نے آج عید مبارک کہنا تک بھی گوارا نہیں کیا۔ تینوں نفوس کے ذہنوں میں بیک وقت یہی خیال آ رہا تھا۔

''ارے یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' ابو باہر سے آنے والی آواز پر چونک کر بولے۔

''عید مبارک۔ بھئی کہاں گئے سب لوگ۔''

''تایا ابو......''

ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے اس کا ہاتھ رکا تھا۔ وہ لوگ سب لاؤنج میں آ چکے تھے تائی کے ہاتھ میں وہی شاپنگ بیگ اور مٹھائی کے ڈبے بھی تھے جو شہری اور میقال نے اٹھائے ہوئے تھے۔

تو یہ لوگ ہمیں بھی لینے آئے ہیں کہ ان کے صاحبزادے کی منگنی میں شامل ہوں۔

اس نے حالات واقعات کی یہی نتیجہ اخذ کیا۔ وہ خود ہی بیٹھ گئے تھے شاید ان لوگوں کو بٹھانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ رسماً اسے اور امی کو کچن سے باہر آنا پڑا۔

شیری نے اس کی اداس صورت بغور دیکھی۔

''ادھر آؤ نا میری بیٹی...... ہمارے پاس آ کے بیٹھو۔'' تایا تائی اس کی بلائیں لینے لگے۔

''اف! کتنے منافق ہیں یہ لوگ۔'' اس نے سلگ کر سوچا اور امی کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

”بھئی۔ قصہ مختصر ہمیں تو ہمارے صاحبزادے نے اس بات کو راز رکھنے کا کہا تھا۔ اور ہم نے مان لیا کیونکہ ان بچوں کی خوشی ہی ہماری خوشی ہے۔“ تایا نے کہا تو امی نے ابو کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ سن لیں بھتیجے کے کارنامے۔ اور رانیہ کا دل چاہا کہ فوراً تائی تایا کے بیچ سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

”بھئی۔ اب اس راز کو فاش کر دو مجھ سے اب اور ہضم نہیں ہوگا۔“

تایا نے تائی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

ابو نے حیرت سے تایا کو دیکھا کہ ان کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”آج کے مبارک دن پر ہم چاہتے ہیں ان بچوں کی منگنی کر دیں۔ شیری نے آپ لوگوں کو بتانے سے منع کیا تھا اس لیے ہم معذرت چاہتے ہیں۔“

تائی امی نے مخملی ڈبیا سے گولڈ کا لاکٹ اور رنگ نکال کر اسے پہنائی یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔

”لیکن آپ لوگ تو شیری کی منگنی کہیں اور کر رہے تھے۔“ ابو نے بوکھلاہٹ سے کہا۔ سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

”شیری دکھاؤ اپنا موبائل اور اپنے اس دوست سے ہو سکے تو اپنے چاچو کی بات کرا دو۔ جس نے بکروں کی تصویریں بھیجی تھیں کہ گھر بیٹھے پسند کرلیں اور پھر ہوم ڈلیوری کر دی جائے گی۔“

”سچ ......“ ابو امی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر یک زبان کہا۔ اور رانیہ نے جھینپ کر نظریں جھکاتے ہوئے اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا جو ان کے رشتے کی گواہ بن گئی تھی۔

عیدان کے آنگن میں بھرپور انداز سے اتری تھی۔ تایا اور ابو فوراً ایک دوسرے کے گلے لگ گئے تھے اور امی تائی سے جا لپٹیں۔ شرمائی لجائی رانیہ کی جگنوؤں سے چمکتی آنکھیں شیری کے چہرے پر جا ٹھہری تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں ”تیری دید میری عید“

☆☆

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوبی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضا مند نہیں ہے۔

سونیا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

ربیکا بیلا کو اغوا کر کے حمزہ کو بلیک میل کرتی ہے اور مجبوراً حمزہ کو ربیکا سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ شہرینہ حالات سے

سمجھوتا کر کے اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے۔

خزینہ تیمور کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تیمور بچے کو سارہ کی پاس لے جاتا ہے اور خزینہ سے کہہ دیتا ہے کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ خزینہ کو کچھ عرصے بعد دوسرے بیٹے سے نواز دیتا ہے تو تیمور کے دل پر سے خزینہ سے اولاد چھین لینے کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔

جہانداد کی ماں نفسیاتی مریضہ ہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق جہانداد ماں کو خوش رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

جہانداد کے اسکول میں شہرینہ ٹیچر ہے۔ شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کے دل میں انجانی خواہشات جنم لینے لگی ہیں۔ جہانداد کی ماں بیمار ہوتی ہیں تو اسکول کی ٹیچرز عیادت کے لیے ان کے گھر جاتی ہیں وہاں شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کی ماں اندازہ لگا کر کہتی ہیں اس لڑکی کے دل میں بڑا درد ہے اور پھر شہرینہ کے آنسو سارے بند توڑ کے بہنے لگتے ہیں۔

تیسویں قسط

سبینہ ہمیشہ کی طرح اچانک آئی تھی اور آتے ہی جانے کی بات بھی کرنے لگی تھی جس پر شہرینہ جھنجلا گئی۔

"کیا آپا......! ہر وقت ہوا کے گھوڑے پہ سوار رہتی ہیں۔ ہم تو ترس ہی گئے ہیں، آپ سے باتیں کرنے کو۔"

"تو بیٹھو، میرے پاس۔ کرو باتیں۔ کیا باتیں کرنی ہیں، لیکن دیکھو۔ ملکی حالات پر مت شروع ہو جانا۔ میرے کان پک گئے ہیں تمہارے دولہا بھائی کی زبانی سن سن کر۔" سبینہ کی زبان بہت تیز چلتی تھی۔

"توبہ کریں آپا! مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خیر میں آپ کو اچھی خبر سناتی ہوں۔" شہرینہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پتا ہے، بیلا کی شادی طے ہو گئی ہے۔"

"ہیں......کب؟" سبینہ کو خوشی سے زیادہ جھٹکا لگا تھا۔

"عید کے بعد ہے۔ آپ بھی تیاری کر رکھیں۔" شہرینہ پرجوش تھی۔

"کاہے کی تیاری۔ چچی جان نے ہمارے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو ہم ان کی بیٹی......"

"افوہ آپا! وہ سب باتیں بھول جائیں۔" شہرینہ ٹوک کر کہنے لگی۔ "چچی جان نے کچھ برا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ مخلص رہی ہیں۔"

"اور حمزہ......؟"

"میں حمزہ کو بھی الزام نہیں دیتی۔ بس جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے، اسے وہی ملتا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اب پتا نہیں تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ مجھے تو تمہاری فکر ہے۔" سبینہ کہہ کر حمیدہ بیگم سے مخاطب ہو گئی۔ "امی! آپ نے کیا سوچا ہے شہرینہ کے لیے۔ رشتے یوں ہی آسمان سے نہیں ٹپک پڑتے۔ کوشش کرنی پڑتی ہے۔"

"کیا کوشش کروں۔ یہ مانے تب نا......ایک ہی ضد ہے، ابھی شادی نہیں کرنی۔" حمیدہ بیگم اس بات سے خاصی نالاں تھیں۔

"کیوں۔ ابھی کیوں نہیں کرنی۔ جب عمر نکل جائے گی تب کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

"یا اللہ۔ یہ آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔ میں آپ کو بیلا کی شادی کی خوش خبری سنا رہی تھی۔" اسے آپا پر غصہ آنے لگا تھا، بمشکل ضبط کر پائی۔

"بیلا چھوٹی ہے تم سے۔" سبینہ زور دے کر بولی۔

"پتا ہے......اور اپنے بارے میں، میں آپ کو بتا دوں۔ جب تک میرا دل آمادہ نہیں ہوگا، میں شادی

Waqar Azeem
www.pakistanpoint.com

سوچوں گی بھی نہیں۔ چاہے میری عمر نکل جائے یا تمام ہو جائے۔'' وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ سبینہ کی باتوں نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔

ادھر سبینہ حمیدہ بیگم کو الزام دے رہی تھی کہ ان کی ڈھیل نے اسے سر چڑھا دیا ہے۔ اس کے بعد اس کی وہی باتیں کہ اسے سسرال میں طعنے سننے پڑتے ہیں۔ آواز شہرینہ تک آ رہی تھی۔ اس نے سلگ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ جانتی تھی سبینہ آپا جو آتے ہی جانے کی بات کرنے لگی تھیں، اب فرصت سے امی کو سبق پڑھا کر ہی جائیں گی۔ اس لیے اس نے کھڑکی پر پردے گرا دیے اور سونے کے ارادے سے لیٹی ہی تھی کہ اس کے موبائل پر میسج ٹون بجنے لگی۔ اس نے بے دلی سے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ جہانداد کا میسج تھا۔

''ماں گھر آ گئی ہیں۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' اس نے طویل سانس کھینچ کر شکر ادا کیا۔ دل پر سے وزنی بوجھ سرک گیا تھا۔ ورنہ وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو وہ خود کو معاف نہیں کر پائے گی۔ بہر حال اتنے دنوں سے چھائے خوف کے بادل چھٹ گئے تھے تو وہ ہلکی پھلکی ہو کر سو گئی۔

☆☆☆

خزینہ تمام راستہ حمزہ کو سمجھاتی آئی تھی کہ اسے غصہ بالکل نہیں کرنا۔ اگر ربیکا کی کوئی بات اسے ناگوار گزرے تب بھی اسے تحمل کا مظاہرہ کرنا ہے اور بہت آرام سے پیار سے سمجھا بجھا کر اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حمزہ بڑی سعادت مندی سے اس کی ہر بات پر سر ہلاتا رہا اور جب ربیکا کے بنگلے پر گاڑی روکی تب خزینہ کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''میں نے تمہاری ساری باتیں نہ صرف سنیں بلکہ سمجھ بھی لی ہیں۔ اور میں ان پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''شاباش......'' خزینہ اس کا کندھا تھپک کر گاڑی سے اتر گئی تو حمزہ نے پہلے ویو مرر میں اپنا جائزہ لیا پھر گاڑی بند کر کے خزینہ کے ساتھ چلتے ہوئے گیٹ پر رک کر چوکیدار سے پوچھنے لگا۔

''ربیکا بی بی ہیں اندر......؟''

''جی صاب۔ آپ کون؟'' چوکیدار کے پوچھنے پر وہ خزینہ کو یوں دیکھنے لگا، جیسے کیا بتاؤں اپنے بارے میں۔

خزینہ نے گھور کر اسے دیکھا پھر فوراً چوکیدار سے بولی۔

''یہ ربیکا کے ہسبینڈ مطلب شوہر ہیں...... گیٹ کھولو۔''

''سلام صاب!'' چوکیدار نے فوراً سلام کے ساتھ گیٹ کھول دیا تو وہ خزینہ کو آگے چلنے کا اشارہ کر کے پھر اس کے پیچھے اندر داخل ہوا تھا۔

''واؤ......'' خزینہ بنگلے کی شان و شوکت دیکھ کر کہنے لگی۔ ''تمہارا بنگلا تو بڑا شاندار ہے حمزہ! لان کی خوب صورتی دیکھو۔''

''شٹ اپ......'' حمزہ نے دبے لہجے میں ٹوک کر قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ روش سے آگے کوریڈور پھر وہاں سے اندر داخل ہو کر دونوں رک گئے۔ چاروں اور نظریں دوڑانے کے بعد آخر میں خزینہ کو ربیکا نظر نہ آئی تو اس نے بے اختیار پکار لیا۔

''ربیکا......'' سناٹے میں اس کی آواز سارے میں گونجی تھی، جب ہی دوسری بار پکارنے کی نوبت نہیں

آئی۔ دائیں طرف کمرے کا دروازہ کھول کر ربیکا تیزی سے نکلی تھی لیکن حمزہ کو دیکھ کر رک گئی۔

"کیسی ہو؟" حمزہ کو کہنا پڑا۔

"فرسٹ کلاس......" ربیکا کی گردن مزید تن گئی، جسے نظر انداز کر کے وہ خزینہ کے کندھے پر بازو پھیلا کر بولا۔

"یہ خزینہ ہے، میری بہن۔"

"بہن......" ربیکا نے پہلے قصداً نا سمجھنے کا انداز اپنایا پھر جیسے سمجھ کر بولی۔ "او اچھا کزن...... خیر یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

"اگر میں کہوں، یہاں سے گزرتے ہوئے سوچا تمہیں بھی دیکھتا جاؤں کہ......"

"زندہ ہوں یا مر گئی۔" ربیکا نے فوراً اس کی بات اچکی۔ حمزہ نے ہونٹ بھینچ لیے تو زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔

"دیکھ لیا، زندہ ہوں اور بھرپور زندہ ہوں۔"

حمزہ خزینہ کو دیکھ کر غالباً چلنے کا اشارہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ آہستہ سے اس کا بازو دبا کر کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے تم دونوں باتیں کرو، میں باہر بیٹھتی ہوں۔" پھر آنکھوں سے حمزہ کو رکنے کا اشارہ کر کے و وہاں سے نکل کر لان میں چلی گئی۔

ربیکا بلا ارادہ خزینہ کے پیچھے دیکھے جا رہی تھی۔

حمزہ نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا پھر اسے سلگانے کے لیے لائٹر جلایا تو ٹک کی آواز سے چونک کر ربیکا اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کھڑے کیوں ہو، بیٹھو۔"

"میں بیٹھنے نہیں، تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ سگریٹ کا شعلہ دکھا کر بولا۔

"اچھا......" وہ ہنسی۔

"ربیکا......" وہ قدرے تیز ہوا۔ "میں یہاں آنکھ مچولی کھیلنے نہیں آیا۔ صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ سیدھے سیدھے میری بات کا جواب دو کہ آخر تم کیا چاہتی ہو۔"

"تم بتاؤ...... تم کیا چاہتے ہو؟" وہ بھی تڑخ کر بولی۔

"میں......" حمزہ چند لمحے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بے حد تلخی سے گویا ہوا۔

"میں نے تو کچھ نہیں چاہا، حتیٰ کہ تمہیں بھی نہیں۔ جس طرح تم زبردستی میری زندگی میں داخل ہوئیں، اس کے بعد تم نے سمجھ لیا کہ مجھے اپنے اشاروں پر چلاتی رہو گی۔ نو...... اپنی خوش فہمی یا غلط فہمی دور کر لو ربیکا۔ حمزہ کاٹھ ک الو نہیں ہے، سمجھی۔"

"تم......" وہ تلملا کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ حمزہ نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"بس...... میں تمہاری کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا۔ تمہیں چلنا ہے تو چلو ورنہ......"

"ورنہ......؟"

"میں تمہیں آزاد کر دیتا ہوں۔" حمزہ کہہ کر جانے کے لیے پلٹا لیکن پھر رک گیا۔

"یہ محض دھمکی نہیں ہے ربیکا۔ میں تمہیں تین دن دے رہا ہوں، اچھی طرح سوچ لو۔ آنا چاہو گی تو ٹھیک ورنہ تیسرے دن میرا دروازہ تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

"تیسرے دن کیوں، تم ابھی بند کر لو سب دروازے...... اور نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں دوبارہ بھی تمہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔" ربیکا بالکل آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ "تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ کمزور مرد ہو تم...... تم میں

پرواز کی طاقت ہی نہیں جب ہی پنجرے میں بند پڑے ہو۔ تمہاری اوقات ہی نہیں ہے ایسے عالی شان گھر میں رہنے کی۔"

"ٹھوکر مارتا ہوں میں تمہارے اس عالی شان گھر اور تمہیں بھی۔ بتا دینا اپنے باپ کو، میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے۔ طلاق دیتا ہوں تمہیں...... طلاق...... طلاق......" وہ اس امیر زادی کے غرور کو ٹھوکر مار کر تیزی سے پلٹا لیکن دروازے میں خزینہ کو کھڑے دیکھ کر ایک لحظہ کو ٹھٹکا پھر اگلے پل تیزی سے آگے بڑھا اور خزینہ کا بازو تھام کر اسے لیے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

واپسی کے راستے میں خزینہ بالکل خاموش تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا بلکہ وہ اس سے خائف ہو رہی تھی۔ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھتی ضبط کی انتہا پر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر ایک موڑ پر جہاں سے راستہ اس کے گھر کی طرف جاتا تھا، وہ بول پڑی۔

"پہلے مجھے گھر چھوڑ دو۔"

"نہیں۔ ابھی تم میری ساتھ چلو، کیونکہ اماں میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گی۔ تم ہی انہیں بتا سکتی ہو، قصور میرا ہے یا اس کا۔" اس کی آواز کا بھاری پن اندرونی خلفشار ظاہر کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا، قصور کس کا ہے۔" وہ کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ حمزہ نے اپنی طرف سے کوئی صفائی دینے کی سعی نہیں کی۔ یوں بی اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا۔

گھر آ کر اس نے خزینہ کو اماں کے پاس جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"حمزہ کے بچے۔ تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گی۔" خزینہ نے دانت پیسے۔ پھر خود پر قابو پا کر فاخرہ کے کمرے میں آ گئی۔

فاخرہ جاءنماز پر بیٹھی تسبیح میں مشغول تھیں۔

"السلام علیکم، چچی جان۔" اس نے سلام کیا تو فاخرہ نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے پیچھے دیکھنے لگیں۔

"کیسی ہیں چچی جان۔" وہ زمین پر گھٹنے ٹیک کر فاخرہ کے گلے لگ گئی۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا۔ تم......" فاخرہ نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"جی۔ میں حمزہ کے ساتھ آئی ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ حمزہ کہاں ہے اور وہ دلہن بھی آئی ہے تمہارے ساتھ۔" فاخرہ دلہن کے لیے بے چین تھیں۔ خزینہ فوری جواب سے کترا کر پوچھنے لگی۔

"آپ نے نماز پڑھ لی؟"

"ہاں بیٹا۔ پڑھ لی۔"

"تو چلیں، اوپر بیٹھیں۔ اور بیلا کہاں ہے؟ بیلا......" اس نے پوچھنے کے ساتھ بیلا کو پکار بھی لیا۔

"ارے خزی باجی۔ السلام علیکم۔" بیلا بھاگی آئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ جلدی سے ٹھنڈا پانی لاؤ اور پھر فوراً چائے بنا لو۔ وہاں تو کسی نے چائے پانی پوچھا ہی نہیں۔" وہ روانی میں کہہ گئی اور فاخرہ کی "ہائیں" سن کر سٹپٹا بھی گئی۔

"بیٹھیں ناں چچی جان۔ آئیے ادھر آرام سے بیٹھیں۔"

"بیٹا۔ حمزہ تمہیں دلہن کے ہاں لے گیا تھا؟" فاخرہ نے بیٹھتے ہی پوچھا تو اب وہ تحمل سے بولی تھی۔

''جی چچی جان۔ ہم وہیں سے آرہے ہیں۔''

''پھر...... دلہن نہیں آئی۔ کیا کہتی ہے؟'' فاخرہ بے صبری ہورہی تھیں۔

''بس چچی جان۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ وہ یہاں آنا ہی نہیں چاہتی بلکہ حمزہ کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی۔ بہت بدماغ ہے۔ بہت باتیں سنائیں اس نے ہمیں اور حمزہ سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔'' وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

''ہائے اللہ......'' فاخرہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

''بے جوڑ شادیوں میں یہی ہوتا ہے چچی جان۔ میں نے اور حمزہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو جیسے پہلے سے طے کیے بیٹھی تھی۔ ایک ہی رٹ...... مجھے ابھی طلاق دو...... ورنہ میں کورٹ سے لے لوں گی۔'' وہ حمزہ کو بری الذمہ کرنے میں اپنی طرف سے باتیں گھڑے جارہی تھی کیونکہ اس نے ربیکا کا اصل روپ دیکھ لیا تھا۔

فاخرہ رونے لگیں۔

''چچی جان۔ آپ تو نہ روئیں۔ حمزہ اتنا پریشان ہے۔ آپ کے رونے سے اور پریشان ہوگا۔'' اس نے کہا تو فاخرہ ایک دم آنسو پونچھ کر پوچھنے لگیں۔

''ہے کہاں میرا بچہ......''

''اپنے کمرے میں۔ آپ ابھی اسے نہ چھیڑیں۔ پہلے اسے نارمل ہونے دیں، پھر بات کیجیے گا۔ بیلا۔ تم حمزہ کو چائے اس کے کمرے میں دے دو۔'' اس نے کہتے ہوئے ٹرے میں سے اپنا اور فاخرہ کے لیے چائے کا مگ اٹھالیا۔

''بیٹا۔ طلاق والی بات تو بہت بری ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔'' فاخرہ حد درجہ متفکر تھیں۔

''لوگوں کو چھوڑیں چچی جان۔ لوگ تو باتیں بناتے ہی ہیں۔ آپ بس حمزہ کا خیال کریں۔ اسے ٹوٹنے نہ دیں اور میں تو کہوں گی، شکر کریں جان چھوٹ گئی اس سے۔'' وہ بہت طریقے سے فاخرہ کو رام کررہی تھی۔

☆☆☆

ربیکا بے حد تلملاتی ہوئی جلے پیر کی بلی کی مانند سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اسے حمزہ کے جانے یا طلاق کا افسوس نہیں تھا۔ غصہ اس بات کا تھا کہ جیسا وہ چاہتی تھی کہ حمزہ کو اپنے سامنے جھکا کر ٹھوکر مارے گی تو ویسا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ اسے ٹھوکر مار گیا تھا اور یہ بات اسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب وہ اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے وہ اس نہج پر سوچ بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو اسے اپنا بھرم رکھنا تھا۔ وہ یہ ہرگز ہرگز نہیں کہہ سکتی تھی کہ حمزہ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس کے حسن کا جادو چلا نہ دولت کا۔ اس کی یادداشت میں کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں تھا کہ حمزہ نے اسے پیار سے دیکھا ہو۔ اسے دیکھ کر بے اختیار ہوا ہو۔ مخصوص لمحات میں بھی اس کے لہجے میں کڑواہٹ ہی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ زبردستی اپنا آپ منوانے پر تلی ہوئی تھی۔ بہرحال اس کا زعم اسے لے ڈوبا تھا اور وہ ماتم بھی نہیں کرسکتی تھی۔

شام ڈھل گئی۔ اجالے سمٹ گئے۔ اندھیروں نے سارے میں اپنے پر پھیلا دیے لیکن اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ نہ کھانے پینے کا، نہ کوئی لائٹ آن کی۔ رات دس بجے روزانہ کی طرح ثمرہ کی کال آئی لیکن اس نے ریسیو نہیں کی۔ سیل فون مسلسل بج کر اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ اس نے پہلے آنکھیں بند کیں پھر تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھ لیا۔ اب وہ سو جانا چاہتی تھی لیکن نیند بھی روٹھ گئی تھی۔ پوری رات کروٹیں بدلتے

گزر گئی۔ صبح ذرا دیر کو آنکھ لگی تھی کہ ثمرہ آ گئیں۔ کیونکہ رات اس نے ان کی کال ریسیو نہیں کی تھی، اس لیے وہ خاصی متوحش تھیں۔

"رابی...... تم ٹھیک تو ہو......" ثمرہ نے اس کا کندھا ہلا کر کہا تو وہ ذرا سی آنکھیں کھول سکی۔ رتجگے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ ثمرہ مزید پریشان ہو گئیں۔

"رابی! کیا ہوا ہے تمہیں۔ اٹھو......"

"سونے دیں ممی۔ مت تنگ کریں۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔

"مائی گاڈ۔ تمہاری طبیعت......" ثمرہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر نبض چیک کی۔ بخار نہیں تھا، پھر کیا ہوا تھا اسے۔ ثمرہ سمجھ نہیں پائیں تو پھر اسے ہلا ڈالا۔

"رابی۔ اٹھو ناں۔"

"اٹھتی ہوں۔" اس نے کروٹ بدل کر منہ پر تکیہ رکھ لیا۔ رات بھر کی جاگی اب نیند پوری طرح غالب تھی۔

ثمرہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں پھر کمرے سے نکل کر سارے گھر کا جائزہ لیا۔ کہیں کسی انہونی کا نشان تو نہیں تھا پھر بھی انہیں لگا یہاں کچھ ہوا ہے اور وہ کس سے پوچھیں۔ کام کرنے والی ابھی نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں کب آتی تھی۔ وہ چوکیدار سے معلوم کرنے باہر نکلیں تو پھر براہ راست اس سے پوچھ لیا۔

"سنو۔ یہاں کون آیا تھا؟"

"وہ بی بی صیب۔ ربیکا بی بی کے شوہر اور ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔" چوکیدار نے بتایا تو ان کے اعصاب تن گئے۔

"ک...... کب آئے تھے؟"

"جی۔ کل شام میں۔"

"پھر...... میرا مطلب ہے کتنی دیر رہے؟" ثمرہ ویسے ہی حمزہ سے خار کھاتی تھیں۔ اس کا نام سن کر ان کے اندر ابال اٹھنے لگتا تھا۔

"بس کوئی ایک گھنٹہ......"

"اچھا۔ وہ کام والی کب آتی ہے؟"

"آنے والی ہوگی۔"

"ہمم......" وہ واپس اندر آ گئیں۔

"کیوں آیا تھا حمزہ۔ کیا کہہ گیا ہے۔" وہ جاننے کو بے چین تھیں، اس لیے انہوں نے کام والی کا انتظار نہیں کیا اور خود ہی چائے بنا کر ربیکا کے کمرے میں لے آئیں۔ ایسی بے خبری کی نیند تھی۔ ثمرہ اسے اٹھا اٹھا کر تھک گئیں۔ معاً انہیں خیال آیا، کہیں کچھ کھا کے تو نہیں سوئی اور اس خیال نے ان کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔ پرس میں سے سیل فون نکال کر سوچنے لگیں، کسے فون کریں۔ حسان صاحب نے تو انہیں ہی الزام دینا تھا اور ڈاکٹر نے اگر ان کے خیال کی تصدیق کر دی تو پھر کتنے سوال اٹھیں گے۔ وہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں کہ ان کے ہاتھ میں سیل فون بج اٹھا۔ وہ اچھل پڑیں۔ ہاتھ سے سیل فون گرتے گرتے بچا۔

"اف۔" بامشکل انہوں نے اسکرین پر نام دیکھ کر کال ریسیو کی۔

"ہیلو ممی۔" شہنیلا تھی۔

''شہنی بیٹا۔ تم جلدی سے آ جاؤ...... فوراً آ جاؤ۔ یہاں ربیکا کے بنگلے پر......'' ان کی آواز میں گھبراہٹ صاف ظاہر تھی۔

''کیا ہوا امی۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔'' شہنیلا ٹھٹکی۔

''بس تم آ جاؤ......'' انہوں نے کہہ کر لائن کاٹ دی پھر ربیکا کو ہلانے لگیں۔

☆☆☆

''حمزہ۔ اٹھ جاؤ بیٹا۔ دیکھو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔'' حمزہ کی سماعتوں میں فاخرہ کی نرم میٹھی آواز نے جیسے رس گھول دیا تھا۔ وہ ایک دم آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگا۔

''اٹھ جاؤ بیٹا۔ منہ ہاتھ دھو۔ رات سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ اتنی دیر خالی پیٹ رہنا ٹھیک نہیں۔ اٹھو شاباش۔ میں نے تمہارے لیے ناشتا بنا دیا ہے۔''

''جی اماں۔ آپ چلیں، میں آتا ہوں۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔

''جلدی آنا۔ ناشتا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔'' فاخرہ کہتے ہوئے چلی گئیں۔

''یا الٰہی۔ یہ ماجرہ کیا ہے۔'' اس نے بستر چھوڑتے ہوئے سوچا کیونکہ وہ تو اس ڈر سے فاخرہ کا سامنا نہیں کر رہا تھا کہ وہ ربیکا کے معاملے میں اسے الزام دے کر برا بھلا کہیں گی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

''خزینہ......'' برش کرتے ہوئے اسے اچانک خزینہ کا خیال آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس نے اماں سے کیا کہا تھا لیکن اب فاخرہ کے رویے سے کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

''تو یہ خزینہ کا کمال ہے۔ جیو خزینہ......'' دل تو چاہا نعرہ لگائے لیکن ابھی اسے مزید جاننا تھا، اس نعرے کی خواہش دباتے ہوئے جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکل آیا۔

فاخرہ برآمدے میں تخت پر ناشتا لگائے بیٹھی تھیں۔ وہ معصوم سی شکل بنا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کل تم وہاں سے آتے ہی سو گئے۔ تمہیں خزینہ کو بھی چھوڑنے جانا تھا۔'' فاخرہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔ پھر وہ کیسے گئی؟'' اسے واقعی افسوس ہوا۔

''میاں کو فون کیا تھا، اس نے۔ وہ آ کر لے گیا۔''

''غزنی بھائی۔ اماں! غزنی بھائی آئے تو آپ مجھے اٹھا دیتیں۔'' وہ گلٹی فیل کرنے لگا۔

''میں نے کہا تھا لیکن خزینہ نے منع کر دیا۔ بتا رہی تھی کل ربیکا نے بہت شور مچایا۔ طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ کہہ رہی تھی کورٹ کچہری کرے گی۔'' فاخرہ نے کہا تو وہ جی جی کر کے رہ گیا۔

''مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا بیٹا۔ میرا مطلب ہے کورٹ کچہری کی نوبت مت آنے دو۔ تم پہلے ہی اسے طلاق دے دو۔''

''ہیں......'' اس کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ یعنی خزینہ نے ابھی طلاق کا نہیں بتایا تھا۔ جلدی سے چائے کا گھونٹ لے کر بولا۔

''اماں آپ......''

''ہاں، میں کہہ رہی ہوں۔ جب وہ لڑکی کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتی۔ الٹا دھمکیاں بھی دیتی ہے تو پھر دفع کرو۔''

اس نے بمشکل نظریں اٹھا کر فاخرہ کو دیکھا پھر سر جھکا کر کہنے لگا۔

Waqar Azeem
www.pakistanpoint.com

"اماں۔ میری غلطی ہے۔ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا، اسی کی سزا مل رہی ہے مجھے۔"

"نا بیٹا۔ ایسا مت کہو۔ میں نے ہمیشہ تمہاری خوشیوں کی دعائیں مانگی ہیں اور اللہ ضرور تمہیں خوشیاں دکھائے گا۔ تم دل برا مت کرو۔ اور جو کچھ ہوا بھول جاؤ۔ تمہارے لیے بھی کمی نہیں ہے۔" فاخرہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے گلے لگ گیا۔

"آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکا۔"

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی خوش ہوتی ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہیں......؟"

"نہیں جھوٹ۔ چلو اب ناشتا کرو۔" فاخرہ نے اس کے سر پر چپت لگائی تو وہ ان سے الگ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ناشتا نہیں، اب کھانا کھاؤں گا۔ آپ بیلا سے کہیں اچھی سی بریانی بنا دے۔ میں جب تک ایک کام نمٹا کر آتا ہوں۔"

"ہیں......اب کیا کام یاد آ گیا۔"

"بس ہے کام۔ کھانے تک آ جاؤں گا۔" وہ کہہ کر بہت عجلت میں نکلا۔ اور تقریباً بیس منٹ بعد وہ خزینہ کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"تم نے اماں سے کیا کہا......مطلب ربیکا کے بارے میں؟"

"پتا نہیں۔ مجھے یاد نہیں۔ میں کیا کیا کہہ گئی۔" خزینہ شاید دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر پوچھنے لگی۔ "کیوں، چچی جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

"وہ اب خود مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں ربیکا کو طلاق دے دوں۔ تم نے انہیں طلاق کا نہیں بتایا؟"

"نہیں......اور خبردار تم بھی ابھی مت بتانا۔" خزینہ نے کہا تو وہ الجھ کر بولا۔

"کیوں، آخر انہیں پتا تو چلنا ہے۔"

"ہاں ظاہر ہے۔ چھپنے والی بات تو نہیں ہے لیکن بیلا کی شادی تک انہیں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ خواہ مخواہ شادی میں بدمزگی ہوگی۔"

"ہمم......" وہ سمجھ کر پوچھنے لگا۔ "اور تائی جان۔"

"میں نے کسی کو نہیں بتایا۔" خزینہ جھنجلا گئی۔ "صرف چچی ہی نہیں، کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیلا کی شادی کے بعد دیکھیں گے۔ سمجھے۔"

"اب یار۔ تمہاری بات نہیں سمجھوں گا تو کس کی سمجھوں گا۔ تم نے تو ایمان سے کمال کر دیا۔ اماں کے سامنے مجھے کوئی صفائی نہیں دینی پڑی۔ الٹا وہ مجھے تسلیاں دے رہی تھیں۔ پہلے تو میں حیران ہوا پھر سمجھ گیا یہ تمہارا کمال ہے۔ تم واقعی......"

"اچھا بس چپ ہو جاؤ۔" خزینہ نے ٹوکا تو اس نے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی پھر مسکرا کر بولا۔

"تھینک یو ویری مچ۔"

☆☆☆

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ جب ربیکا خود سے بیدار ہوئی تھی اور سامنے صوفے پر ثمرہ اور شہنیلا کو بیٹھے دیکھ کر ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"ممی آپ......آپ کب آئیں؟"

‘‘صبح سے آئی ہوئی ہوں۔ تم کیا کھا کر سوئی تھیں، جو اتنا ہلانے جلانے پر بھی نہیں اٹھیں۔’’ ثمرہ نے کہا تو اس کے ذہن کو اچانک جھٹکا لگا تھا کہ کہیں حمزہ نے تو......

‘‘رات میں نے تمہیں اتنی کالز کیں، تم نے رسیو نہیں کی۔ جب ہی صبح میں پریشان ہو کر بھاگی آئی۔ تمہیں اتنا اٹھایا۔ آخر گھبرا کر شہنی کو بلالیا۔’’ ثمرہ کی بات ختم ہوئی تو شہنیلا بول پڑی۔

‘‘تم بتاؤ۔ کیا کھا کر ایسی نشے کی نیند سو رہی تھیں۔’’

‘‘کچھ نہیں، آزادی کا نشہ تھا۔’’ وہ سمجھ گئی، حمزہ نے ابھی ادھر رابطہ نہیں کیا جب ہی انگڑائی لے کر بولی۔

‘‘مطلب......؟’’ شہنیلا ویسے ہی جھنجلائی ہوئی تھی۔ ثمرہ نے زبردستی جو اسے بٹھا رکھا تھا۔

‘‘میں نے حمزہ کو چھوڑ دیا ہے۔ ڈیوارس دے دی اسے۔’’ اس نے خود کو بہت پرسکون ظاہر کر کے بتایا۔

‘‘کیا......’’ ثمرہ اچھلیں۔ ‘‘تم نے بغیر اپنے ڈیڈی کو بتائے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا۔’’

‘‘ڈیڈی کو بتاتی تو یہ قدم کبھی نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ وہ ہر صورت مجھے اسی جہنم میں جھونکنا چاہتے ہیں۔’’ وہ سلگ کر بولی۔

‘‘پھر بھی......’’

‘‘بس ممی۔ مجھے جو کرنا تھا کرلیا۔ پھر آپ بھی تو یہی چاہتی تھیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ میں آزاد ہوگئی۔’’

‘‘تم اب نہیں۔ ہمیشہ سے آزاد ہو۔ اپنی مرضی سے شادی کی، اپنی مرضی سے چھوڑ دیا۔ کیا حاصل ہوا تمہیں؟’’ شہنیلا غصہ دبا نہیں سکی۔

‘‘حاصل سے اگر تمہارا اشارہ بچوں کی طرف ہے تو اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں جو بچہ پیدا کر کے اسے اپنے پاؤں کی زنجیر بنا لیتی۔ بہرحال یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں تمہیں یا کسی کو بھی بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔’’ وہ کہتے ہوئے بیڈ کے دوسری طرف سے اتر کر واش روم میں بند ہوگئی۔

‘‘دماغ خراب ہے اس کا۔ پاگل ہوگئی ہے بالکل۔ ممی! اسے فوراً کسی پاگل خانے میں داخل کروادیں ورنہ......’’ شہنیلا ہائپر ہو کر بول رہی تھی کہ ثمرہ نے ٹوک دیا۔

‘‘بس چپ ہو جاؤ۔ اس نے تو جو کرنا تھا کرلیا، اب بتاؤ تمہارے ڈیڈی کو پتا چلے گا تو......’’

‘‘تو کیا ہوگا۔ ڈیڈی اسے جانتے نہیں ہیں کیا۔’’

‘‘جانتے ہیں پھر بھی ان کا نزلہ مجھ پر گرے گا۔’’ ثمرہ کو آپ اپنی فکر تھی۔

‘‘کچھ نہیں ہوگا۔ چلیں، ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ جب وہ ہمیں کچھ سمجھ ہی نہیں رہی۔ آگے جو ہو خود ہی بھگتے گی۔’’ ثمرہ نے شا کی نظروں سے دیکھا لیکن شہنیلا زبردستی انہیں اٹھا کر لے گئی۔

ربیکا جب واش روم سے نکلی تو وہ دونوں جا چکی تھیں۔

☆☆☆

جہانداد کی دعائیں۔ محنت اور خدمت گزاری رنگ لائی تھی۔ ماں بہت جلد صحت یاب ہوگئیں۔ ذہنی طور پر بھی وہ تقریباً نارمل ہو چکی تھیں۔ رحیم داد کے سانحے پر وقت نے مرہم رکھ دیا تھا۔ وہ اسے یاد کر کے روتی ضرور تھیں لیکن پھر خدا کی رضا سمجھ کر صبر کر لیتیں۔ البتہ ایک بات جو جہانداد کو پریشان کر رہی تھی‘ وہ یہ کہ انہیں شہر ینہ بالکل یاد نہیں تھی۔ جبکہ جہانداد تو اسی انتظار میں تھے کہ جب ماں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ تب وہ ان کے ذریعے

شہرینہ کو پروپوز کریں گے۔ پہلے انہوں نے شہرینہ کے سامنے اشارتاً بھی ایسی کوئی بات اس لیے نہیں کی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ ماں کی خدمت کے لیے اسے اپنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ انہیں پسند تھی اور اسے دل سے اپنانا چاہتے تھے۔

ان کا خیال تھا، ٹھیک ہوتے ہی شہرینہ کو یاد کریں گی اور وہ خود بھی یہی چاہیں گی کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آجائے۔ لیکن انہیں تو وہ یاد ہی نہیں تھی۔ اور وہ زبردستی انہیں یاد دلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے بہرحال اس وقت ماں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے کہ اچانک ماں کہنے لگیں۔

"جہانیاں، میں اب تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی......" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"ہاں گھر بہت سونا سونا لگنے لگا ہے۔ دلہن آجائے گی تو رونق ہو جائے گی۔ پھر سال گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم باپ بن جاؤ گے اور میں دادی۔" ماں کی آنکھیں اس تصور سے چمکنے لگی تھیں۔ وہ نظریں چرا کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کتنی دیر بعد ماں نے انہیں مخاطب کیا تھا۔

"سنو، تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟"

"جی......" ان کا "جی" سوالیہ تھا لیکن ماں اثبات میں سمجھ کر پوچھنے لگیں۔

"کون ہے؟"

"جی......" وہ سٹپٹا گئے۔

"ہاں ہاں بتاؤ، یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے پسند کر لی۔ ورنہ مجھے دیکھنی پڑتی۔" ماں نے کہا تو وہ ٹالنے کی خاطر بولے تھے۔

"بتاؤں گا ماں......"

"ابھی بتاؤ۔ بلکہ اسی وقت مجھے اس کے گھر لے چلو۔ میں اب دیر نہیں کرنا چاہتی۔" ماں اڑ گئیں اور وہ پریشان۔

"ماں ابھی کیسے۔ ایک دو دن لیں۔"

"نہیں...... میں نے کہا ناں ابھی۔ میں چینج کرتی ہوں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ......" ماں کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔ تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔ ماں سے بحث نہیں کر سکتے تھے اور یوں اچانک انہیں لے جانا بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ انہیں تو شہرینہ یاد ہی نہیں تھی ورنہ کہہ سکتے تھے کہ ماں شہرینہ اور اس کی امی کا شکریہ ادا کرنے آئی ہیں۔ بہرحال وہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے تو انہوں نے حمیدہ بیگم کو فون کر ڈالا۔ اور ماں کے ساتھ آنے کا بتا کر کہنے لگے۔

"آنٹی، گو کہ ماں کی یادداشت میں وہ دن نہیں ہیں جب آپ ان سے ملی تھیں۔ پھر بھی چاہتا ہوں ماں کو آپ سے ضرور ملواؤں کیونکہ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ ان کی ایسی ہی باتوں سے حمیدہ بیگم مرعوب اور مغلوب ہو جایا کرتی تھیں۔ جب ہی منع نہیں کیا۔"

پھر راستے بھر وہ ماں کو سمجھاتے رہے کہ ابھی انہوں نے رشتے کی بات نہیں کرنی۔ لڑکی کو دیکھنا اور اس کی ماں سے ملنا ہے۔ پھر اگر انہیں لڑکی پسند آئی تو اگلی بار باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں گی۔

"مجھے ان باتوں کا تم سے زیادہ پتا ہے۔" آخر ماں نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

اتفاق سے اس وقت گھر میں صرف حمیدہ بیگم تھیں۔ شہرینہ بیلا کی شادی کے سلسلے میں خزینہ اور بیلا کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوئی تھی۔ اور اس بات پر حمیدہ بیگم نے شکر کیا تھا۔ ورنہ پریشان ہوتیں کہ شہرینہ کو دیکھ کر کہیں پھر نہ جہانداد کی ماں کوئی مطالبہ کر دیں۔ بہر حال ان کے آنے تک انہوں نے خود ہی چائے کے ساتھ کچھ لوازمات کا انتظامات کر لیا تھا۔ اور بہت اخلاق سے ان سے ملیں۔ البتہ ماں گھر دیکھ کر کچھ مایوس ہوئی تھیں کہ ان کے بیٹے نے کہاں لڑکی پسند کی۔

"اکیلی رہتی ہیں آپ۔" گھر کی خاموشی محسوس کر کے ماں نے پوچھا۔

"نہیں میری بیٹی ہے۔ بلکہ میری تین بیٹیاں ہیں۔ دو شادی شدہ ہیں۔"

"اچھا۔ ماشاء اللہ۔ جو بیٹی آپ کے ساتھ ہیں وہ کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے اسے بھی یہیں بلا لیں۔"

ماں کے انداز سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی پاگل پنے کی باتیں کیا کرتی تھیں۔

"وہ ابھی گھر پر نہیں ہے۔ اپنی بہن کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔" حمیدہ بیگم نے بتایا تو ماں سے زیادہ جہانداد مایوس ہوئے تھے لیکن جب دیکھا کہ ماں مزید اطمینان سے ہو کر بیٹھ گئی ہیں جیسے لڑکی دیکھ کر ہی جائیں گی تو انہیں کچھ اطمینان ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کی شاپنگ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تینوں بے حد تھک گئی تھیں۔ اس لیے باقی اگلے دن پر ڈال کر واپسی کی راہ لی۔ خزینہ نے پہلے بیلا کو اس کے گھر چھوڑا پھر شہرینہ کو چھوڑنے آئی تو گیٹ کے قریب سیاہ مرسڈیز دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کوئی ہمارے ہاں آیا ہے کیا؟"

"پتا نہیں......" شہرینہ اپنے شاپنگ بیگ سنبھالنے میں مصروف تھی۔

"اچھا چلو جلدی اترو......" خزینہ کو بھی گھر جانے کی جلدی تھی۔

"کیوں۔ تم اندر نہیں چلو گی......؟" شہرینہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ پھر کل آؤں گی۔ ابھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہنی نجمہ خالہ کو تنگ کر رہا ہوگا۔"

"کل ہنی کو بھی لے آنا۔"

"اچھا دروازہ بند کرو۔" شہرینہ نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ خزینہ گاڑی بڑھا لے گئی۔

"شاپنگ میں ہنی کا خیال نہیں آیا۔" شہرینہ بڑبڑاتے ہوئے اندر آئی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سن کر رک گئی۔

"یہ واقعی کوئی ہمارے ہاں آیا ہے۔" اس نے دل میں کہا اور مارے تجسس کے وہیں سے امی پکارتے ہوئے سیدھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بری طرح نروس ہو گئی۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی جہانداد اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔"

حمیدہ بیگم نے کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر کچھ اشارہ کرنا چاہا کہ ماں پوچھنے لگیں۔

"یہ آپ کی بیٹی ہے؟"

"جی......" حمیدہ بیگم سنبھل کر ماں کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس نے فوراً پلٹنے کی کی لیکن دروازے سے نکلتے نکلتے بھی اس نے سن لیا۔

ماں کہہ رہی تھیں۔

"میں اسی کے لیے آئی ہوں۔"

"یااللہ......" وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہوئی۔

"یہ پھر آ گئیں۔ اور میرے لیے کیوں آئی ہیں۔ میں اب ہرگز ہرگز ان کے گھر نہیں جاؤں گی چاہے کچھ ہو جائے۔"

وہ اپنے آپ بولتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم میں داخل ہوئی تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اسے رونا آ گیا۔ صدیوں کی تھکن زدہ لگ رہی تھی۔ چوٹی سے بال نکل کر گالوں میں چپک گئے تھے۔

"توبہ...... یہ حلیہ ہے مہمانوں کے سامنے جانے کا اور مجھے کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔ پاگل لگ رہی ہوں بالکل۔" وہ منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے مسلسل اپنے آپ پر جھنجلا رہی تھی کہ حمیدہ بیگم کی پکار پر نل بند کر کے واش روم سے نکلتے ہی بولی۔

"کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟"

"ایسے ہی ملنے آئے ہیں۔ جہانداد کی ماں ٹھیک ہو گئی ہیں تو وہ انہیں ملانے لایا ہے۔" حمیدہ بیگم نے بتایا تو فوراً پوچھا۔

"چلے گئے۔"

"نہیں، جانے کی بات کر رہی ہیں۔ چلو تم سلام کر لو۔ اس وقت ایسے ہی منہ اٹھائے چلی آئیں آپ۔ ذرا ڈھنگ سے چل کر سلام کرو۔"

"میں کوئی نہیں جا رہی۔ آپ جا کر خدا حافظ کہیں انہیں۔" وہ بالکل ہی نروٹھی بن گئی۔

"بدتمیزی مت کرو...... چلو۔" حمیدہ بیگم نے ڈانٹا تو وہ ان کے کڑے تیور دیکھ کر منہ پھلائے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑی اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایسے ہی منہ پھلائے سلام کیا تھا۔

"خوش رہو...... آؤ میرے پاس بیٹھو......" ماں نے دعا کے ساتھ اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو حمیدہ بیگم کے دھکیلنے پر ہی وہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟" ماں پیار سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے حیران ہو کر بے اختیار جہانداد کی طرف دیکھا لیکن وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ تب وہ روٹھے انداز میں بولی۔

"شہرینہ۔"

"ماشاءاللہ۔ بہت پیارا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح......" ماں نے اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"جی شکریہ......" اس نے کہہ کر دل میں سوچا کوئی نیا ڈرامہ......

"بہت پیاری بیٹی ہو تم، میں جلدی میں تمہارے لیے کچھ لے کر نہیں آئی۔" ماں نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بات ضرورت کی نہیں محبت کی ہے۔" ماں نے کہہ کر اپنی کلائی سے وائٹ گولڈ کا ایک کنگن اتارا اور جیسے ہی اس کی کلائی میں ڈالنا چاہا وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوری آنٹی۔ میں یہ نہیں لے سکتی۔" پھر تیزی سے جاتے ہوئے اس کی نظر جہانداد پر پڑی تھی۔

جہانداد کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

☆☆

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ)

فہمیدہ فرید خان

ڈگڈگی کا بندر

''عورت چاہے جس طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہو، غریب ہو یا امیر......اس کی زندگی کا دائرہ صرف مرد کی ذات کے گرد گھومتا ہے۔''

مجھے میری ہمسائی سیما آنٹی کی اس بات نے اچنبھے میں ڈال دیا جو اپنے مرحوم شوہر کے بنائے اس پرانی طرز کے گھر میں زندگی کے بقیہ ایام پورے کر رہی تھیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا عرصہ دراز سے اپنے بیوی بچوں سمیت اونچے طبقے کے علیحدہ گھر میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی کہی بات زیر لب دہرائی۔ پھر الجھے ہوئے لہجے میں ان سے دریافت کیا۔

''کیا مطلب سیما آنٹی، ہر عورت کی زندگی کا محور مرد کی ذات کیسے ہو سکتی ہے؟''

وہ یوں مسکرائیں جیسے انہیں مجھ سے اسی سوال کی توقع تھی اور نرمی سے گویا ہوئیں۔

''یہ ایک انمٹ حقیقت ہے بیٹا۔ عورت کی سوچیں بہر صورت کسی نہ کسی مرد کے گرد گھومتی ہیں پہلے باپ بھائی، پھر شوہر اور آخر میں بیٹا۔''

''لیکن کچھ عورتیں بالکل اکیلی بھی تو رہتی ہیں ناں جیسا کہ آپ......ان کی سوچوں کا محور کون ہوتا ہے؟''

میرا ذہن آہستہ آہستہ الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔

''میری جیسی عورتیں کیا کرتی ہیں۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائیں تو میں ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں دیکھ کر شرمندہ ہو گئی مگر وہ اپنی رو میں تھیں۔

''ان کی زندگی میں بھی یہ رشتہ انی بن کر گڑ جاتا ہے۔ کبھی شوہر کے ہمراہ گزاری خوش گوار ساعتوں کی دستک ہوتی ہے، کبھی سسرال اور میکے کے درمیان توازن کے جھنجٹ تخیل اور کبھی اولاد کی پرورش کی کٹھنائیوں کا تصور۔ جب پیارے نظروں سے دور ہو جاتے ہیں تو میری طرح کی عورتیں ایک خیالی دنیا بسا لیتی ہیں جس میں خوش گوار یادوں کا میلہ لگا رہتا ہے اور ذہن سے تلخ یادوں کو کھرچ کھرچ کر نکالنے کی کوشش میں خود کو ہلکان کرتی رہتی ہیں۔''

''لیکن آنٹی کیا واقعی ایک عورت کی زندگی مرد کے بنا نامکمل ہے؟''

''سو فیصد...... مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ چاہنے نہ چاہنے کے باوجود یہ دونوں صنف مخالف کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ ماں کے ساتھ باپ شامل نہ ہو تو اولاد کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔''

انہوں نے میرے لیے چائے میں چینی حل کرتے ہوئے گویا اپنا فلسفہ بھی اس میں گھول دیا اور سرد آہ بھر کر پیالی میری طرف بڑھا دی۔ میں ان کے ہاتھ سے پیالی تھام کر ان کی کہی بات پہ غور کرنے لگی۔ ہمارے درمیان خاموشی دیوانہ وار رقص کرنے لگی تھی۔ میں نے گھبرا کر یہ گہرا سکوت توڑنے کی کوشش کی۔

Nadar Azeem
www.pakistanpoint.com

”آنٹی زندگی کی ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے ناں کہ جو رشتہ عورت کو سب سے زیادہ پیارا ہوتا ہے، وہی اس کی ہستی زیر وزبر کر ڈالتا ہے۔“

میری آنکھوں کے سامنے اپنی نانی کا چہرہ گھوم گیا اور ان کی ہمہ وقت نم رہنے والی نم آنکھیں مجھے بے چین کرنے لگیں۔ میرے چاروں ماموں رسا تڑا گئے تھے اور انہوں نے ماں سے الگ دنیا بسالی تھی۔

”سفینہ بیٹی، یہ شاید ازل سے لوح محفوظ پر ثبت ہے اور ابد تک یہ رسم دہرائی جاتی رہے گی جس کا آغاز باپ کی شفقت ومحبت سے ہوتا ہے، یہ کہانی بھائی کی ناموس وغیرت سے پنپتی ہے اور شوہر کی اطاعت وجی حضوری کی پگڈنڈیوں سے گرتی، پھسلتی اور سنبھلتی ہوئی بالآخر بیٹے کی سرکشی پر منتج ہو جاتی ہے۔ عورت ماں، بہن، بیٹی، بیوی، بہو کے رشتوں میں بندھی رہتی ہے جبکہ مرد کو زبردستی رشتوں کی زنجیروں میں جکڑنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے عورتوں کو اپنا من مارنا پڑتا ہے۔ جب تک مردوں کی احتیاجات کا کاسہ لبریز ہوتا ہے، عورت اندر سے خالی ہو چکی ہوتی ہے۔ عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے لیے کہیں جائے امان نہیں، اس کا کوئی گھر نہیں۔“

سیما آنٹی کے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں صدیوں کے نوحے آن سمائے جنہیں انہوں نے کمال ضبط سے دل کے نہاں خانوں میں حفاظت سے سینت لیا۔

میں گنگ تھی۔ انسان کو کیسی کیسی صورت حال کا سامنا پڑتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس موقع پر کیا ردعمل دوں۔ جب تک میں کچھ کہنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کرتی، لیکن ان کی اگلی بات نے صحیح معنوں میں میرے رونگٹے کھڑے کر کے رکھ دیے۔

”سفینہ بیٹا عورت کی زندگی ڈگڈگی پر ناچتے بندر کی مانند ہوتی ہے۔ وہ ساری زندگی باپ، بھائی، شوہر اور پھر اولاد کی ڈگڈگی پر ناچتی رہتی ہے لیکن اس کا صلہ کچھ نہیں۔“

میں ان کی بات کے زیر اثر کئی ثانیے گنگ بیٹھی رہی۔ گھر پہنچ کر بھی یہ بات میرے دل ودماغ سے کافی عرصہ چپکی رہی۔ اس کے بعد سیما آنٹی سے کبھی تفصیل سے گفتگو نہ ہو سکی اور گزرتے وقت کے

ساتھ ان کی یاد معدوم ہوتی چلی گئی۔

میری شادی ہوگئی تو گھر داری اور پھر بچوں کے جھمیلوں نے مجھے اپنی سدھ بدھ بھی بھلا دی۔ چند سال بعد سیما آنٹی کی وفات کا سن کر پرانے محلے میں گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی یاد قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔

☆☆☆

شوہر کے گرد چکور کی طرح چکراتے، بچوں کی چھوٹی بڑی فرمائشیں پوری کرتے، مجھے علم ہی نہ ہوا کب بچوں نے جوانی کی دہلیز عبور کر لی اور میں بڑھاپے کی سرحد پر آن کھڑی ہوئی۔ اکلوتی بیٹی کو وداع کیا اور پھر وقفے وقفے سے بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔ سب پنچھیوں نے اپنے الگ الگ گھونسلے بنا لیے تھے۔ میں ان کے گھروں میں گھومتے گھامتے آج کل چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

شوہر کی وفات کے بعد میری زندگی پر جمود سا طاری ہو چکا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میں محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی تھی۔ اولاد کی زندگیوں میں مداخلت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کے باوجود کبھی کبھی مجبور ہو کر انسان کو بولنا پڑ جاتا ہے مگر مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایسی بے توقیر تو میں شوہر کی وفات کے بعد بھی نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج برسوں بعد۔

عدنان جو اپنی اولاد میں مجھے سب سے پیارا تھا، اسی نے مجھے آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔ میرا جرم اس سے میری بے تحاشا محبت تھی، جس کی پاداش میں مجھے اس کے منہ سے زہریلے الفاظ سننا پڑے تھے۔ میں کس کو بتاتی کہ میرے عزیز ترین رشتے نے مجھے ڈس لیا تھا۔ اس کے نوکیلے الفاظ کی برچھیاں مجھے نیلو نیل کر رہی تھیں۔

آہ...... عدنان نے مجھے کیا کہا، ذرا یاد کرنے دیں لیکن نہیں مجھے اس کے الفاظ بھولے ہی نہیں تو یاد کرنے کا کیا سوال بھلا۔ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتی ہرگز بھی نہیں کیونکہ یہ الفاظ نہیں، اس کے لہجے کی کاٹ تھی جس نے مجھے لیرو لیر کر دیا تھا۔

☆☆☆

''اماں آپ آج شام کچھ گھنٹوں کے لیے اپنے کمرے میں ہی رہیے گا۔''

''کیوں بچے؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''میرے دفتر سے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ آپ ان کے سامنے نہ آئیں تو بہتر ہے۔ پچھلی بار بھی مجھے آپ کی وجہ سے سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، آپ کی ماں کسی گاؤں کی گنوار خاتون لگتی ہیں۔ اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی ساٹھ گز کا دوپٹا اوڑھ کر گھوم رہی تھیں اور اذان کی آواز سن کر آپ نے جو میوزک بند کروایا تھا ناں، اس پر انہوں نے مجھے دقیانوس تک کہہ دیا۔ آپ کی اوٹ پٹانگ حرکتوں کے باعث مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔''

عدنان جبڑے بھینچ بھینچ کر بول رہا تھا اور میری اعلا تعلیم یافتہ بہو جازیہ تفخر و انبساط سے گردن اٹھائے کھڑی تھی۔ میں حیرت سے منہ کھولے اپنے بیٹے کو تکنے لگی جس نے جدید تہذیب کے نام پر اپنا چولا بدل لیا تھا۔

''مگر دانی......! اپنے مذہب کا احترام کہاں کی دقیانوسیت ہے۔''

''اوہ امی! خدا کے لیے۔ ابو نے ہمیں زمانے کے ساتھ چلنے کا درس دیا مگر آپ ساری زندگی یہ ہنر نہ سیکھ پائیں اور ترقی کی دوڑ میں آپ پیچھے، کہیں بہت دور رہ گئی ہیں۔ خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی۔ مگر میں دوبارہ اپنے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا اس لیے برائے مہربانی آپ اپنے کمرے میں رہیے گا۔''

اس نے اپنے تئیں زچ ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''غلطی ہوگئی۔ میں آئندہ کچھ نہیں کہوں گی۔''

میں نے اس غلطی پر معذرت کی جو دراصل غلطی تھی ہی نہیں۔ میں رنج سے کپکپانے لگی۔ میری اولاد اپنے ہاتھوں اپنے لیے جہنم کا گڑھا کھود رہی تھی

اور میں اتنی بے بس تھی کہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اصولی طور پر اب عدنان کو چلے جانا چاہیے تھا کہ وہ ٹھہرا مصروف بندہ اور آج اس نے مجھے توقع سے زیادہ وقت دے دیا تھا۔ یقیناً اسے کچھ اور بھی کہنا تھا۔ میں اندھی نہیں تھی جو یہ نہ دیکھ پاتی کہ جازیہ کی نظر اسے قصہ پاک کرنے کی ہلاشیری دے رہی تھی۔ شاید اس کی بھڑاس پوری طرح نہیں نکلی تھی۔

"خیر، آپ کو معذرت کی ضرورت نہیں۔ بس اپنے فرسودہ طور طریقوں سمیت اس کمرے میں رہا کریں۔ آپ کو باہر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی ضرورت کی ہر چیز آپ کو یہیں مل جایا کرے گی، میں نے جازیہ کو بتا دیا ہے۔ مزید جو چاہیے ہو، وہ ملازمہ کے ذریعے بتا دیجیے گا۔"

عدنان مجھ سے نظریں چرا کر حکم صادر کر کے کب کا جا چکا تھا۔

یہ جانے کون سی تہذیب تھی جس نے مقدس رشتوں کا احترام بھی بھلا دیا تھا۔ میں نے برستی آنکھوں سے جازیہ سے رحم کی بھیک مانگی۔

"بہو۔ دانی کو سمجھاؤ میں اس کو دیکھنے سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔ میرے کمرے میں وہ کب آتا ہے۔ اس طرح وہ سب راہیں مسدود کر رہا ہے۔"

جازیہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے شیر بکری کو دیکھتا ہے اور نخوت سے گویا ہوئی۔

"آنٹی۔ آپ بھی تو حد کر دیتی ہیں۔ دانی کو آپ پر بہت خار چڑھی تھی، یہ تو میں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ورنہ وہ تو آپ کو گھر سے نکالنے کے درپے تھے۔ خیر آپ کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ آپ کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ رکھ دی ہے۔ ہمارے دفتر جانے کے بعد آپ کے باہر جانے پر بھی پابندی نہیں لیکن مہمانوں کے سامنے آنے کی غلطی مت کیجیے گا۔ ویسے بھی آپ کی قبر میں ٹانگیں ہیں، بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کریں۔" وہ ٹک ٹک کرتی کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی سیما آنٹی میری سکھی بن کر میرا دکھ بانٹنے یوں آ موجود ہوئیں گویا ازل سے میرے ساتھ رہتی آئی ہوں۔ ان کے الفاظ میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دیے جا رہے تھے اور بند کواڑ کھلتے جا رہے تھے۔

آہ! کیسا کڑوا سچ کہا تھا سیما آنٹی نے......

"یاد رکھنا سفینہ، جس اولاد کی محبت میں عورت مرغ بسمل کی طرح تڑپتے تڑپتے فنا ہو جاتی ہے، وہی اس کو دامن کی گرد کی طرح جھاڑ کر قدموں تلے روند کر انجانی راہوں پر نکل جاتی ہے۔"

"سیما آنٹی۔ آپ کی آواز کی بازگشت مجھے پاگل کر دے گی۔" میں نے دکھتا سر تھام لیا تھا۔

"جس رشتے سے سب سے زیادہ محبت کرو، آگے چل کر وہی عزت دو کوڑی کی کر دیتا ہے۔ آپ کا مان و بھروسا خاک میں ملا دیتا ہے۔ سب سے زہریلا ناگ اولاد کی محبت کا ہوتا ہے جس کے زہر کا کوئی تریاق نہیں۔"

میں کسی گہرے پاتال میں گرتی چلی جا رہی تھی، بس گرتی ہی چلی جا رہی تھی اور خود کو بچانے کے لیے خود اپنی ڈھال بن رہی تھی۔

"ارے کوئی ہے جو مجھے بچا لے...... خدارا کوئی تو مجھے بچا لے۔"

میں بند ہونٹوں سے مدد کے لیے چلا رہی تھی مگر مجھے اچھی طرح علم تھا کہ مجھے بچانے کوئی نہیں آئے گا کیونکہ میں وہ عضو معطل تھی جس کو بے کار ہو جانے پر کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

میں ڈگڈگی پر ناچنے والا وہ بندر تھی جس کا تماشا ختم ہو چکا تھا اور سارے تماش بین رخصت ہو چکے تھے۔

میرا دریدہ بدن زمیں بوس ہو رہا تھا، میرے لرزیدہ وجود کی عمارت ڈھے چکی تھی اور میرے اردگرد سیما آنٹی کے الفاظ کی بازگشت بڑھتی چلی جا رہی تھی......

ڈگڈگی کا بندر......

ڈگڈگی کا بندر......

☆☆

مُسکان احزم

تیری راہ ہے میری منزل

''محبوب جب رقص کرتا ہے تو پوری کائنات اس کے گرد گھومتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

وہاں بالکل بالشوئی تھیٹر کے عین سامنے، آسمان تک پانی اچھالتے فوارے کے عقب میں ایک ''وائٹ سوان'' دائرے میں گھوم رہی تھی۔ روسی دھنوں پر اس کا رقص وہاں کھڑے ہر شخص کو تالیاں بجا بجا کر داد دینے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ جب ذرا سا گھوم کر رقص کی چھلانگ لگاتی تو ماسکو کے ہر باسی کو اپنی دھڑکن رکتی محسوس ہوتی۔ وہ چلتی تو پورے ماسکو کا دل دھڑک اٹھتا۔

وہ یہ منظر بڑے انہماک سے سڑک کے عین درمیان میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ٹریفک سگنل سرخ تھا یعنی وہ سڑک پار کر کے اس کنارے تک جا سکتا تھا جہاں وہ وائٹ سوان رقص میں مصروف تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی جہاں سڑک پر ٹریفک رکی تھی وہیں روڈ کراس کرتے ہوئے اس کے قدم بھی تھم گئے تھے۔

جیسے ہی وائٹ سوان کا رقص ختم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بالشوئی تھیٹر کے باہر کا منظر تالیوں کے شور سے گونج اٹھا تھا۔

وائٹ سوان گھٹنوں تک آتی اپنی سفید فراک دونوں کناروں سے تھامے ذرا سا جھکتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ جب کہ وہ اس منظر میں اتنا مگن ہو چکا تھا کہ سرخ بتی کب سبز میں بدلی اسے اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

گاڑیوں کے بجتے ہارن چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ بھائی صاحب اب ہوش کی دنیا میں واپس آجائیں اور تھوڑی سی زحمت کرتے ہوئے ہمیں رستہ دے دیں۔ تھوڑا سا جھجکتے ہوئے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب آگے جائے یا پیچھے مجبوراً ٹریفک کے شدید بہاؤ کی وجہ سے اسے الٹے قدم واپس سڑک کے دوسرے کنارے جانا پڑا۔

وہ تو اس سفید ہنس کا چہرہ بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ اسے اب ماسکو کی ٹریفک پہ غصہ آنے لگا جو اتنی بے صبری تھی کہ دو منٹ مزید انتظار بھی نہ کر سکی کہ وہ سڑک ہی پار کر لیتا اور اس وائٹ سوان کو ایک نظر قریب سے دیکھ لیتا۔

جب تک سبز بتی دوبارہ سرخ بتی میں تبدیل ہوئی تب تک وائٹ سوان وہاں سے جا چکی تھی۔

''نہیں۔ اب بھی نہیں رکنا تھا۔'' سب سے آگے والی گاڑی کے ڈرائیور کو غصے میں کہتا ہوا وہ سڑک کراس کر گیا جب کہ ڈرائیور اس کی ذہنی حالت پر حیران ہوتے ہوئے سبز بتی کے جلنے کا انتظار کرنے لگا۔

ماسکو میں وقت آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ ایک لمحہ وہیں کہیں ٹھہر گیا تھا۔ وہاں، بالکل بالشوئی تھیٹر کے عین سامنے آسمان تک پانی اچھالتے فوارے کے عقب میں رقص کرتی اس وائٹ سوان کی کسی ادا میں۔

☆☆☆

وہ مشہور زمانہ امریکی مصور اور سیاح تھا۔

وہ دنیا گھومتا اور اس کائنات کے دلکش مناظر اپنی آنکھوں میں قید کر لیتا۔ پھر وہ تنہائی میں بیٹھتا اور ان مناظر کو اپنی سوچوں سے سفید کینوس پر منتقل کر دیتا۔ رنگ بکھرتے جاتے اور تصویر مکمل ہوتی

ناولٹ

جاتی۔ پھر ایک وقت آتا کہ کینوس پر ہو بہو وہی نقش ابھر آتا جو اس کی بھوری آنکھوں نے کہیں کسی ملک میں کسی جگہ پر دیکھا ہوتا۔ بعض اوقات وہ براہ راست تصویر کو کینوس پر کھینچ لیتا تھا۔ کوئی جگہ اچھی لگی تو وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا اسکیچ کاغذ پر کھینچ لیا۔

وہ ''ریان'' تھا۔ جسے امریکہ سے لے کر اس دنیا کے آخری جزیرے تک سب لوگ جانتے تھے۔ فن اور آرٹ میں دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کے مداح تھے۔

اس وقت بھی اس کے سامنے اسٹینڈ میں کینوس لگا ہوا تھا جس پر ایک منظر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ رنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا منظر کینوس پر اتار رہا تھا کہ پورا ماسکو رنگوں میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ وہ مگن تھا اس ایک منظر کو تصویر کا روپ دینے میں۔

کینوس پر دیکھا جاسکتا تھا بالشوئی تھیٹر کے سامنے والا وہ منظر جس میں حزن و ملال میں ڈوبی وہ وائٹ سوان رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں بنا پایا تھا۔

''کاش میں اس کا چہرہ دیکھ پاتا۔'' وہ افسردہ نظر آیا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ تصویر بنانے کے بعد خوش نہیں ہوا تھا۔ تصویر مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کے لیے ابھی بھی ادھوری تھی۔

وہ تصویر کے اس ادھورے پن سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس ادھوری تصویر کو چھوڑ کر وہ اپنے اردگرد کا منظر دیکھنے لگا۔ اسے اس اسٹریٹ میں ہر رنگ اور نسل کے لوگ گزرتے نظر آ رہے تھے۔ سب جلدی میں تھے کوئی بھی ماسکو میں جگہ جگہ رک کر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ سب سیاحوں کو ایک یا دو دن میں ماسکو کا چپا چپا دیکھنا تھا۔ اگر وہ اس چھوٹی سی گلی میں کہیں رکتے تو کیا ان سے بڑا کوئی بے وقوف ہوتا اس دنیا میں؟

''نہیں نا۔''

لیکن ریان اس وقت دنیا کے سب سے بڑے بے وقوف سیاحوں میں اپنا نام لکھوا چکا تھا جو پچھلے دو گھنٹے سے ایک کافی شاپ کے باہر بیٹھا تھا اور کینوس پر رقص کرتی اس لڑکی کو اتارنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا چہرہ تک وہ دیکھ نہیں پایا تھا۔

ماسکو میں عشق کی کہانی شروع ہو چکی تھی۔ ایک امریکی مصور کی ایک روسی رقاصہ سے......

بھوری آنکھوں والے سیاح کی ایک وائٹ سوان سے کہ کہانیاں اپنا آغاز یونہی تو کیا کرتی ہیں۔

☆☆☆

برف گر رہی تھی وہاں اور گر کر ارباط اسٹریٹ کو اپنے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے آسمان سے سفید تاروں کی مانند زمین پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ارباط اسٹریٹ ان سفید گالوں کی وجہ سے سفید ہو گئی تھی۔ اب وہ سرخ، سنہری، نیلی نہیں رہی تھی وہ اب بس سفید رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ اس نے محبوب کا رنگ لے لیا تھا۔ محبوب سفید تھا۔ محبوب برف تھی۔ جو آسمان سے گر رہی تھی وہاں ارباط اسٹریٹ کے پھسلتے رستے پر......

وہ اس موسم کی دیوانی تھی۔ نہیں! وہ برف کی دیوانی تھی۔ وہ روس کی جان لیوا برف باری کی سب سے بڑی مداح تھی۔ وہ برف باری کے دنوں میں بلاوجہ ماسکو کی گلیاں گھومتی رہتی تھی۔ وہ اس نرم سی برف کو اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر محسوس کرتے ہوئے دنیا میں سب سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔

وہ ''زوناشے'' تھی۔

ماسکو کی ٹورسٹ گائیڈ۔

وہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک دن صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کی عادی تھی۔

تو آج کا دن بھی صرف اس کا دن تھا۔ وہ دن زوناشے کی طرف سے زوناشے کے نام تھا۔ وہ اسکن کلر کا اوورکوٹ پہنے ارباط اسٹریٹ کے سفیدی میں ڈوبے حسین مناظر کو اپنی زندگی کی ڈائری میں رقم کر رہی تھی۔ یہ خوب صورت سا کوٹ اس کی ماما نے

چھ سات سال پہلے اسے سالگرہ کے تحفے میں دیا تھا۔ یہ کوٹ آج بھی اسے فٹ آتا تھا۔ یہ تحفہ اسے ہمیشہ اس کی ماں کی یاد دلاتا تھا کیونکہ یہ آخری تحفہ تھا جو اس کی ماں نے اسے دیا تھا۔ اس کی ماں پھر ماسکو سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی بلکہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ وہ اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے اداس ہوگئی تھی۔ ماسکو کی زوناشے اپنے پسندیدہ دن میں بھی اداس نظر آنے لگی تھی۔ روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے بھی اب افسردہ نظر آنے لگے تھے۔ مگر یہ ماسکو تھا جہاں کوئی بھی زیادہ دیر تک اداس نہیں رہتا تھا۔ یہاں کوئی نہ کوئی طوفان کسی نہ کسی کا ہمیشہ منتظر رہتا تھا۔ جیسے ابھی اس کے سامنے ایک طوفان نمودار ہونے والا تھا۔

وہ جیسے ہی ارباط اسٹریٹ کا کونا مڑی، طوفان اس سے ٹکرا گیا۔ طوفان کے ہاتھ میں پکڑا کافی کا گلاس اب زوناشے کے اوورکوٹ پر منتقل ہو چکا تھا۔ زوناشے اپنے کوٹ کی یہ حالت دیکھ کر رونے والی ہوگئی تھی۔ اس نے آج تک اس پہ ایک چھوٹا سا داغ تک نہیں لگنے دیا تھا۔ مگر سامنے کھڑے طوفان نے کافی کا پورا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ مقابل میں کھڑا وہ طوفان معذرت کے لیے کچھ بولتا زوناشے نے ہاتھ کا مکا ہوا میں لہرایا اور مقابل کو دفاع کا موقع دیئے۔ بنا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ درد کی شدت سے طوفان بلبلا اٹھا تھا۔ اور یہ آیا دوسرا مکا مگر طوفان اب سنبھل گیا تھا اس نے تھوڑی سی جرات کر کے زوناشے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یوں طوفان اپنے سے بڑے طوفان کے دوسرے وار سے بچ گیا تھا۔

طوفان ”ریان“ تھا جو دوسرے ہاتھ سے اپنا پیارا سا گال سہلا رہا تھا۔

”معذرت چاہتا ہوں مس! میں دیکھ نہیں پایا تھا۔“ اس کے مزید بگڑتے تیور دیکھ کر اس نے اس کا ہاتھ نرمی سے چھوڑ دیا۔

”نظر آتا بھی کیسے۔ یہ اتنا بڑا چشمہ لگائے پھر رہے ہو اندھے بندر۔“ اس نے برق سی تیزی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر ریان کے چہرے سے چشمہ اتار لیا جو وہ لوگوں سے بچنے کے لیے پہنا کرتا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے اور اسے آٹوگراف اور تصویریں بنانے کے لیے تنگ نہ کر سکے۔

”ایک منٹ! یہ اندھا بندر کسے بولا آپ نے؟“

بھئی سب کچھ ٹھیک تھا۔ اتنے مشہور آرٹسٹ کے لیے ایک عام سے لڑکی سے مکا کھانا بھی ٹھیک تھا کون سا کسی نے اسے پہچانا تھا۔ اپنا چشمہ اتنی بدتمیزی سے اس لڑکی کے ہاتھ میں جانا بھی ٹھیک تھا۔ مگر اتنے ہینڈسم آرٹسٹ کے لیے ”اندھے بندر“ کا لفظ نہیں ٹھیک تھا۔ امریکی ایڈورٹائزمنٹ کمپنیز کے آدھے سے زیادہ اشتہارات میں یہ طوفان مطلب ریان نظر آتا تھا۔ مگر یہاں تو ماشاء اللہ اسے ”اندھے بندر“ جیسے القابات سے نوازا جا رہا تھا۔

”تمہیں بولا ہے...... کیا کر لو گے اب تم؟“ وہ تو اس پر چڑھ دوڑی تھی۔

”دیکھیں مس! اب آپ بدتمیزی کر رہی ہیں۔“

”اچھی طرح سے جانتی ہوں میں تمہارے جیسے تمیزدار لڑکوں کو۔ پہلے بہانے سے لڑکیوں سے ٹکراتے ہیں اور پھر ایسے شریف اور معصوم بن جاتے ہیں جیسے ان کے جیسا مہذب انسان پوری دنیا میں نہیں ہے۔ یہ طریقہ اب پرانا ہو چکا ہے۔“ وہ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی اس کے کانوں کے قریب چیخ رہی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹاتا تو وہ بھی ایک قدم آگے بڑھا دیتی۔ درمیانی فاصلہ بڑھا نہیں تھا۔

”اور میں بھی جانتا ہوں تمہارے جیسی لڑکیوں کو جہاں ہینڈسم اور شریف لڑکا نظر آئے اس سے بات کا سلسلہ بڑھانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور یہ طریقہ بھی اب پرانا ہو چکا ہے۔“ وہ بھی اب آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ آخر

وہ بھی ریان تھا اتنی چھوٹی سی لڑکی سے لڑائی میں ہارنے والا نہیں تھا۔

”ہاہاہا......“ وہ گردن پیچھے گرا کر ہنس دی۔

طوفان ہکا بکا سا اسے دیکھنے لگا کہ اب اسے کون سا دورہ پڑ گیا ہے۔

”ہینڈسم؟ اور تم؟“ وہ پھر ہنس دی۔

مگر وہ اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اتنی آسانی سے تو وہ آج تک کسی کو میسر نہیں آیا تھا باتیں کرنے کے لیے۔ بلکہ یہاں تو اسے باتیں سنائی جا رہی تھیں۔

”مجھے نہیں پتا کہ تم نے اس چھوٹی سی بات پر اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کیا ہے؟ اگر مسئلہ اس کوٹ کے ساتھ ہے تو میں تمہیں نیا لے دیتا ہوں بالکل اس کے جیسا۔“ وہ اس معاملے کو اب بس ختم کر دینا چاہتا تھا۔

وہ اس کی بات پر ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی۔ یہ منظر آسمان سے گرتے سفید تاروں نے بھی دیکھا تھا۔

”کیا اس پر میری ماں کا لمس ہو گا؟“ وہ اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک کر بولی تھی تاکہ وہاں سے جواب ڈھونڈ سکے کہ کیا واقعی اس کوٹ میں میری ماں کی خوشبو ہو گی؟ میں جب بھی اسے پہنا کروں گی تو کیا واقعی مجھے اپنی ماں یاد آیا کرے گی؟

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ گہری چپ نے اس کے لبوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

وہ کچھ دیر نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی اور پھر استہزائیہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ دنیا کی ساری دولت مل کر بھی میری ماں کا لمس واپس نہیں لا سکتی تو تم کیا چیز ہو۔

جبکہ وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی ہل نہیں پایا تھا۔ اس کی ساری سکت تو وہ لڑکی اپنے ساتھ لے گئی تھی جو اب سے کچھ دیر پہلے اسے مکے مار رہی تھی۔ اسے عجیب عجیب سے القابات سے نواز رہی تھی۔ مگر اب وہ منظر سے ہٹ گئی تھی۔

بھوری آنکھوں میں کچھ ابھرا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ماں کے لفظ پر اپنی ماں کا عکس ابھرا تھا جو نجانے اسے کب کا چھوڑ کر کہیں جا چکی تھی اور اس عکس نے اس کی بھوری آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا۔

اب سے پہلے وہاں ارباط اسٹریٹ میں نوک جھوک تھی مگر اب وہاں صرف خاموشی تھی۔

گہری۔۔۔۔سرد خاموشی۔۔۔۔بالکل روس کی برف کی طرح۔۔۔۔۔

☆☆☆

ماسکو میں دھوپ اپنا راج قائم کر چکی تھی۔ پورا ماسکو سنہری رنگ میں ڈوب کر کسی بادشاہ کے تاج کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ سرخ چوک میں آ چکا تھا۔

سیٹی پر ایک شوخ سی دھن بجاتے ہوئے وہ سرخ چوک کا سرسری سا جائزہ لے رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبد دھوپ میں نہائے نظر آ رہے تھے۔ اطراف میں کریملن، لینن کا مقبرہ اور عجائب گھر کی عمارتیں سرخ چوک کی شان کو مزید بڑھا رہی تھیں۔

وہ اپنے کیمرے میں وہاں کے ایک ایک منظر کو اپنی یادوں کی ڈائری کے لیے قید کر رہا تھا۔

کلیسائے سینٹ باسل کی مختلف زاویوں سے تصاویر لیتے ہوئے اس کی نگاہیں ایک منظر سے ٹکرائیں تو وہ باقی سب منظر بھلا بیٹھا۔ وہاں ایک بڑھیا روسی لباس میں اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ سرخ چوک کی پتھریلی زمین پر گرے سکے اٹھا رہی تھی۔ وہ ہر بات سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس کی دولت تو زمین پر تھی جو وہاں سیاح اور مقامی باشندے تصاویر بنانے کے بعد خوشی سے اچھال رہے تھے۔ سکے آسمان کی طرف اچھلتے لیکن اگلے ہی لمحے وہ واپس اپنی جگہ پر آ جاتے۔ وہ کیمرہ ہاتھ میں تھامے بڑھیا کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں پہ ایک دائرہ بنا تھا اور اسی دائرے میں لوگ کھڑے ہو کر اپنی تصاویر بنا رہے تھے۔

"معاف کیجیے گا۔ کیا میں اس دائرے کی اہمیت جان سکتا ہوں؟" وہ انگلش میں مخاطب ہوا کیونکہ بڑھیا شکل سے امریکی لگ رہی تھی۔

"اسے زیرو کلومیٹر کہتے ہیں اور یہاں سے روس کے ہر شہر تک فاصلے ماپے جاتے ہیں۔" بڑھیا سکے اٹھانے میں مصروف رہی۔

وہ دائرے میں کھڑا ہو گیا اور اگلے ہی لمحے شرارت اس کے لبوں پر آ کر براجمان ہو گئی۔

"کیا یہاں سے محبت تک کا فاصلہ بھی ماپا جا سکتا ہے؟" سیاہ چشمے کے پیچھے چھپی آنکھوں میں شوخی رقص کر رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ اب بھی جھکی رہی۔

"تو پھر یہاں سے میری محبت کتنی دور ہے؟"

اب کی بار بڑھیا اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے سیدھی ہوئی کہ دیکھے تو سہی یہ کون ہے جسے یہاں کھڑے ہو کر تصویر بنوانے سے زیادہ بہکی بہکی باتیں کرنے میں دلچسپی تھی۔

"دائیں ہاتھ بس دس قدم۔" شرارت کا جواب شرارت سے دیا گیا۔

وہ اپنا ہیٹ اتار کر جھکا۔ یہ اس کے شکریہ کہنے کا انداز تھا۔ چند سکے بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ کر وہ دائیں ہاتھ ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دائیں ہاتھ دس قدم پر کون سی چیز اس کی منتظر تھی۔ اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اٹھتے قدموں کے ساتھ گنتی شروع کی۔

ایک...... دو...... تین...... دل کی دھڑکن روسی دھنوں پر تھرکنے لگی تھی۔

چار...... پانچ...... چھ...... سنہری دھوپ مزید سنہری ہو گئی تھی۔ سات...... آٹھ...... کلیسائے سینٹ باسل کے اندر عہد و پیماں کے گیت گائے جانے لگے۔ نو...... اور یہ رہا...... دس......

دسویں قدم پر اسے اپنے جوگرز سے چار پانچ انچ کے فاصلے پر سرخ ہیلز نظر آئیں۔ یعنی اس کی محبت سرخ ہیلز پہنے اس کے اتنے قریب کھڑی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دس قدم پیچھے جا گرا جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ اسے چھو کر گزر گیا ہو۔ وہاں کرنٹ سے بھی خطرناک چیز کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہزار دو ہزار وولٹ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

وہ سرخ ہیلز سے ٹھک ٹھک کرتی اس کے سر پر پہنچ گئی۔ جب کہ وہ زمین پر گرا اپنے برے وقت کو کوسنے لگا۔

وہ زمین سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ اٹھ کر اس سے ایک گھونسا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ ابھی تو پہلے گھونسے کا درد نہیں کم ہوا تھا وہ دوسرا کیسے سہہ سکتا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ وہ اسے تھام کر کھڑا ہو سکے۔

جبکہ حیرانی کی ساری عمارتیں ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئیں اور ایک ایک کر کے ریان کے سر پر ٹوٹنے لگیں۔ اس کا ہاتھ نظر انداز کرتے وہ خود ہی کھڑا ہو گیا کیونکہ اس کا ہاتھ تھامنے کا مطلب تھا کسی نئی مصیبت کو تھامنا۔

"تم واقعی اندھے ہو یا پھر جان بوجھ کر ایسی بے ہودہ حرکتیں کرتے ہو؟"

وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس سے گویا ہوئی کیونکہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر چینی سیاح کھڑے تھے جو اس کے کلائنٹس تھے۔

وہ انہیں یہاں سرخ چوک کی تاریخ کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔ اگر اب وہ اس اندھے بندر سے بدتمیزی سے بات کرتی تو اس کا امپریشن اس کے کلائنٹس پر بہت برا پڑتا اور ماسکو کی زوناشے اب اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی۔

جبکہ ریان حیرت سے پلکیں جھپکائے اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھتا رہا جو چہرے پر دنیا کی سب سے خوب صورت مسکراہٹ سجائے منہ سے زہر اگل رہی تھی۔

"لڑکے میں تمہیں بتا رہی ہوں اگر تم نے دوبارہ کوئی ایسی حرکت کی تو ماسکو میں تمہاری لاش بھی

نہیں ملے گی۔'' اس کی مسلسل خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ اسے آخری بار سمجھا رہی تھی۔

اب کی بار دنیا کی سب سے خوب صورت مسکراہٹ ریان کے چہرے پر نظر آنے لگی تھی۔

یہ مسکراہٹ گہری ہوئی اور پھر ایک قہقہے میں بدل گئی۔ اس لمحے روسی دھنوں کی اہمیت کم ہوگئی تھی۔

وہ ہنسا اور پھر ہنستا ہی گیا۔

اور اب حیران ہونے کی باری زوناشے کی تھی۔

''نہایت فضول قسم کے انسان ہو۔'' دانت پیستے ہوئے وہ اپنا غصہ پی گئی۔

مگر مقابل پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

''ارے دیکھو تو سہی ساڑھے چار فٹ کی لڑکی چھ فٹ کے لڑکے کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔'' وہ خود سے ہم کلام ہونے کے انداز میں بولا۔

زوناشے اس کی آواز سن چکی تھی۔ وہ اس کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی لیکن اسے اس وقت اپنے کلائنٹس زیادہ عزیز تھے۔ اس لیے وہ اسے بنا کچھ کہے اپنا پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی جس کا صاف مطلب تھا کہ تم کبھی دوبارہ ملنا پھر بتاؤں گی تمہیں کہ یہ ساڑھے چار فٹ کی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے۔ جبکہ وہ وہاں کچھ دیر ہنستا رہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے غصے میں مڑ کر جاتی ہوئی زوناشے کو ہمیشہ کے لیے اپنے کیمرے میں قید کرلیا۔

''یہ ماسکو کی سب سے خطرناک یاد ہوگی۔''

کیمرہ ہاتھ میں لیے وہ واپس کلیسیائے سینٹ باسل کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

دن بھر بلاوجہ ادھر ادھر گھومتے وہ خلاف معمول تھک گیا تھا۔ جو تھک جائے وہ سیاح نہیں ہوتا۔ سیاح تو ان سیاروں کی مانند ہوتے ہیں جو رک جائیں تو ٹوٹ کر گر جاتے ہیں۔ کائنات کے نظام سے باہر نکل جاتے ہیں۔ تو اگر وہ تھک جاتا تو کیا وہ ایک سیاح رہتا؟ لیکن وہ تھک گیا تھا۔ اسے ایک ٹور گائیڈ کی اشد ضرورت تھی جو اسے ماسکو گھما سکے ورنہ وہ روز یونہی بلاوجہ گھومتے ہوئے تھکن سے ضرور مرجاتا۔ وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی ماسکو کے بارے میں معلومات کے بغیر ماسکو میں گھوم سکتا تھا۔ ورنہ وہی حال ہوتا جو آج اس کے ساتھ ہوا تھا۔

اسے جھرجھری سی آئی اور وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

''اف......! لڑکی ہے یا کوئی چڑیل۔ ایسی خطرناک بلائیں تو کبھی میں نے کسی مووی میں بھی نہیں دیکھیں۔'' خودکلامی کرتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر کروٹ بدلی۔ ''اور پتا نہیں کیسے روز میرے سامنے آجاتی ہے۔''

وہ ابھی تک حیران تھا کیونکہ وہ واحد انسان تھی جو اسے ماسکو میں دو دفعہ مل چکی تھی یا پھر وہ واحد انسان تھی جس کا چہرہ اسے ابھی تک یاد تھا۔

''پتا نہیں گھر سے تیکھی مرچیں کھا کر آتی ہے روز۔'' کروٹ ایک بار پھر بدل گئی۔ ''اب مجھے کیا ہوگیا ہے میں کیوں کروٹ پہ کروٹ بدل رہا ہوں۔ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی تیکھی مرچیں۔'' اس کے خیالات کو اس نے کان سے پکڑ کر اپنے ذہن سے نکالا اور ٹیبل لیمپ بجھا کر سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے کی وجہ موبائل پر بجنے والی میسج ٹون تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے موبائل کی اسکرین کو دیکھا تو وہاں اس کی سیکرٹری جولیا کا پیغام تھا۔

چہرے پر بیزاریت لاتے ہوئے اس نے پیغام کھولا تو وہاں اس کے ٹور گائیڈ کی تفصیل درج تھی۔ اس نے کل جولیا کو بولا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی ٹور گائیڈ ہائر کردے تاکہ وہ یہاں کی جگہوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرسکے اور واپس جاکر اپنا سفرنامہ مکمل کرسکے۔

جولیا نے ٹور گائیڈ کی تصویر بھی بھیجی تھی مگر اس نیند کے مارے انسان نے تصویر دیکھنے کی زحمت تک

نہ کی اور موبائل ٹیبل پر پٹخنے کے انداز میں رکھ کر دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

شام ماسکو میں اتر کر ماسکو کو مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔ ماسکو کا ہر رنگ پیارا تھا۔ اور ماسکو کا ہر انسان بہت خوب صورت۔

وہ الیگزینڈر پارک میں تھی۔ یہاں اس کے ایک کلائنٹ نے آنا تھا۔

''سنا ہے کہ وہ بہت امیر ہے اور امریکا کا بہت مشہور آرٹسٹ بھی۔'' اس کی دوست فون پر اسے آگاہ کر رہی تھی جس نے اس کی سیکرٹری جولیا کے ساتھ پے منٹ وغیرہ کی ڈیل کی تھی۔

وہ دونوں ایک ہی کمپنی کے لیے کام کرتی تھیں جو یہاں وزیٹر میں بہت مشہور تھی۔ ان کی سروس کو ماسکو میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا اسی لیے سیکرٹری جولیا نے بھی ان کی کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔

''ہو سکتا ہے۔'' اس نے بے نیازی دکھائی۔ اس کے لیے اس کے سارے کلائنٹس ایک جیسے تھے۔ کوئی امیر غریب نہیں تھا۔

''اس کا خاص خیال رکھنا۔ سی۔ ای۔ او نے خاص طور پر تاکید کی ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زوناشے اسے زیادہ پروٹوکول نہیں دے گی۔

''اچھا جناب! اب فون رکھو وہ آتا ہی ہوگا۔'' وہ اس سے مزید لیکچر نہیں سن سکتی تھی اس لیے بات ختم کر کے جلدی فون کاٹ دیا۔

چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے وہ سامنے منظر میں کھو گئی۔ فواروں میں سے پانی اچھل رہا تھا اور ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اس پانی کو سنہرا کر رہی تھیں۔

سنہرا پانی اوپر جاتا اور پھر اگلے ہی لمحے فوارے کے دامن میں گر جاتا۔ سنہری لڑیاں ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر جاتی تھیں۔

''ایکسکیوز می۔''

ابھی وہ اسی منظر میں کھوئی ہوئی تھی کہ تبھی اسے اپنے پیچھے ایک شناسا سا آواز سنائی دی۔ چہرے پر سجی مسکراہٹ حیرت میں بدل گئی اور وہ چہرے پر کسی قسم کا تاثر لائے بغیر پلٹی۔ سارے منظر بدصورت ہو گئے تھے۔

پیچھے وہ کھڑا تھا جو پچھلے تین دنوں سے اس کے پیچھے پڑا تھا۔

زوناشے کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے سامنے والے فواروں کے پانی میں اتنے غوطے دلائے، اتنے غوطے دلائے کہ بے رحمی سے قتل کرنے کے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں۔

جبکہ مقابل کا دل چاہا تھا کہ یا تو وہ خود ماسکو سے چلا جائے یا پھر اس لڑکی کو کسی راکٹ سے باندھ کر زمین سے باہر خلا میں بھیج دے۔ نہ دنیا میں رہے گی اور نہ گھوم پھر کر روز اس کے سامنے آئے گی۔

''تم...... تم پھر آ گئے؟'' اتنی ٹھنڈ کے باوجود وہ گرم ہو رہی تھی۔

''آپ مس زوناشے ہیں؟'' اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مہذب نظر آنے کی کوشش کی۔

''تمہیں میرا نام کیسے پتا ہے؟''

''اگر تو آپ ٹور گائیڈ مس زوناشے ہیں تو ہیلو مس زوناشے۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے گویا ہوا۔ اور اگر آپ مس زوناشے نہیں ہیں تو مہربانی فرما کر یہاں سے تشریف لے جائیں کیونکہ میری ٹور گائیڈ یہاں آنے والی ہیں۔'' وہ پھر مہذب بنا تھا۔

''تم......؟ میرا مطلب آپ امریکی آرٹسٹ ''ریان'' ہیں؟''

یہ بات پوچھنے سے پہلے زوناشے کا دل چاہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے کیونکہ وہ اس انسان کے ساتھ وہ وہ کچھ کر چکی تھی کہ جس کی خبر ملتے ہی اس کا باس اسے جاب سے نکال دیتا اور اس جاب سے نکالے جانے کا مطلب تھا بوریا بستر لے کر سڑک پر

آجانا۔ اور یہ اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ بہتر تھا کہ وہ ابھی سے اس کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر کرلے۔

''جی بالکل! مجھ سے ملیے، میں ہوں ریان۔'' اس نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ زوناشے کی طرف بڑھایا۔

''میں زوناشے ہوں آپ کی ٹور گائیڈ۔ ماسکو میں خوش آمدید۔'' چہرے پر شرمندگی کے تاثرات چھپاتے ہوئے اس نے ریان کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ'' کا لفظ ریان سے کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

''شکریہ۔'' ہاتھ اس نے دوبارہ پاکٹ میں چھپالیا جیسے کہ اسے عادت تھی۔

''سر! آپ کو یہاں آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔'' اپنی بتیسی دکھاتے ہوئے وہ یوں مخاطب ہوئی کہ جیسے پوچھ رہی ہو مسٹر ریان یہاں آنے سے پہلے آپ کی ملاقات میرے جیسی کسی لڑکی سے تو نہیں ہوئی۔

''نہیں، فی الحال تو نہیں ہوئی لیکن آگے کا میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اور مسٹر ریان کے کہنے کا بھی انداز ایسا تھا کہ ابھی تک تو سب ٹھیک تھا لیکن آگے آنے والی آفتوں، مصیبتوں کا میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ٹور کا آغاز اسی پارک سے کرنا چاہیے۔'' وہ اب خود پر بہت حد تک قابو پا چکی تھی۔

''لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' لہجہ دھیما ہو چکا تھا۔

''سن رہا ہوں۔'' ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے وہ بے نیاز نظر آیا تھا۔

''آپ...... میری پچھلی کسی بھی حرکت کا ذکر فیڈ بیک میں نہیں کریں گے۔''

''ورنہ؟''

''ورنہ میں اس ٹور پر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کی کمپنی کے سی ای او سے بول دیتا ہوں کہ آپ کی یہ ورکر میرے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہے۔ آپ کسی اور کو بول دیں۔ بائے۔'' ایک ہی سانس میں وہ اس کے سر پر اتنا بڑا دھماکا کر کے وہاں سے جانے لگا۔

''رکیں تو سہی۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

''تو پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟'' وہ اتنا اچانک پلٹا کہ بھاگ کر آتی زوناشے کا سر اس کے سینے سے لگا تھا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے پیچھے کی جانب گر گئی تھی۔

اس لمحے کلیسائے سینٹ باسل میں کسی نے محبت کی نئی دھن تشکیل دی تھی۔ محبت جو چپکے سے دلوں میں سر اٹھاتی ہے۔

وہ نیچے گری اس سے یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ ابھی آگے بڑھے گا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھائے گا جسے تھامتے ہوئے وہ اپنے پیروں پر اٹھ کھڑی ہوگی لیکن......

''اگر کل تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں تو مجھے بتا دینا میں آجاؤں گا۔'' اپنی ہیٹ درست کرتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔ جبکہ وہ زمین پر گری سانس روکے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''بڑا اکڑو بنا پھرتا ہے۔ تمہیں تو میں بتاؤں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔

ماسکو میں سورج غروب ہو چکا تھا اور اب رات اپنا راج قائم کرنے کے لیے ہر طرف اتر رہی تھی۔

فواروں کے اندر اور باہر لگی رنگ برنگی روشنیاں منظر کو ایک نیا رنگ دے رہی تھیں اور یہ منظر زوناشے کو ہمیشہ خوب صورت لگتا تھا لیکن ابھی صرف اس ریان کے بچے کی وجہ سے اسے اس منظر میں

دلچسپی نہیں ہو رہی تھی۔

"اسے بھی دیکھ لوں گی۔" ہمت کر کے وہ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

صبح وہ وہاں تھی جہاں ریان پہلے سے ہی موجود تھا۔

وہاں بالکل کریملن کے سامنے۔

"ہائے۔" اس کے قریب جاتے ہوئے اس نے ریان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی جو کہ اردگرد کے منظر میں محو تھا۔

"چلیں۔" اسے ایک نظر دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

بندہ جواب میں حال چال ہی پوچھ لے۔ مینرز ہی نہیں ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

"ارے۔ میں نے آپ کو گائیڈ کرنا ہے یا آپ نے مجھے؟" اس کے یوں بے نیاز ہو کر چل دینے سے وہ حیران ہوئی تھی۔

"میں جگہ کا انتخاب ہمیشہ خود کرتا ہوں۔" اور کوٹ کی پاکٹس میں ہاتھ چھپائے وہ بنا رکے بولا۔

"میں ایسے نہیں چل سکتی آپ کے ساتھ۔" اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔

"ویل چیئر لا دوں؟" اب کی بار وہ رک کر اس کی جانب پلٹا۔

"نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ایک تو مجھے آپ کے مطلب سمجھ میں نہیں آتے۔" وہ پھر چل دیا۔

"میں تم سے دوٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔" آپ آپ کہہ کر اس کا منہ تھک گیا تھا اور ویسے بھی ایسے بدلحاظ انسان کا لحاظ کر کے وہ خود اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ جیسا بندہ ہوتا ہے ویسے ہی بات کرنی چاہیے۔ یہ اس کا اصول تھا۔

"ہاں بولو۔" ریان کے اصول بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

"تم کسی اور کو گائیڈ کرنے کے لیے ہائر کر لو۔" وہ کل سے خود میں یہ بات کرنے کی ہمت پیدا کر رہی تھی اور بالآخر آج اس نے کہہ ہی دیا۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" چلتے چلتے وہ لینن کے مقبرے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"کیونکہ میں تم سے "آپ آپ" کر کے بات نہیں کر سکتی اور نہ ہی تمہارے حکم کے مطابق چل سکتی ہوں۔" وہ رک گئی تھی وہاں۔

"میں نے تو ایسی کوئی شرط نہیں رکھی۔" وہ بھی رک گیا۔ "رہی بات حکم کے مطابق چلنے کی تو دو میں سے ایک کو تو دوسرے کے حکم کے مطابق چلنا ہی پڑے گا۔" اب کی بار وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"چلو تم نہ سہی، میں ہی سہی۔" وہ ہتھیار ڈال دینے کے سے انداز میں بولا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ تم کن مصیبتوں اور آفتوں کی جانب میری رہنمائی کر سکتی ہو۔" وہ شرارت سے گویا ہوا۔

"مطلب تم سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے؟" وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ جان چھوڑنے والا نہیں ہے۔

"مشکل ہی نہیں ناممکن بھی۔"

ہیٹ درست کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ ذرا سا موڑا کیونکہ سامنے دو روسی باشندے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ زوناشے سمجھی نا سمجھی کے عالم میں اسے تکتی رہی۔

"مس زوناشے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ یہاں کھڑی ہو کر مجھے گھنٹوں تکتی رہیں۔" وہ اسے شرمندہ کرتے ہوئے بولا۔

"چلو۔" ایک تیکھی سی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے وہ مقبرے کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

"رکو۔" دروازے کے اطراف میں کھڑے گارڈز کو دیکھتے ہوئے اسے کچھ یاد آیا۔

"یہاں ہیٹ لے کر اور پاکٹس میں ہاتھ چھپا کر اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہیٹ پہن کر صرف خواتین کو اندر جانے کی اجازت ہے۔" اس نے ایک نیا انکشاف کیا تھا۔

"یہ کیسا مذاق ہے؟" وہ اس انکشاف کو مذاق ہی سمجھا تھا کہ لو بھئی اب مقبرے کے اندر بندہ ہیٹ پہن کر اور پاکٹس میں ہاتھ چھپا کر بھی نہیں جا سکتا۔ اور خواتین کو یہ خصوصی رعایت کیوں تھی۔

"اچھا چلو۔" وہ اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔

"خود ہی آگے بڑھ کر دیکھ لو کہ یہ کیسا مذاق ہے۔"

زوناشے اپنا کارڈ دکھا کر چیکنگ ایریا پار کر چکی تھی اور اب مسکراہٹ دبائے ریان کو دیکھنے لگی تھی جسے دو گارڈز روک چکے تھے۔

وہ وہاں گارڈز کی نظر میں مشکوک قرار پا گیا تھا۔ کالا چشمہ، سر پر بڑی سی ہیٹ اور اوورکوٹ کی پاکٹس میں چھپے ہاتھ۔

"اسے یہاں سے لے جا کر اس کی اچھی طرح سے چیکنگ کریں۔" ان میں سے ایک گارڈ نے تیسرے گارڈ کو وہاں بلا کر ریان کو اس کے حوالے کر دیا۔

ریان سمجھ چکا تھا کہ وہ کس قسم کی چیکنگ کی بات کر رہے تھے۔ یہ سنتے ہی اس نے زوناشے کی جانب التجائیہ نظروں سے دیکھا کہ اب تم ہی کچھ کرو۔ آئندہ میں تمہارے ہر مذاق کو سنجیدہ لیا کروں گا۔ اس کے یوں دیکھنے پر زوناشے کی گردن غرور سے اکڑی اور وہ ایک ادا سے چلتے ہوئے ان گارڈز کے قریب آ گئی۔ اس نے روسی زبان میں ان سے نجانے کیا کہا کہ انہوں نے ریان کو چھوڑ دیا۔ اور اس سے ایسے پیش آنے لگے جیسے وہ کسی سلیبرٹی کو پروٹوکول دیتے تھے۔

تو اچھا اس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ کون تھا۔

اب ریان کو اس کا شکریہ کہنا چاہیے تھا یا پھر اس پر غصہ ہونا چاہیے تھا؟

"اب یہ ہیٹ اتار دو اور چشمہ اندر جا کر اتار دینا۔" وہ اسے مشوروں سے نوازنے لگی۔

ریان نے ہیٹ اتارا اور اسے زوناشے کے سر پر رکھ دیا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اب ہاتھ میں تو نہیں پکڑ سکتا نا اسے۔" انداز شاہانہ تھا۔

"اچھا لگ رہا ہے۔" وہ غصے سے اسے اتارنے لگی تھی کہ اس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ رک چکی تھی۔ یعنی دونوں نے ایک دوسرے کے حکم سے چلنا شروع کر دیا تھا۔

اندر زیادہ رش نہیں تھا اس لیے ریان نے وہاں جا کر اپنا چشمہ اتار دیا۔ وہاں پتھر سے بنے ایک سیاہ چبوترے پر لینن کا حنوط شدہ جسم اپنی کہانی کھول کھول کر بیان کر رہا تھا۔

ریان اس جسم کو غور سے دیکھنے لگا اور زوناشے ریان کو۔ اس کا چہرہ تو وہ آج دیکھ رہی تھی۔

"مانا کہ میں بہت پیارا ہوں اور ہینڈسم بھی لیکن اگر تم مجھے دیکھنے کے بجائے لینن کے بارے میں کچھ بتاؤ تو زیادہ بہتر رہے گا۔" وہ چوری پکڑنے میں ماہر تھا۔ اور اس نے چوری پکڑ بھی لی تھی۔

"ہونہہ...... میں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ چشمے اور ہیٹ میں پھر بھی دیکھے جانے کے قابل لگتے ہو اور ایسے تو استغفراللہ...... مجھے تو ڈر ہے کہ ہمارا یہ روسی لیڈر کہیں ڈر ہی نہ جائے تمہیں دیکھ کر۔"

زوناشے نے اس کی ساری خوش فہمی مقبرے کے اندر دفنا دی تھی۔

"جلنے کی بو آ رہی ہے مجھے۔" اس نے ہاتھ سے فرضی بدبو کو ناک کے آگے سے ہٹایا۔

"میں کیوں جلوں گی تم سے۔" وہ ایک قدم آگے بڑھ گئی۔

"میں نے کب کہا کہ تم جل رہی ہو۔" اس نے بھی اس کی پیروی کی۔

زوناشے نے لڑائی کو طول پکڑنے سے بچانے کے لیے اسے لینن کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ اس کا لفظ لفظ پوری توجہ سے سنتا رہا۔

"یہ چپ کتنا اچھا لگتا ہے۔" اسے چپ دیکھ کر ایک خیال نے زوناشے کے ذہن میں انگڑائی لی تھی۔

وہ بولتے بولتے جب بھی اس کی طرف دیکھتی تو رک سی جاتی۔ کسی نہ کسی خیال کے تحت وہ اپنی بات بھول جاتی۔

ریان کو بار بار اسے یاد کروانا پڑتا کہ وہ کیا بات کر رہی ہے اور وہ معذرت کرتے ہوئے پھر سے بولنا شروع کر دیتی۔

مقبرے کے اندر تاریخ اپنے کھلے ابواب کے ساتھ موجود تھی۔ روس میں گرنے والی پہلی لاش سے لے کر روس میں آنے والے تاریخی انقلاب تک ہر بات وہاں رقم تھی۔ لیکن اس خشک اور دہلا دینے والی داستان کے ساتھ ساتھ وہاں ایک اور داستان بھی رقم ہو رہی تھی۔

اور کون جانے کہ اس داستان کا انجام کیسا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں ارباط اسٹریٹ میں تھے۔ ہر قسم کے آرٹسٹس، موسیقاروں، فنکاروں اور جادوگروں کی سرزمین میں۔

ریان کو فن اور آرٹ میں گہری دلچسپی تھی اس لیے اس نے زوناشے سے ایک بار پھر اس اسٹریٹ میں جانے کا کہا۔ کیونکہ پہلی دفعہ تو اس کا موڈ زوناشے کے گھونسے کی نذر ہو گیا تھا وہ اس اسٹریٹ کو دیکھے بغیر واپس چلا گیا تھا۔

''وہ بھی ایک اچھی یاد تھی۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''کون سی؟'' وہ ذرا سی اس کی جانب مڑی۔

''چھوڑو...... وہ جوکر اپنے بازوؤں پر کبوتر بٹھائے کیوں گھوم رہا ہے؟'' اس نے اس کی توجہ سامنے نظر آنے والے ایک جوکر کے کپڑے پہنے روسی باشندے کی جانب کروائی۔ کیونکہ وہ اس کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

''وہ فاختہ ہے۔ امن کا پرندہ۔'' اس نے سرسری سا جواب دیا کہ جیسے اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

''فاختہ ایسی ہوتی ہے؟'' ریان نے شاید فاختہ کا پہلے صرف نام ہی سنا تھا۔

''کیوں تمہیں پہلے یہ کوے جیسی لگتی تھی۔'' وہ موبائل پر ایک پیغام اپنی دوست کے نام چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''ہاں کچھ کچھ۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ جیسے اسے اپنی اس کم علمی پر ذرا سی بھی شرمندگی نہیں تھی۔

''اور کوا یقیناً تمہیں اپنے جیسا لگتا ہوگا۔'' وہ بھی نہایت سنجیدگی سے بولی کہ جیسے یہی حقیقت ہو اور وہ اعتراف کر لے گا۔

''ہاں کچھ کچھ۔'' اور اس نے اعتراف کر لیا تھا۔

''اچھی بات ہے۔ انسان کو حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے۔''

''مجھے اپنے اچھا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔'' چلتے چلتے وہ اس جوکر کے پاس پہنچ گئے تھے۔

''کیا اس فاختہ کے ساتھ ایک تصویر بنا سکتا ہوں؟'' وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا۔

روسی باشندے نے سر ناں میں ہلاتے ہوئے ناسمجھی کا اظہار کیا۔ وہ انگریزی زبان نہیں سمجھتا تھا۔

''اس سے پوچھو......'' پھر اس نے زوناشے سے کہا۔ ''اب تم ہی اسے اپنی زبان میں سمجھاؤ۔''

''کیا کر رہے ہو لڑکے۔ یہ اتنی سی تصویر کے ڈھیر سارے پیسے لے لے گا۔'' زوناشے کو اس کی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

''کوئی بات نہیں، تم بس اس سے بات کرو۔'' وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ وہ ایک مشہور آرٹسٹ تھا اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی تھی بھلا۔

زوناشے نے اس سے مقامی زبان میں پوچھا تو وہ فوراً تیار ہو گیا کہ ان کا تو کام ہی یہی تھا۔

بالکل ویسا کام جیسے لاہور میں جگہ جگہ پر لوگ کرتے ہیں۔ شاہی قلعہ میں شیش محل کے سامنے سے لے کر فوڈ اسٹریٹ کے اندر تک۔

سبز و سفید طوطے اور زنجیر سے جکڑا ایک عقاب۔ جسے کندھے یا بازو پر بٹھا کر تصویر بنوانے کے ہی وہ کافی پیسے لے لیتے ہیں۔ بالکل ویسا حال یہاں بھی تھا مگر فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں دو معصوم سفید فاختائیں تھیں۔

''یہاں اس جگہ پر کھڑے ہو جاؤ۔''

''نہیں۔ تم اس جگہ پر کھڑی ہو جاؤ میں اپنے کیمرے سے تمہاری تصویر بناتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنا کیمرہ سیدھا کرنے لگا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''کیونکہ میں تمہاری تصویر وہاں امریکا کے سب سے بڑے عجائب گھر میں بجھواؤں گا۔''

''اور میں تمہیں ایک پنجرے میں ڈال کر یہاں روس کے سب سے بڑے چڑیا گھر میں بجھواؤں گی۔'' اسے برا لگا تھا۔

''ہاہاہاہا۔ مذاق کر رہا تھا۔'' وہ کیمرا آنکھ کے ساتھ لگا چکا تھا ''اب جاؤ وہاں پہ جا کر کھڑی ہو جاؤ۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے وہاں نشان زدہ ایریا میں کھڑی ہو گئی۔

روسی جوکر نے ایک فاختہ کو اس کے کندھے پر بٹھا دیا اور دوسری کو اس کے خم کیے ہوئے بازو پر۔

''اسمائل مس زوناشے۔'' اتنے سڑیل سے چہرے سے تو اس کا کیمرہ جل جاتا تھا۔

زوناشے زبردستی مسکرائی لیکن ماسکو میں سرکتا وقت جانتا تھا کہ وہ مسکراہٹوں میں سب سے خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

جوکر کو پیسے دینے کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔

زوناشے نے اسے بتایا تھا کہ کچھ سالوں پہلے یہاں بھی ٹریفک کی بھرمار ہوا کرتی تھی لیکن پھر اسے مکمل طور پر پیدل چلنے والوں کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اب یہاں سے ٹریفک کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ آسانی سے اس اسٹریٹ میں گھوم پھر رہے تھے۔

کچھ دور چلتے ہی آگے کچھ موسیقار سڑک کے بائیں کنارے پر بیٹھے وائلن، گٹار، پیانو جیسے موسیقی کے آلات سے ایک خوبصورت دھن ہوا کے سپرد کر رہے تھے۔

موسیقی کی یہ دھن سن کر زوناشے کے اندر کی بیلرینا مچلنے لگی اور اس نے ہمیشہ کی طرح اردگرد کی پرواہ کیے بنا اپنی ہائی ہیلز اتار دیں۔ اور یوں ارباط اسٹریٹ میں زوناشے مورنی کی طرح رقص کرتے ہر منظر کو دلکش بنانے لگی تھی۔ جبکہ ریان حیرت سے آنکھیں کھولے اس منظر پر یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

رقص کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے پہلے دن بالشوئی تھیٹر کے عین سامنے، آسمان تک پانی اچھالتے فوارے کے عقب میں وائٹ سوان کو کرتے دیکھا تھا۔

زوناشے رقص کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ریان کے دل کی دھڑکن بھی تھرکنے لگی تھی۔ وہ اس کے دل سے نکلی اور زوناشے کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے رقص میں شامل ہو گئی۔

رقص ''دل'' تھا اور زوناشے اس کی ''دھڑکن''۔

دیکھتے ہی دیکھتے ارباط اسٹریٹ میں سب کچھ غائب ہو گیا۔

کندھے اور بازو پر فاختہ بٹھائے وہ جوکرز، فوک موسیقی پر ناچتے گاتے مقامی باشندوں کے دستے، اطراف میں کھڑی سب عمارتیں، سپر اسٹورز، کافی ہاؤسز اور بڑے بڑے بل بورڈز...... سب غائب ہو گیا تھا۔

صرف ایک منظر سب پر حاوی تھا اور اس منظر میں زوناشے ایک خوب صورت مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے رقص کر رہی تھی۔

ریان اس کے ساتھ اپنی دھڑکن کو رقص کرتے دیکھ کر عجیب سی حالت کا شکار ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے انکاری ہو رہا تھا کہ زوناشے وہی لڑکی تھی جو اس دن بالشوئی تھیٹر کے سامنے رقص کر رہی تھی۔ مگر دونوں کے رقص میں بالکل فرق نہیں تھا۔ وہی انداز،

وہی کمر کا خم۔ سب کچھ وہی۔ تو کیا زوناشے ہی وائٹ سوان تھی۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

ریان اب اس منظر سے بھاگنے لگا کہ وہ اس منظر سے مزید بے قابو نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے ہر چیز ارباط اسٹریٹ میں اپنی جگہ پر آن موجود ہوئی۔

اس کو یوں بھاگتے دیکھ کر زوناشے پریشان سی اس کے پیچھے لپکی لیکن وہ سڑک میں بہتے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ غائب ہوتا گیا۔ ہیلز کو ہاتھ میں پکڑے وہ اس کے پیچھے جتنا تیز بھاگ سکتی تھی وہ بھاگی۔

''ریان۔'' وہ چلائی۔ ''رک جاؤ ریان۔'' لیکن وہ رکا نہیں۔

اس کا دل تب بھی دھڑکا تھا جب اس نے ایک رقاصہ کو بالشوئی تھیٹر کے باہر رقص کرتے دیکھا تھا اور اب بھی دھڑکا تھا جب اس نے زوناشے کو رقص کرتے دیکھا تھا۔ دل صرف اسی لڑکی کو رقص کرتے دیکھ کر ہی کیوں دھڑکتا تھا؟ اس کا جواب وہاں کسی کے پاس نہیں تھا۔

اسے اپنے پیچھے زوناشے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی وہاں رک نہ سکا کہ اگر رک جاتا تو شاید عمر بھر ایک بے نام رشتے میں قید ہو جاتا۔

☆☆☆

رات چپکے سے آگے سرک رہی تھی اور یہ رات خلاف معمول ایک خاموش رات تھی۔ ہر چیز پہ سکوت طاری تھا۔ وہ اپنے بیڈ پہ آڑھا ترچھا لیٹا آج کے واقعے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ اٹھا اور اس کینوس کے قریب آگیا جس پر اس نے وائٹ سوان کو اتارا تھا۔ اس نے برش اٹھایا اور وائٹ سوان کا چہرہ بنا ڈالا۔

تصویر مکمل ہو چکی تھی لیکن ریان ادھورا ہو گیا۔

وہ زوناشے کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا مگر اسے ایک بیلرینا کے طور پر قبول کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ کیونکہ بیلرینا تو وہ بھی تھی جس نے اسے بچپن میں اپنے شوق کی خاطر چھوڑ دیا تھا۔ تو زوناشے بھی تو اسے چھوڑ سکتی تھی نا...... ایک رقاصہ بننے کے لیے۔

''اسے میں خود ہی چھوڑ دوں گا۔'' وہ کینوس پر اس کے عکس پر نظریں جمائے کسی فیصلے پر پہنچا تھا۔

''اس دفعہ میں خود کو عمر بھر کا روگ نہیں لگنے دوں گا۔''

☆☆☆

''گورکی نے ایک خط میں چیخوف سے پوچھا کہ ایک جینئس کی کیا تعریف ہو سکتی ہے تو چیخوف نے جواب میں لکھا تھا کہ ایک جینئس کی تعریف کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اتنا کہہ دینا آسان ہے کہ...... لیوٹالسٹائی۔''

تو وہ وہاں جینئس لیوٹالسٹائی کے ہاتھ سے بنائے گئے ایک بنچ پر بیٹھا اپنے عملِ تنفس کو نارمل کر رہا تھا جبکہ زوناشے پاس کھڑی لمبے لمبے سانس بھیگتی فضا میں خارج کر رہی تھی۔

برچ کے تنوں سے بنا یہ بنچ لیوٹالسٹائی نے تنہائی کے لمحات میں بیٹھنے کے لیے بنایا تھا۔ جو ماسکو کی سرحد سے اتنا دور تھا کہ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ماسکو سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں آگئے ہوں۔ ہنگاموں سے دور ایک خاموش سی، پرسکون سی دنیا میں کہ جہاں کسی پرندے کے بولنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بارش میں بھیگتا ایک خاموش جنگل تھا۔

ایک ایسی ہی خاموشی ان دونوں کے درمیان بھی چھائی ہوئی تھی۔ گہری، جامد خاموشی۔

''تم یہاں بیٹھ سکتی ہو۔'' ریان بنچ کے بائیں طرف سرک گیا۔

''شکریہ۔'' بیگ میں سے پانی دو بوتلیں نکال کر اس نے ایک ریان کو دے دی اور دوسری اپنے لبوں سے لگالی۔

‘‘ابھی تو پورا ماسکو گھومنے والا پڑا تھا تو پھر تم نے یہاں آنے کا کیوں کہا؟’’

وہ ماسکو سے نکلتے وقت سے لے کر اب تک یہی سوچ رہی تھی کہ ریان کو یہاں اتنی دور آنے کی کیا سوجھی تھی۔

‘‘میں پرسوں واپس جا رہا ہوں۔’’ بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے اس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ کچھ لمحے زوناشے کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

‘‘کیوں؟ میرا مطلب ہے کہ.....’’ وہ دانستہ خاموش ہوگئی۔

‘‘آج نہیں تو کل، واپس تو جانا ہی تھا نا مجھے۔’’ لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائے وہ اطراف میں بلند ہوتے درختوں کو دیکھنے لگا جن کے تنوں سے لپٹی بیلیں سبز سانپوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

‘‘لیکن.....’’ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہوگئی۔

‘‘لیکن کیا مس زوناشے؟’’ وہ نا سمجھی سے اس لڑکی کو تکنے لگا جس کے بارش سے بھیگتے چہرے پر کئی سوال مضطرب سے نظر آ رہے تھے۔

‘‘کچھ نہیں۔’’

‘‘کچھ تو ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ تم بتانا نہیں چاہتیں۔’’ وہ بنچ کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں موند کر لیٹ گیا جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ زوناشے کا دل اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے اندر کے شور مچاتے طوفان کو قابو میں رکھتے ہوئے اس کا پرسکون چہرہ تکنے لگی۔

بارش کے ننھے ننھے قطرے وقفے وقفے سے اس کے چہرے پر گر رہے تھے مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ ویسا ہی تھا، پرسکون سا۔

‘‘ریان۔’’ زوناشے نے اسے رندھی ہوئی آواز میں پکارا۔

‘‘میرا خیال ہے کہ ہمیں اب لیو ٹالسٹائی کی قبر پر جانا چاہیے۔ رات ہوگئی تو یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔’’ وہ اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر ہاتھ میں پکڑی چھتری کو پیچھے بیگ میں ڈال کر وہاں سے جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

وہ حیرت سے اس بے حس انسان کو دیکھنے لگی جو اس کے احساسات و جذبات سے بے نیاز کھڑا ارد گرد کے ماحول میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

زوناشے خود کو سمجھاتے ہوئے اس کے پیچھے ہولی کہ ضروری تو نہیں کہ ہم جس انسان کے بارے میں جیسا محسوس کریں وہ بھی ہمارے لیے وہی احساس رکھے۔

‘‘یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے زوناشے۔’’ وہ خود سے سوال کرنے لگی۔ ‘‘دو دن پہلے تو تمہیں اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔’’

ریان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سے اپنا فاصلہ بڑھاتا جا رہا تھا۔

‘‘تمہارے جیسی لوئر اسٹیٹس کی لڑکی کو امریکا کا ایک مشہور آرٹسٹ کیسے اپنا سکتا ہے۔ اس لیے خود کو اس خوش فہمی سے نکال لو۔’’

وہ بھی تیزی سے قدم اٹھاتی اس سے اپنا فاصلہ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

‘‘تمہارے لیے یہی بہت ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اتنے دن رہا۔’’

وہ بھاگتی ہوئی اس کے قریب تر ہو رہی تھی۔

‘‘دیکھنا ایک دن وہ وہ تمہاری طرف پلٹ آئے گا۔’’ ایک دفعہ وہ پھر خوش فہمی کے دلدل میں دھنسنے لگی تھی۔

ریان اتنی تیزی سے پلٹا زوناشے کا سر اس کے سینے سے زور سے ٹکرایا تھا جیسے اس دن الیگزینڈر پارک میں وہ اس سے ٹکرائی تھی۔

اس دن وہ گر گئی تھی لیکن آج ریان نے اسے گرنے نہیں دیا تھا۔

‘‘تم مجھے گائیڈ کر رہی ہو یا پھر میں تمہیں؟’’ اسے بازو سے تھامے وہ خفا سا نظر آیا تھا۔

"آج میں تمہارے پیچھے چلنا چاہتی ہوں۔" وہ کسی احساس کے تحت ایسا بولی۔

"لیکن مجھے تمہارے پیچھے چلنا اچھا لگتا ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ وہی ہو جو تم چاہتے ہو۔" وہ تقریباً چلائی۔

"ہاں ضروری تو نہیں۔" وہ پل بھر میں اداس ہوا تھا۔

زوناشے چند ثانیے بت بنے کھڑی اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ تو ایک الجھی ہوئی کتاب تھا جسے سلجھاتے ہوئے وہ خود الجھ رہی تھی۔ محبت کی ان دیکھی بیلیں اس کے گرد سانپوں کی مانند لپٹ رہی تھیں اور لپٹ کر اس کی محبت کا خون چوسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھوں کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اب چلو بھی۔" ریان نے اپنی پاکٹ سے چشمہ نکال کر اس کی آنکھوں پہ لگا دیا۔

"تمہاری بھیگتی آنکھیں مجھے افسردہ کر رہی ہیں اور میں یہاں سے افسردہ واپس امریکا نہیں جانا چاہتا۔" اس کے دریافت کرنے سے پہلے ہی ریان نے اپنے اس عمل کی وضاحت دے دی۔

"شاید بارش کی وجہ سے بھیگی بھیگی لگ رہی ہیں تمہیں۔" چشمہ اتار کر وہ مسکرا دی تھی اور اسے ایک دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"ارے۔" وہ اس کے پیچھے لپکا۔

"جلدی چلو۔ ورنہ یہیں اسی جنگل میں تمہیں گاڑ کر چلی جاؤں گی۔" دھمکی دیتے ہوئے وہ کچی راہداری پر بھاگنے کے انداز میں چل رہی تھی۔

"ہاہاہا۔۔۔۔ اس جنگل میں میری روح بھٹکے گی دیکھ لینا۔ پھر جب تم یہاں آیا کرو گی تو میں تمہیں اتنا ڈرایا کروں گا کہ تمہیں خودکشی کرنی پڑ جائے گی۔"

وہ خوش ہو رہا تھا کہ زوناشے اپنے اصل رنگ میں لوٹ رہی تھی۔

"ہی ہی ہی...... ویری فنی۔" اسے اس کی بات محض ایک بھونڈا سا مذاق لگی تھی۔

"ایسا ہی ہوگا مس زوناشے۔"

"دیکھیں گے۔"

"پھر تم پچھتاؤ گی۔"

پچھتاؤ گے تو تم بھی۔"

خاموش جنگل ان کی نوک جھوک سے پر رونق ہو گیا تھا۔

"کیا تم واقعی مجھے اپنے ہاتھوں سے مار سکتی ہو؟"

"کیا تم واقعی میرے ہاتھوں سے مرنا چاہو گے؟"

وہ آگے آگے بھاگ رہی تھی اور ریان اس کے پیچھے پیچھے۔

"اگر لیو ٹالسٹائی زندہ ہوتا تو وہ یقیناً ایک کہانی ہماری بھی لکھتا۔"

"پھر وہ تمہیں مار دیتا اور تمہاری قبر اس سبز شاخ کے نیچے بناتا جہاں اس وقت اس کی اپنی قبر ہے۔"

ریان کا قہقہہ بھیگتی فضا میں گونجا اور خاموش جنگل مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

زوناشے نے اسے واپس امریکا جانے سے پہلے اپنے گھر رات کے کھانے پہ بلایا تھا اور وہ اس کی یہ پہلی اور آخری دعوت قبول کرتے ہوئے عین وقت پر اس کے گھر آن پہنچا تھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" پھولوں کا ایک خوب صورت گلدستہ اسے تھماتے ہوئے وہ اس سے اپنی نظر ہٹا نہیں پایا تھا۔

وہ ایک خوب صورت لباس میں پروفیشنل زوناشے سے بے حد مختلف نظر آ رہی تھی اور بہت حسین بھی۔

"اندر آؤ۔" وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

"اچھے ذوق کی مالک لگتی ہو۔" دیواروں پر لگی پینٹنگز کو اس نے ستائشی نظروں سے دیکھا جن میں سے زیادہ تر ریان کی ہی بنائی ہوئی تھیں۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم بھی میری فین ہو۔"

"یہ تمہاری پینٹنگز ہیں؟ کیا واقعی؟" اسے آج تک یہی نہیں پتا چلا کہ اس کے گھر میں لگی پینٹگز کس آرٹسٹ کی ہیں۔

"ہاں۔ تمہیں نہیں پتا تھا تو پھر خریدی کیوں تھیں؟" وہ حیران ہوا تھا کہ جب آرٹسٹ کا نہیں پتا تھا تو پھر آرٹ میں دلچسپی کا فائدہ۔

"جی نہیں، یہ میں نے نہیں خریدیں۔" وہ اس کی خوش فہمی پہ طنزیہ ہنسی۔

"تو پھر کس نے خریدی ہیں؟"

میری بیلے ٹیچر نے، وہ بھی میرے ساتھ اسی گھر میں رہتی ہیں۔ وہ تمہاری بہت بڑی فین ہیں۔"

"اور رئیلی...... کہاں ہیں وہ؟" ریان نے اردگرد نظر دہراتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ ابھی ڈانسرز کو پریکٹس کروا رہی ہیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔"

زوناشے اوپن کچن میں کھڑی اس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی اور ساتھ ہی کھانا برتنوں میں نکال رہی تھی۔ اس دوران ریان اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا رہا کہ اس کی ماما کو بھی بیلیرینا بننے کا بہت شوق تھا اور اسی خاطر اس نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اور اس دن وہاں سے بھاگنے کی وجہ بھی بتائی کہ وہ کسی بھی بیلیرینا کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پاتا۔

زوناشے کے حرکت کرتے ہاتھ یکدم رکے۔

"یعنی کہ تم مجھے بھی کبھی قبول نہیں کر پاؤ گے۔"

وہ ہم کلام ہوئی تھی جبکہ ریان اس سے بے خبر بولتا رہا۔

اتنی ہی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔

"لو، وہ آگئیں۔" انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر زوناشے نے ریان کی توجہ ان کی جانب مبذول کروائی۔

اس سے پہلے کہ زوناشے ریان کا تعارف اپنی بیلے ٹیچر سے کرواتی ریان نفی میں زور زور سے سر ہلاتا پیچھے ہٹنے لگا۔

"نہیں......"

زوناشے اسے یوں پیچھے ہٹتے دیکھ کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی جبکہ اس کی بیلے ٹیچر آنکھوں میں آنسو لیے اس منظر کو تکتی رہیں۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ یقین کرنے سے انکاری تھا۔

تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہے زوناشے۔" وہ دکھ سے بولا۔

"ریان۔" وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر ریان بول پڑا۔

"بس۔ تم نے جان بوجھ کر مجھے اپنے جال میں پھنسایا تاکہ تم مجھے اس عورت سے ملوا سکو۔" غصے اور ضبط سے اس کی نسیں پھولتی نظر آرہی تھیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ریان؟" وہ اس لمحے اس کی بات نہیں سمجھ پارہی تھی۔

"یہ کچھ نہیں جانتی ریان۔" اس کی بیلے ٹیچر بول پڑیں۔

"آپ چپ رہیں۔ آپ یہی چاہتی تھیں کہ جیسے آپ نے پاپا کی زندگی خراب کردی ویسے ہی زوناشے میری کردے۔" وہ کچھ دیر رکا۔ "اور زوناشے نے واقعی میری زندگی خراب کردی۔" وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور پھر کچھ توقف سے بولا۔

"جب مجھ پر زوناشے کی حقیقت کھلی تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں محبت کا آدھے سے زیادہ رستہ طے کرچکا تھا۔ واپسی ناممکن تھی۔ میں منزل کے بہت قریب پہنچ چکا تھا لیکن پھر پتا چلا کہ یہ بھی آپ کے جیسی ہے۔ ایک بیلیرینا جسے اپنے خوابوں کے علاوہ اور کوئی بھی عزیز نہیں بالکل ویسے ہی جیسے آپ کو اپنا بیٹا بھی عزیز نہیں تھا۔" وہ ٹوٹ چکا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔

"تم آج بھی غلط ہو بیٹا۔" وہ بھی اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں یوں کہ وہ براہ راست اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک سکتی تھیں۔

"میں غلط ہوں...... میں...... وہ پانچ سالہ بچہ کیسے غلط ہو سکتا ہے جسے اس کی ماں صرف اس لیے چھوڑ کر چلی جاتی ہے کہ اسے بس اپنے خواب ہر چیز سے بڑھ کر تھے۔" آنکھیں رنج کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیونکہ تم اپنے باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔"

"میں آپ دونوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر آپ نے چھوڑ دیا مجھے۔"

"میں نے نہیں چھوڑا تھا تمہیں...... میں تو ہر لمحہ تمہارے ساتھ رہی تھی۔ ہر لمحہ تم سے باخبر رہی تھی۔"

"یہ پینٹنگز اس بات کی گواہ ہیں۔" انہوں نے پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہاری پہلی پینٹنگ خریدنے والی تمہاری ماں تھی۔ میں نے دن رات محنت کی تاکہ تمہاری ہر مہنگی سے مہنگی پینٹنگ خرید سکوں۔ تمہاری کامیابی میری کامیابی تھی۔ میں نے تمہاری ہر کامیابی کا جشن منایا۔ تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔"

"لیکن آپ کو پتا ہے کہ جب میں نے پہلی پینٹنگ بنائی تھی تو میری کتنی خواہش تھی کہ وہ سب سے پہلے آپ دیکھیں۔ میں راتوں کو رونے کے لیے آپ کی گود ڈھونڈتا رہا ہوں۔ میں لوگوں میں آپ کا عکس تلاش کرتا رہا ہوں۔ میں آپ کے گلے لگنے کے لیے تڑپتا رہا ہوں تو پھر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں گئی تھیں۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر استہزائیہ ہنس دیا۔

"خیر۔ میں پھر سنبھل جاؤں گا۔ آپ دونوں خوش رہیں اور نیا شکار تلاش کرنے کی کوشش کریں۔" وہ نفرت سے کہتا وہاں سے چلا گیا۔

"ریان۔" زوناشے اس کے پیچھے لپکی۔ جیسے اس دن ارباط اسٹریٹ میں وہ اس کے پیچھے لپکی تھی۔ "ریان رک جاؤ۔" مگر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بھاگتا رہا۔

"خدا کے لیے رک جاؤ ریان! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرے بارے میں۔" وہ بھی اس سے فاصلہ کم کرنے کے لیے بھاگتی رہی۔ اسے امید تھی کہ ابھی وہ اچانک پلٹے گا اور وہ اس سے ٹکرا کر نیچے گر جائے گی اور پھر ریان اسے تھام لے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا...... وہ نہیں پلٹا تھا۔

"ریان......" وہ تھک گئی تھی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو...... میری تم سے پہلی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔" وہ اکھڑتے سانس کے ساتھ اسے صفائی دینے لگی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم میری بیلے ٹیچر کے بیٹے ہو۔" وہ رکا نہیں تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا بہت دور...... جہاں اسے کبھی کوئی بیلیرینا نظر نہ آئے۔ "میں نے تم سے سچی محبت کی ہے ریان۔ یہ سچ ہے کہ ایک مشہور بیلرینا بننا میرا خواب ہے مگر میں اس خواب کو تمہارے لیے چھوڑ سکتی ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔" وہ اسے یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"تم جو کہو گے میں ویسے ہی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر خدا کے لیے رک جاؤ ریان۔" وہ گر گئی تھی۔ ماسکو کی زوناشے ماسکو کی سرزمین پر گر گئی تھی۔

"رک جاؤ ریان خدا کے لیے۔"

وہ گھٹنوں کے بل گری اسے اپنے سے دور جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھندلا رہا تھا۔ وہ ماتھا زمین پر رکھے بلک بلک کر رو دی تھی۔ اس کا سارا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔ مگر جانے والا چلا گیا تھا۔ اس سے بہت دور...... کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

☆☆☆

وہ برج پر کھڑی دریائے ماسکو کو سکون سے بہتے دیکھ رہی تھی۔ دریا کے اطراف میں لگی سنہری روشنیاں اس کے پانی کو سنہرا بنا رہی تھیں۔ جیسے سنہرے پانی کی کوئی ندی بہہ رہی ہو۔ دریا خاموش تھا۔ بالکل اس کی طرح۔

وہ جو کبھی چپ نہیں رہتی تھی اب مسلسل خاموش رہنے لگی تھی۔

یہ محبت کا روگ ہوتا ہی ایسا ہے۔ چہکتے لوگوں کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹ جاتا ہے۔

اسے بھی اس روگ نے چاٹ لیا تھا جو ریان نے اسے دیا تھا۔ ایک سال گزر چکا تھا۔ اس ایک سال میں اس نے ایک دفعہ بھی زوناشے کا حال نہیں پوچھا تھا۔ وہ اس سے سارے رابطے، سارے رشتے توڑ کر گیا تھا۔

”تم تو سنبھل گئے ریان! لیکن میں ابھی تک نہیں سنبھل پائی۔“ وہ سنہری پانی کو دیکھتے ہوئے بولی جیسے اس سے اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہو۔

”تمہیں سنبھالنے ہی تو آیا ہوں واپس۔“

اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

”میں پاگل ہوگئی ہوں شاید......“ اسے ہر جگہ ریان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ہر چہرے میں اس کا چہرہ نظر آنے لگا تھا اور ہر آنکھیں بھورے رنگ کی لگنے لگی تھیں۔

”وہ تو تم پہلے سے ہی تھیں۔“

”خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے۔“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھی۔

”تم چپ رہو گی تو میں فائدہ اٹھاتے ہوئے ضرور بولوں گا۔“

”تم سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ بچا ہے میرے پاس کہ میں اس پانی میں کود کر اپنی جان دے دوں۔“ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

”میں تمہیں بچا لوں گا۔“

”کاش تم مجھے مرتے دیکھ سکتے ریان۔“

”ریان تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا زوناشے۔ تمہارے مرنے سے پہلے وہ خود مر جائے گا۔“

اب کی بار زوناشے کرب کی انتہا پر پاگلوں کی طرح ہنس دی تھی اور پھر ہنستی ہی رہی۔

”مر تو میں اسی دن گئی تھی جس دن ریان مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔ اب تو صرف روح کو جسم کی اذیت سے آزاد کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ برج پر لگے حفاظتی جنگلے پر کھڑی ہو گئی۔

وہ اس اذیت سے نجات پانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

وہ آخری بار ماسکو کو دیکھ رہی تھی۔ ریان کے ساتھ گزرا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا تھا۔

”چلو ایک ساتھ ہی جان دیتے ہیں زوناشے۔“ کوئی اس کے ساتھ جنگلے پر کھڑا ہوا تھا۔ زوناشے کا سرد ہاتھ اس کے گرم ہاتھ میں تھا۔

اس نے پہلو میں دیکھا تو وہاں ریان کھڑا تھا۔ اس کے قریب اس کا ہاتھ تھامے ہوئے۔

”یہ وہم میری جان نہیں چھوڑے گا۔“ وہ یہ کہہ کر کودنے لگی تھی لیکن وہم نے اس کی جان بچا لی تھا۔ ریان وہم نہیں تھا۔ وہ واقعی وہاں موجود تھا۔

زوناشے سانس لینا بھول گئی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ اگر تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں تو میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں؟“ نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے اس نے زوناشے کو جنگلے سے نیچے اتارا۔

”میں نے ایک سال کوشش کی کہ تمہارے بغیر رہنا سیکھ لوں لیکن میں ناکام رہا زوناشے...... بھلا جسم بھی روح کے بغیر زندہ رہتا ہے...... میری روح تو ادھر تھی ماسکو میں۔ تو میرا جسم وہاں امریکا میں کیسے

زندگی کی رمق محسوس کرسکتا تھا۔ "اگر ریان دل ہے تو زوناشے اس کی دھڑکن۔ دھڑکن کے بغیر تو دل ناکارہ ہوتا ہے...... ہے نا زوناشے؟" اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ اب کی بار دھیرے سے مسکرایا تھا۔ "میں غلط تھا زوناشے! اپنی ماں کے بارے میں بھی اور تمہارے بارے میں بھی۔ اور میں وہ غلطی نہیں دہرانا چاہتا جو میرے باپ نے میری ماں کو چھوڑ کر کی تھی۔"

دریا بہہ رہا تھا بالکل زوناشے کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی طرح۔

"مجھے آج یہ اعتراف کرنے دو کہ مجھے تم سے پہلی نظر میں ہی محبت ہوگئی تھی۔ میں ہر اس جگہ جاتا جہاں تم ہوتی تھیں اور پھر میں نے اپنی سیکرٹری سے تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کروائیں اور تمہاری کمپنی کو فورس کیا کہ وہ صرف تمہیں ہی میرے ساتھ ٹور پر بھیجیں۔"

وہ اپنے اس اعتراف پر بالکل بھی شرمندہ نہیں تھا۔

"ماما کے جانے کے بعد میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ مگر تمہارے ساتھ سے میں سنبھلنے لگا۔ زندگی کی طرف واپس آنے لگا۔ میں تم سے اعتراف کرنا چاہتا تھا لیکن......" وہ پھر خاموش ہوگیا۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تم بھی مجھے چھوڑ کر نہ چلی جاؤ۔ میں غلط تھا زوناشے! اور اس سب کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں زوناشے۔"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کانوں کو پکڑتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔

"بہت برا ہوں نا میں، دعا کرو میری تم سے شادی ہوجائے۔" وہ شرارت سے بولا۔

"کبھی وقت ملے تو اس دریا میں کود کر مرجانا۔" پاؤں پٹختی ہوئی وہ برج پر چل دی۔

"مجھے پتا ہے کہ تم مجھے مرنے نہیں دو گی۔" اسے زوناشے پہ یقین تھا۔

"غلط فہمی ہے تمہیں۔" وہ بھاگ رہی تھی جیسے ریان اس رات بھاگ رہا تھا۔ وہ رات ہجر کی رات تھی۔

"اچھا رکو تو سہی۔" وہ چلایا۔ مگر وہ نہیں رکی۔

یہ رات ملن کی رات تھی۔

"زوناشے! میری بات تو سنو۔" وہ بھی بھاگ رہا تھا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔

"کیا تم میرے ساتھ پوری دنیا کے ٹور پر مسز ریان بن کر جانا پسند کروگی؟" سنہرا پانی اس خوب صورت پرپوزل پر مسکرادیا تھا۔

زوناشے یک دم پلٹی۔ پیچھے ریان ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ زوناشے اسے جیب سے ایک چھوٹی سے ڈبیا نکالتے دیکھ رہی تھی۔

"کیا تم ریان کے ساتھ اس خوب صورت دنیا کا چپا چپا دیکھنا پسند کروگی؟" انگوٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ امید سے گویا ہوا۔

"ہاں مجھے یہ اندھا بندر قبول ہے۔" وہ شرارت سے بولی اور اپنا ہاتھ ریان کی طرف بڑھا دیا۔

"تھینک یو سو مچ زوناشے۔" اس نے انگوٹھی اس کی انگلی کے سپرد ہمیشہ کے لیے کردی۔

"زوناشے کی آنکھیں اپنے ہاتھ میں اس کے نام کی انگوٹھی دیکھ کر بھر آئی تھیں۔ اب کی بار یہ آنسو خوشی کے تھے۔ محبت پالینے کے تھے۔

ریان مسکرادیا اور اس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا کہ اب تو ساری زندگی وہ یونہی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلنے والے تھے۔ تاروں بھری رات ان کے ملن پر خوش تھی۔

ماسکو خوش تھا۔

بہتا سنہری پانی خوش تھا کہ ماسکو محبت کرنے والوں کا ملاپ یونہی کرواتا ہے۔

☆☆

حوریہ بتول

زندگی کے رنگ

"مسز اسفند! آج آپ سرخ رنگ کا لباس زیب تن کیجیے۔"

اریجہ الماری کھولے پر سوچ چہرہ لیے رنگ برنگے ملبوسات پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ اسفند جو اس کے بالکل پیچھے کھڑا ریڈ کلر کے خوب صورت جوڑے کو پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہنسنے پر خفا ہوا۔ اریجہ کا رخ اپنی طرف موڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟" شوہر کے انداز پر وہ گھبرا گئی۔

"نہیں۔ میں تو بس آپ کے انداز پہ ہنس رہی تھی۔" اریجہ نے ہکلاتے ہوئے بمشکل بات پوری کی اور کن انکھیوں سے اسفند کی طرف دیکھا۔

نیا نیا ساتھ تھا۔ شادی کے پندرہ دنوں میں وہ ابھی تک اسفند کے مزاج کو پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی۔ اس لیے پریشان ہو گئی۔

ابھی وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخ رہی تھی کہ اسفند کا قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ قہقہے پر اریجہ نے حیران نظریں شوہر پر جمائیں۔ اسفند نے اس کے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے شوخ ہو کر کہا۔

"ارے بیگم صاحبہ! آپ تو اتنی سی بات پر گھبرا گئیں۔ میں جسٹ مذاق کر رہا تھا۔"

اریجہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اور دل ہی دل میں ندا آپی کو داد دیتے ہوئے وہ جوڑا فائنل کیا۔ سرخ رنگ پر سلور نگوں کا ہلکا پھلکا کام بہت جچ رہا تھا۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود آپی نے بہت پیار سے یہ رنگ دلوایا تھا۔ وہ تو اسکن رنگ لینے پر بضد تھی۔

"اریجہ! تم پر یہ رنگ بہت جچے گا۔" آپی کے پیار بھرے اصرار پر اس نے دکھی دل سے اسکن جوڑے کو الوداع کہہ کر یہ سوٹ لے تو لیا تھا پر دل میں سوچ رہی تھی کہ میں یہ سوٹ کبھی نہیں پہنوں گی۔ اتنا بھڑکیلا رنگ۔

عورت کو چاہیے کیا ہوتا ہے۔ عزت کی خوشبو میں رچے چند محبت بھرے لفظ۔ جو ایک خوش گوار زندگی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

شوہر کی فرمائش پر وہ پھولے نہ سما رہی تھی۔ پہلی بار دل تیار ہونے کو مچلنے لگا۔ ورنہ تو اسے ہمیشہ سے میک اپ سے چڑ تھی۔ اس کا بس ہوتا تو شادی والے دن بھی دھلے منہ بیٹھ جاتی۔ مگر آج کسی کی محبت ہمراہ تھی تو ہر چیز دل کو بھا رہی تھی۔

"اچھا۔ اب آپ بھی جلدی سے تیار ہو جائیں سب ویٹ کر رہے ہوں گے۔"

وہ دونوں ہنستے مسکراتے کمرے سے نکلے۔ سامنے ہی برآمدے میں زاہدہ بیگم اور عائشہ پتا نہیں کون سی گتھیاں سلجھاتی نظر آئیں۔ بھائی اور بھابھی کو ایک ساتھ آتے دیکھ کر عائشہ نے تیوری چڑھا کر ماں کو اشارہ کیا اور اپنے فون میں مگن ہو گئی۔

زاہدہ بیگم، بہو اور بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولیں۔

"میرے چاند اور سورج کی جوڑی کہاں جا رہی ہے؟ ماں کے پاس بھی چار گھڑی بیٹھ جایا کرو یا ماں بہن خالی گھر کی دیواریں تکنے کو ہیں۔" آخر میں کیے گئے طنز پر اسفند جی بھر کر شرمندہ ہوا۔

"وہ امی...... آج اریحہ کے بھائی کی منگنی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے۔ بس وہیں جا رہے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ صرف آج کی بات ہے۔ اس کے بعد سارا ٹائم آپ کا ہے۔" اسفند نے پیار سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"خیر سے جاؤ۔" زاہدہ بیگم نے بہو کو نظر انداز کرتے ہوئے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر بہو کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا۔ یہ تم نے کیسا تیز رنگ پہن رکھا ہے۔ تمہاری سانولی رنگت پر ذرا نہیں جچ رہا۔"

اریحہ گڑبڑا گئی۔

"وہ امی...... اسفند......"

ابھی لفظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اسفند نے اچک لیے۔

"امی میں نے تو منع بھی کیا تھا۔ اریحہ کو یہ رنگ نہ پہنو۔ لیکن اس نے کہا میری آپی نے کہا تھا یہ ڈریس پہن کر آنا۔ میں چپ ہو گیا۔ آپ ہی کہتی ہیں کسی کی ذات پر مسلط نہیں ہونا چاہیے۔"

اسفند کی بات پر اریحہ ہونق بنی اس کی طرف اور کبھی عائشہ کے مسکراتے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو کہہ رہی تھی۔

"بھابھی کا فیشن سینس بالکل اچھا نہیں ہے۔ مجھے تو ان کا برائڈل ڈریس دیکھ کر ہی پتا چل گیا تھا۔"

اس سے پہلے کہ اریحہ کوئی جواب دیتی۔ اسفند بولا۔

"جلدی چلو اریحہ! دیر ہو جائے گی۔ مجھے آ کر ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ماں کو خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ناچار وہ بھی پیچھے ہو لی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسفند رومانٹک انداز میں بولا۔

"تم اپنی امی کے ہاں ذرا کم ہی کھانا۔ واپسی پر ہم پیزا ہٹ چلیں گے۔"

اریحہ اس پل پل بدلتے روپ کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ ابھی کس قدر بے رخی سے وہ ماں اور بہن کے سامنے بات کر رہا تھا۔ اور اب باہر آتے ہی محبت جھاڑو لگا رہا تھا۔ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"اگر مجھ پر یہ رنگ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آپ بلا جھجک بتا دیتے اور اگر اچھا لگ رہا ہے تو آپ نے امی سے جھوٹ کیوں کہا؟"

اسفند اس کی خفگی کا اثر لیے بغیر ہنستے ہوئے بولا۔

"تم بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو اس رنگ میں۔ اب میں ماں اور بہن کے سامنے تمہاری شان میں قصیدے پڑھتا اچھا لگوں گا کیا؟"

"لیکن اسفند! میں آپ کی بیوی ہوں، گرل فرینڈ نہیں۔ جو آپ کو میری تعریف کرنے میں شرم آئے۔"

"اچھا نا چھوڑو ان باتوں کو، بتاؤ کون سا سونگ سنو گی؟"

"جو مرضی لگا لیں۔" اریحہ بے دلی سے کہہ کر اپنی چوڑیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ جو مرد دوسروں کے سامنے اس کی ذات کا دفاع نہیں کر سکتا۔ اس کے بند کمرے میں کیے گئے وعدے بیکار ہیں۔

☆☆☆

بظاہر تو سب ٹھیک تھا۔ بہت پیار کرنے والا شوہر، دس مرلے پر جدید طرز کا بنا گھر، پیسے کی ریل پیل اور تین بندوں پہ مشتمل مختصر سسرال۔ سب اس کی قسمت پر رشک کرتے۔ بہت عبادت گزار اور پیار کرنے والی ساس، عزت کرنے والی نند، ہر وقت محبت نچھاور کرنے والا شوہر۔

"اریحہ کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔"

ہر کسی سے جب وہ یہ سنتی تو کوئی جواب نہ دیتی۔ بس مسکراتی رہتی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی جیسا ہے ویسا نظر نہیں آتا۔

چلو عزت کا بھرم تو ہے نا اتنا ہی کافی

چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکوے کرنا اس کی کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس بھرم میں خوش رہنے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

"بھابھی۔ کم سے کم کھانا تو اچھا بنا لیا کریں۔" پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی اس کی نند عائشہ بدتمیزی سے بولی۔ تین گھنٹوں کی محنت سے بنائے گئے اس لذیذ کھانے پر عائشہ کی بدتمیزی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"عائشہ کتنی بار تجھے کہا ہے۔ اپنی پڑھائی سے وقت نکال کر خود کھانا بنایا کر۔" زاہدہ بیگم کے ناگواری سے کہنے پر اسفند ہنستے ہوئے بولا۔

"امی! آپ عائشہ کو چھوڑیں اپنی بہو کو کھانا بنانا سکھائیں۔" بریانی کی تیسری پلیٹ کھاتے اسفند کی بات پر اریحہ کا دل چیخ چیخ کر رونے کو کر رہا تھا۔ لیکن وہ ایسے سکون سے کھانا کھا رہی تھی جیسے اس کی نہیں کسی اور کی بات ہو رہی ہو۔ کیونکہ یہ روز کا معمول تھا۔

"آج صفائی ٹھیک سے نہیں ہوئی۔ سالن صحیح نہیں بنا۔ روٹی پر روپ نہیں ہے۔ یہ برتن کیسے دھوئے تم نے؟ تمہاری پسند تو بالکل اچھی نہیں۔ کوڑا پسند کرتی ہو۔ تمہیں خود کچھ نہیں آتا۔ تو بچوں کو کیا سکھاؤ گی؟ تمہارا رنگ کیسا عجیب ہے اور بال تو بالکل اچھے نہیں۔"

یہ وہ سارے جملے تھے جو سارا سارا دن کام میں جتے ہوئے اس کے کانوں میں ڈالے جاتے تھے۔ یہ سب تو جیسے تیسے وہ برداشت کر لیتی۔ لیکن اسفند کا دہرا رویہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

اسفند کی عادت تھی۔ کمرے میں وہ اس کی تعریفیں کرتا اور سب کے سامنے تضحیک کرتا۔ کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا اس کی ماں اور بہن اس سے بدگمان ہوں۔ مرد جب عزت نہ دے تو اس کی محبت میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر وہ محبت خوشی نہیں غم بن جاتی ہے۔

اسفند کی محبت میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ کیوں کہ وہ محبت کو بس خود تک محدود رکھتا تھا۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ وہ خود تو اسے کچھ نہ کہتا لیکن اس کی ماں بہن چاہے اس کی روح کو تار تار کریں یا کردار کے پرخچے اڑائیں۔ وہ ہنس کر کہہ دیتا۔

"میں تو تم سے محبت کرتا ہوں نا۔ اریحہ کیا تمہارے لیے میری محبت کافی نہیں ہے۔"

جب تک اس سے برداشت ہوا، چپ چاپ سہتی رہی۔ لیکن صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ حد ختم ہوئی تو محبت بھی اسے پابند نہ کر سکی۔

"جب اسفند مجھے اپنے گھر میں عزت نہیں دلوا سکتے تو میں کیوں یہاں رہوں؟"

وہ ناراض ہو کر میکے آ گئی۔ سب حیران تھے۔

"اریحہ! آخر کیا کمی ہے؟ اتنا محبت کرنے والا شوہر پیار کرنے والا سسرال ہے۔" امی کے حیرانی سے کہنے پر اس نے زخمی نظروں سے دیکھا اور بہتے آنسوؤں سے ایک ایک بات سناتی چلی گئی۔

صالحہ بیگم نے محبت سے بیٹی کا ہاتھ تھاما۔

"میری بچی ہمت نہیں ہارتے۔ ان سب چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھو اور دوسرے پلڑے میں اپنے اس بھرم کو جو سب لوگوں میں تمہیں ممتاز رکھتا ہے۔ سب تم پر رشک کرتے ہیں۔ ہر ماں اپنی بیٹی کے لیے تم جیسا سسرال ملنے کی دعا کرتی ہے۔ اگر تم اس بھرم کو قائم رکھنا سیکھ لو گی۔ کبھی حقیقی خوشی سے نا آشنا نہیں رہو گی۔ لیکن اگر تم ان باتوں کی وجہ سے گھر آ بیٹھو گی۔ سب تمہیں ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی۔ شوہر سب کے سامنے تعریف نہیں کرتا۔ کس کس کو جواب دیتی پھرو گی۔ کیوں تم خود ہی اپنا بھرم کھو کر ذلت میں قدم رکھنا چاہ رہی ہو۔"

"امی! شوہر بھلے سے سب کے سامنے تعریف نہ کرے پر رسوا بھی نہ کرے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"دیکھو میری جان!" صالحہ بیگم نے پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔ "بیٹا! اگر ہم ایک ہی الجھن میں خود کو قید کر لیں۔ کبھی کوئی خوشی محسوس نہ کر سکیں۔ یہ نئی زندگی کے رنگ ہیں۔ اس کو خود پر حاوی کرنے

کے بجائے بدلنے کی کوشش کرو۔"

اریحہ سوچ رہی تھی۔ عزت نفس کو مار کر جینا سب سے دشوار ہے اور امی کہہ رہی ہیں یہ چھوٹی سی بات ہے۔ لوگ یہ کہیں گے لوگ وہ کہیں گے۔ زندگی میری جہنم بنی ہوئی ہے۔ اور امی کو لوگوں کی پڑی ہوئی ہے۔

"میری بیٹی ضرور میری بات سمجھے گی۔" صالحہ بیگم کے مان سے کہنے پر اریحہ نے آخری حد تک اپنا صبر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اب جو خدا کو منظور یہ سوچ کر اریحہ نے سسرال میں قدم رکھا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ صبر کی انگلی پکڑ کے ہم
اتنا چلے کہ راستے حیران رہ گئے

شادی سے پہلے ذرا سا دل دکھنے پر گھنٹوں رونے والی نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ ماں باپ کو اس کی وجہ سے پریشانی نہ ہو۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہر بات دل میں قبر بنا کر دفنانی شروع کر دی۔ دل دکھانے والی باتوں پر دکھے دل اور نم آنکھوں کے ساتھ "ان اللہ مع الصابرین" کا ورد اسے اللہ کے قریب کرتا گیا۔

وقت نے پلٹا کھایا اور سب غم، تکلیفیں صبر کے آنسوؤں میں بہہ کر بہت دور نکل گئیں۔ کل تک جو زبر تھا۔ آج وہ زیر ہے۔ اور جو زیر تھا، وہ زبر ہے۔ آج پورے گھر پر اس کا کنٹرول تھا۔

اسفند جو ماں بہن کو خوش کرنے کے واسطے اس کی ہر تذلیل پر چپ رہتا تھا۔ آج برملا سب کے سامنے اس کا دفاع کرتا۔

عائشہ کی شادی ملتان میں ہو گئی۔ اس لیے اس کا آئے دن لاہور آنا ممکن نہ رہا۔ زاہدہ بیگم کے سارے دم خم فالج نے ختم کر دیے۔ لیکن وہ سب شکوے بھلا کر ان کا خیال ماں کی طرح رکھتی ہوں۔

اس نے سب کو معاف کر دیا بس وہ اسفند کو معاف نہ کر پا رہی تھی۔ زاہدہ بیگم کا بھرپور خیال رکھتی۔ لیکن اسفند سے کٹی کٹی پھرتی۔

"میں نے آج امی کے گھر جانا ہے۔" آفس کے لیے تیار ہوتے اسفند کو اس نے سرسری سے انداز میں بتایا۔

"میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

اسفند کی آفر پر اریحہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے حسن کو کہہ دیا تھا۔"

اسفند کے خود پر پرفیوم کا اسپرے کرتا ہاتھ لمحے بھر کر رکا۔ اس نے سر جھٹک کر پرفیوم رکھا۔ اور آہستہ سے چلتا ہوا آ کر اریحہ کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

اریحہ نظریں چرا کر اٹھنے لگی۔

"میں امی سے ناشتے کا پوچھ لوں۔"

"بیٹھو تم یہاں، آرام سے۔" اسفند نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور خود دوزانوں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اریحہ! تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟"

اریحہ نے ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اسفند نے ٹوک دیا۔

"چپ کرو۔ میں جانتا ہوں یہ ہی کہو گی، میں ناراض نہیں ہوں۔ اریحہ! مجھے ناراضی تمہاری آنکھوں میں لکھی نظر آتی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ میری غلطی رہی ہے۔ میں نے تمہارے احساسات کو روندا ہے۔ بس ہمیشہ اپنی نام نہاد محبت میں قید کر کے رکھا۔ جہاں تمہیں عزت دینی تھی وہاں بھی محبت کے راگ الاپتا رہا۔ روٹھنے منانے کا عمل رک جائے تو محبت کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اریحہ میری محبت زنگ آلود ہو رہی ہے۔ جو میں برداشت نہیں کر پا رہا۔"

جب لفظ خود گواہی دیں نا تو مان جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اسفند کے کرب اور پشیمانی کی گواہی اس کے ہر لفظ سے عیاں تھی۔

اریحہ نے لفظوں کو بھی مات دیتے ہوئے، بہت چاہت سے اپنا سر اسفند کے کاندھے پر ٹکا دیا۔ دونوں کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ پر "لفظ" محبت کے ملن پر نازاں پلٹ گئے۔

☆☆

شعاع عنبریں

کرن کرن خوشبو

فرمان الٰہی

☆اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کو ہم اکٹھا کریں گے۔ ان میں سے ایک بھی باقی نہ چھوڑیں گے اور سب کے سب تیرے رب کے سامنے صف بستہ حاضر کیے جائیں گے یقیناً تم ہمارے پاس اس طرح آئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ لیکن تم تو اس خیال میں رہے کہ ہم ہرگز تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر کریں گے بھی نہیں (سورہ کہف 48-47)

سعدیہ وحید سعدی۔ اسلام آباد

منافقانہ خصلتیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ چار خصلتیں ہیں جس میں وہ چار ہوں وہ خالص منافق ہوگا اور جس مین ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک اس کو چھوڑ نہ دے۔ (وہ خصلتیں یہ ہیں) جب اس کو امانت دی جائے خواہ مال ہو یا کوئی بات ہو، وہ خیانت کرے اور جب بات کہے جھوٹ بولے اور جب عہد کرے اس کو توڑ ڈالے اور جب کسی سے جھگڑے تو گالیاں دینے لگے۔ (بخاری مسلم)

اسلامی معلومات

☆حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حنظلہ بن ابی عامر الثقفی کو فرشتوں نے غسل دیا۔

☆حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے سجدہ حضرت جبریل علیہ السلام نے پھر حضرت میکاعیل علیہ السلام نے پھر حضرت عزرائیل علیہ السلام نے پھر فرشتوں نے کیا۔

☆جس طرح زمین پر انسانوں کا قبلہ "کعبہ" ہے اسی طرح آسمان پر فرشتوں کا قبلہ "عرش" ہے۔

☆سب سے پہلے خانہ کعبہ کا طواف فرشتوں نے کیا۔

شکیلہ سہیل ..... ملکوال

لوح مزار پر تحریر اشعار

حفیظ ہوشیار پوری:-

سوئیں گے حشر تک کہ سبک دوش ہو گئے
بار امانت غمِ ہستی اتار کے

سلیم احمد:-

اک پتنگے نے یہ اپنے رقص آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے، روشنی بن جائیے

سراج الدین ظفر:-

ظفر سے دور نہیں ہے کہ یہ گدائے الست
زمین پہ سوئے تو اورنگِ کہکشاں اٹھے

قمر جلالوی:-

ابھی باقی ہیں پتوں پر جلے تنکوں کی تحریریں
یہ وہ تاریخ ہے، بجلی گری تھی جب گلستاں پر

اطہر نفیس:-

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں، کوئی قہر نہیں، پھر سچا شعر سنائیں کیا

اقراء سرور ..... ڈی جی خان

میاں بیوی

بیوی میکے گئی شوہر اس وقت کام پر تھا جب گھر پہنچا تو یہ نوٹ ٹی وی پر چسپاں ملا۔

امی کے گھر جا رہی ہوں بچوں کو لے کر۔ نیچے کی باتوں پر احتیاط سے عمل کرنا۔

1- دوستوں کو گھر بلا کر کباڑ خانہ مت بنا دینا۔ پچھلی بار چھت بہت گندی ملی تھی۔

2- کھانا گھر میں بنا لینا یا ہوٹل سے کھا کر آ جانا باہر سے لا لا کر ہر کسی کو گھر میں مت کھلانا، پچھلی بار صوفے کے نیچے چار پیزوں کا بل ملا تھا۔

3- چشمہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس رکھنا۔ پچھلی بار فریج میں ملا تھا۔

4- کام والی کی تنخواہ دے چکی ہوں بلاوجہ احسان جتانے کی ضرورت نہیں۔

5- صبح صبح اٹھ کر پڑوسن کو جگا جگا کے ''اخبار آیا کہ نہیں'' یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اخبار اور اخبار والا ان سے مختلف ہے۔ دودھ والا اور دھوبی بھی۔

6- تمہارے بنیان الماری کے نیچے کے خانوں میں ہیں اور بچوں کے اوپر کے خانے میں رکھے ہوتے ہیں۔ پچھلی بار کی طرح بچوں کے پہن کے مت چلے جانا۔

7- تمہاری ساری رپورٹس نارمل ہیں۔ بار بار اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔

8- میری بہن اور بھابھی کی سالگرہ گزشتہ ماہ ہی ہو گئی ہے۔ رات کو فون کر کے ان کو وش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

9- وائی فائی کا پاس ورڈ تبدیل کر دیا ہے رات کو جلدی سو جانا۔

10- زیادہ خوش ہونے اور اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میری ساری سہیلیاں بھی اپنے اپنے میکے جانے والی ہیں۔

11- شکر، پتی، کافی مانگنے کے بجائے اس کلموہی پڑوسن کے گھر بار بار جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ساری چیزیں لا کر رکھ دی ہیں۔

12- اوور اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرنا، میں کسی بھی وقت واپس آ سکتی ہوں۔

(حریم سلمان ...... کراچی)

داڑھی

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حکومت کا کوئی ملازم داڑھی رکھنا چاہے تو اس کی پیشگی اجازت لینے کے لیے باقاعدہ درخواست دینی پڑے کہ عالی جاہ! اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ گویا داڑھی نہ ہوئی اسلحہ ہو گیا جس کے لیے لائسنس کی ضرورت ہے۔

صاحبو! سابق شاہ ایران کے عہد میں یہ قانون نافذ تھا وہاں حکومت وقت کے ملازمین کو اجازت حاصل کیے بغیر داڑھی رکھنے کی ممانعت تھی۔

(افضل علوی کی کتاب۔ دیکھ لیا ایران سے)

لاش کی چوری

دنیا کے پہلے ہر دل عزیز عالمی شہرت یافتہ اسٹار چارلی چیپلن کی شاندار صحت ان کی آخری فلم ''اے کاؤنٹیس فرام ہانگ کانگ'' کی تکمیل کے بعد 1960ء کی دہائی کے اواخر میں گرنے لگی اور 1972ء میں انہیں اکیڈمی ایوارڈ ملنے کے بعد اس میں تیزی آ گئی اور 1977ء تک انہیں بولنے اور چلنے پھرنے میں مشکل ہونے لگی اور انہوں نے وہیل چیئر کا استعمال شروع کر دیا۔ اپنی عمر کے آخری ایام انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں جنیوا لیک کے کنارے گزارے۔ پچیس دسمبر کو پوری دنیا میں موجود مسیحی برادری جب کرسمس کی خوشیاں منا رہی تھی بدقسمتی اسی دن اس عظیم فنکار کا بلاوا آ گیا۔ چارلی چیپلن کے بستر مرگ کے قریب بیٹھے پادری نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا کہ ''خداوند۔ آپ کی روح پر رحم فرمائے'' تو اس پر چارلی چیپلن نے جواب دیا جو ان کے آخری الفاظ بھی تھے۔

''کیوں نہیں یہ روح اس کی تو ہے۔''

چارلی چیپلن کو کورسیئر سر ویوی قبرستان واوڈ، سوئٹزرلینڈ میں دفن کیا گیا۔

یکم مارچ 1978ء کو سوئٹزرلینڈ میں جنیوا لیک کے مقام پر دو اغوا کاروں نے چارلی چیپلن کی لاش چرا لی اور واپس کرنے کے بدلے چھ لاکھ سوئس فرانک طلب کیے۔ پولیس کی مسلسل کوششوں سے یہ سازش ناکام ہو گئی اور چارلی چیپلن کی لاش کو گیارہ ہفتوں بعد برآمد کر لیا گیا اور پھر اس کو دوسری جگہ گہری قبر میں دفنایا گیا۔ اور قبر پر چھ فٹ موٹی کنکریٹ کی تہ ڈال دی گئی تاکہ مستقبل میں کوئی دوبارہ ایسی کوشش نہ

کرے۔

صدف سمیع۔ کراچی

افکار شیکسپیئر

☆ جو غم ماضی بن چکا ہے اس پر افسردہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک نئے غم کو دعوت دے رہے ہیں۔

☆ کنواری لڑکی کی زبان نہیں خیالات ہوتے ہیں۔

☆ محبت بالآخر ہر چیز کو فتح کر لیتی ہے آؤ ہم بھی اس کے آگے ہار مان لیں۔

☆ کوئی فلاسفر ایسا نہیں گزرا جو دانت کے درد کی شدت کو صبر سے برداشت کر سکے۔

☆ نافرمان بیٹے کا وجود زہریلے سانپ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔

فضہ نور۔ روہڑی

بدنامی

مشہور محقق اور عالم مولانا محمود شیرانی حیدر آباد دکن گئے۔ ایک تقریب میں ایک صاحب نے ان سے کہا:

"شیرانی صاحب! آپ کی ایک نظم مجھے بہت پسند ہے۔"

"کون سی نظم بھائی!" مولانا نے استفسار کیا۔

"وہی جس کا مصرعہ ہے

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں۔"

مولانا نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔

"یہ نظم میری نہیں، میرے نالائق بیٹے اختر شیرانی کی ہے۔ وہ تو محض بدنام ہو رہا ہے میں اس کے کرتوت سے رسوا ہو رہا ہوں۔"

ادیبہ......لاٹھیہ والا

تعجب ہے......

☆ اس پر جو اللہ تعالیٰ کو برحق جانتا ہے پھر بھی غیروں سے مانگتا ہے۔

☆ اس پر جو دنیا کو فانی جانتا ہے پھر بھی دنیا سے محبت کرتا ہے۔

☆ اس پر جو تقدیر کو پہچانتا ہے پھر بھی جانے والی چیز کا غم کرتا ہے۔

☆ جو شیطان کو دشمن سمجھتا۔ پھر بھی اس کی اطاعت کرتا ہے۔

☆ جو جنت پر یقین رکھتا ہے پھر بھی دنیا کے ساتھ آرام پکڑتا ہے۔

زرینہ خانم لغاری۔ مظفر گڑھ

ملا نصیر الدین اور مرغی

ایک دفعہ ملا نصیر الدین نے دیکھا کہ بازار میں ایک جگہ بھیڑ لگی ہوئی ہے اور طوطے کا مول تول ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ طوطا مہنگے داموں فروخت ہو گیا۔

ملا نے جانوروں اور پرندوں کی یہ آؤ بھگت دیکھی تو دوسرے دن اپنی مرغی لے کر اسی بازار میں جا کھڑے ہوئے کسی نے ان کی مرغی کی قیمت زیادہ نہ لگائی۔ ملا ناراض ہوئے اور بلند آواز میں کہنے لگے۔

"کل ایک معمولی قدر و قیمت اور ہلکے وزن کا طوطا میری مرغی سے کئی گنا زیادہ قیمت میں خریدا گیا اور میری مرغی کی یہ بے توقیری۔"

کسی نے کہا۔ "ملا جی، وہ طوطا بولتا تھا۔"

ملا نے جھٹ جواب دیا۔ "تو کیا ہوا؟ میری مرغی کی خوبی یہ ہے کہ یہ سوچتی ہے۔"

حریم سمان۔ کراچی

روٹی

میں ٹھنڈے توے کی روٹی ہوں
مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
مجھے بے دردی سے پلٹا گیا
میرے کتنے ٹکرے اکھڑ گئے
میں ٹھیک سے سینکی جا نہ سکی
میں کسی چنگیر میں آ نہ سکی
میرا پسینا، گندھنا اور جلنا
بے کار گیا، میں ہار گئی
اک بے دھیانی مجھے مار گئی

سعد وحید سعدی۔ اسلام آباد

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

ماریہ نذیر، کی ڈائری میں تحریر

ساغر صدیقی کی غزل

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

جی میں آتا ہے الٹ دیں ان کے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

اب تو مدت سے رہ و رسم نظارہ بند ہے
اب تو ان کا طور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقام خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہائے یہ بیگانگی اپنی نہیں مجھ کو خبر
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

بارہا دیکھا ہے ساغر رہ گزار عشق میں
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں

افشاں سمیع، کی ڈائری میں تحریر

حفیظ جالندھری کی غزل

ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکو اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونق بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے انہیں سنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اقرا سرور، کی ڈائری میں تحریر

نصیر الدین نصیر کی غزل

ان کے انداز کرم ان پہ وہ آنا دل کا
ہائے وہ وقت، وہ باتیں، وہ زمانہ دل کا

نہ سنا اس نے توجہ سے فسانہ دل کا
زندگی گزری مگر درد نہ جانا دل کا

وہ محبت کی شروعات، وہ بے تحاشا خوشی
دیکھ کر ان کو وہ پھولے نہ سمانا دل کا

ایک تو میرے مقدر کو بگاڑا اس نے
اور پھر اس پہ غضب ہنس کے بنانا دل کا

میرے پہلو میں نہیں، آپ کی مٹھی میں نہیں
بے ٹھکانے ہے بہت دن سے ٹھکانا دل کا

وہ بھی اپنے نہ ہوئے، دل بھی گیا ہاتھوں سے
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا دل کا

بے جھجک آ کے ملو، ہنس کے ملاؤ آنکھیں
آؤ ہم تم کو سکھاتے ہیں ملانا دل کا

نقش بر آب نہیں، وہم نہیں، خواب نہیں
اب کیوں کھیل سمجھتے ہیں مٹانا دل کا

حریم سلمان کی ڈائری میں تحریر

مصطفیٰ زیدی کی نظم

آخری بار ملو

آخری بار ملو ایسے کہ جلتے ہوئے دل
راکھ ہو جائیں کوئی اور تمنا نہ کریں
چاکِ وعدہ نہ سلے، زخمِ تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے، شمع کی لو نہ ہلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے انہیں آ کر گن جائیں
آنکھ اٹھائے کوئی امید تو آنکھیں چھن جائیں
اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اک اور ملاقات کی صورت نکلے
اب نہ ہیجان و جنوں کا نہ حکایات کا وقت
اب نہ تجدیدِ وفا کا نہ شکایات کا وقت
لٹ گئی شہرِ حوادث میں متاعِ الفاظ
اب جو کہنا ہو تو کیسے کوئی نوحہ کہیے
آج تک تم سے رگِ جاں کا کوئی رشتہ تھا
کل سے جو ہو گا اسے کون سا رشتہ کہیے
پھر نہ دہکیں گے کبھی عارض و رخسار ملو
ماتمی ہیں دمِ رخصت در و دیوار ملو
پھر نہ ہم ہوں گے، نہ اقرار، نہ انکار، ملو
آخری بار ملو

فضہ نورما کی ڈائری میں تحریر

اتباف ابرک کی غزل

کبھی خوابوں پہ مرتا ہوں کبھی تعبیر مارے ہے
کبھی تدبیر سے مرتا ہوں کبھی تقدیر مارے ہے

ہوس ہے میرے اندر کی، جو مجھ کو ہے دغا دیتی
کبھی پانے کی حسرت تو کبھی تسخیر مارے ہے

کبھی سوچوں بھلا ہے یہ، کبھی سوچوں کہ وہ اچھا
انہی سوچوں میں گم اکثر مجھے تاخیر مارے ہے

عجب فطرت ہے انساں کی وہ چاہے جو نہیں ہوتا
کبھی زنداں کی خواہش، کبھی زنجیر مارے ہے

ہے یکتہ یگانہ یہ، نہیں کچھ ہاتھ میں اس کے
کبھی لشکر پہ حاوی ہے، کبھی اک تیر مارے ہے

فنا ہونا ہی قسمت ہے، بدلتا جس کا ناممکن
نہ پیتا زہر جو ظالم اسے اکسیر مارے ہے

کتابوں میں لکھے قصے، بناتے ہیں مجھے فاتح
جو اپنا حال اب دیکھوں تو وہ تحریر مارے ہے

محبت بھی ہے اک پھندا، نہ جس سے کوئی بچ پایا
وہ جو اپنوں سے بچ جائے اسے راہ گیر مارے ہے

ہے جینا شاعروں کا کیا، یہ بھی تو جان رکھ ابرک
کبھی گمنام مرتے ہیں، کبھی تشہیر مارے ہے

سرورق کی شخصیت
ماڈل ---------- سحرش فاطمہ
میک اپ -------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی -------- موسیٰ رضا

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

مرد اور عورت

مرد ایک ایسا مکان ہے جو بار بار اپنے مکین بدلنا چاہتا ہے نت نئے کرائے دار بدل کر اسے مزا آتا ہے۔ وہ پرانے لوگوں سے جلد بیزار ہو جاتا ہے مگر عورت ایک ایسا مکان ہے جو زندگی میں صرف ایک بار آباد ہوتا ہے، ایک ہی بار مکین آتا ہے اور اس میں سما جاتا ہے۔ اگر وہ پہلا مکین چھوڑ کر چل دے تو عورت اپنی مرضی سے آسیب زدہ مکان بن جاتی ہے تاکہ کبھی کوئی دوسرا اس کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ (بشریٰ رحمٰن)

افشاں سمیع...... کراچی

قوم یہود

صاحب یہودی قوم ایسی قوم ہے کہ ہم نے غصے میں بھی یہودیوں کو کبھی گالی نہیں دی۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر انہیں یہودی کہا۔ جرمن اسکول میں اکلوتے یہودی لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے ایک جرمن استاد نے کہا تھا۔

”تم بھی اپنے ہم نسلوں کی طرح لالچی، خود غرض اور دوسروں کی حق تلفی کرنے والے ہو۔ تمہارا باپ تمہاری پڑھائی کے لیے فیس تو ایک طالب علم کی ادا کرتا ہے جبکہ تم پڑھتے تین طالب علموں جتنا ہو۔“

(ڈاکٹر یونس بٹ...... عکس بر عکس)

مدیحہ چوہدری...... گجرات

جوانی کے دن

بات یہ ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ نئی پود پر جوانی آتی تو بزرگ نسل دیوانی ہو جاتی تھی۔ سارے شہر کے لوگ ایک دوسرے کے چال چلن پر پہرا دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

”ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا۔“

بزرگ قدم قدم پر ہماری ناقابلِ استعمال جوانی کی چوکیداری کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہماری لغزشوں اور غلطیوں کو پکڑنے کے لیے اپنا بڑھاپا چوکنے وکٹ کیپر کی طرح حالت رکوع میں گزار دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم جوان کاہے کو ہوئے تھے۔ (مشتاق احمد یوسفی...... آب گم)

ثوبیہ ابوبکر...... ملتان کینٹ

چوطرفہ جھوٹ

اس سماج میں ہماری داہنی طرف بھی جھوٹ ہے اور بائیں طرف بھی، سامنے بھی اور پیچھے بھی جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ جس کے سبب یہ جھلاہٹیں ہیں۔ اور کھوٹ ہی کھوٹ ہے، جس کے باعث یہ جھنجلاہٹیں ہیں۔ جھوٹ کے اس چوطرفہ ہجوم میں اگر تم اپنے سچ کو بچا سکو تو یہ بہت غنیمت ہے۔ پر اس سچ کے ساتھ بڑی اذیتیں ہیں۔ ہجوم میں احساس تنہائی کی اذیتیں اور اذیتوں میں تنہائی کا احساس۔ (جون ایلیا)

حریم سلمان...... کراچی

تغیر و تبدل

ہر شخص کی یہی مجبوری ہے کہ وہ ساری عمر ایک ہی سزا نہیں بھگت سکتا یا ایک ہی خوشی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھانسی کے تختے سے اتر کر بجلی کی کرسی پر بیٹھنا، بجلی کی کرسی سے اٹھ کر صلیب پر چڑھنا، تہ آب ہونا اور مرنا۔ پانی کی گہرائیوں سے نکل کر سرکو ہسار سے چھلانگ لگانا۔ ہم سب ایک کرب سے نکل کر دوسری تکلیف کے حوالے ہونا چاہتے ہیں، ایک خوشی سے منہ موڑ کر دوسری خوشی میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اتنا ہی نیچرل ہے جیسے وہ ایک ٹانگ پر ہمیشہ کے لیے کھڑا نہ رہ سکے۔ (بانو قدسیہ...... راجہ گدھ)

ارم کمال...... فیصل آباد

☆☆

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

ماہ نور انجم......کراچی

کرن کا تازہ شمارہ اس گرم موسم میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی مانند لگا۔ ماڈل گرل کی جیولری بہت پیاری البتہ میک اپ میں وہ بات نہیں تھی۔ ‘‘حمد ونعت’’ سے مستفید ہوتے ہوئے سروے پر پہنچے، جس میں مختلف شعبہ جات سے وابستہ شخصیات کی لاک ڈاؤن کے دوران کی مصروفیات پڑھ کر اچھا لگا۔ ‘‘آئمہ بیگ’’ کا تفصیلی انٹرویو پڑھا، بلاشبہ یہ گائیکی کی دنیا میں ایک خوب صورت اور مدھر اضافہ ہیں۔ ‘‘مقابل ہے آئینہ’’ کے جوابات بھی اچھے تھے۔ کیا ہم بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں...... طریقہ کار؟ سلسلے وار ناولوں میں دونوں ہی کہانیوں نے باندھ رکھا ہے۔ یہ جان کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ اگلے ماہ نگہت عبد اللہ کا ناول اختتام پذیر ہونے والا ہے۔ ‘‘میرے ہم نفس میرے ہم نوا’’ میں آسیہ جی نے کیا ٹوئسٹ ڈالا ہے۔ اب آگے دیکھتے ہیں اور کتنے جھٹکے ملتے ہیں۔ ہاں اس بار احمر کا نیلو کے ساتھ رویہ...... بھئی واہ، کیا بات ہے احمر صاحب۔ دل جیت لیا۔ بے شک محبت کا رنگ عزت کے بغیر پھیکا ہے۔ ‘‘فرح بخاری’’ بھی عمدہ طریقے سے ایک پیچ دار کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ فرح صاحبہ کا خاص شکریہ بھی ادا کرنا ہے کہ اس کہانی کے ذریعے ہم قارئین کو مری کی سیر کروا رہی ہیں۔ کراچی کی گرمی میں مری کی وادیوں کا پڑھ کر ہی ہم خوش ہو لیتے ہیں۔ (ہائے ہم معصوم، قناعت پسند لوگ)۔

قلم اٹھانے پر ‘‘شناسائی’’ نے مجبور کیا۔ بالکل نیا موضوع اور شروع سے آخر تک کہانی پہ گرفت۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین خصوصاً مائیں اپنے بچوں کی وجہ سے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کر لیتی ہیں اور پھر وہی اولاد انہیں پوچھتی تک نہیں۔ ذورین کو دیر سے ہی سہی لیکن اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے منصور نے اپنی زندگی کے کتنے سال ضائع کر دیے اور ردا کا انداز...... اف......! کیا کہنے۔ سدرۃ المنتہیٰ بلاشبہ اس بار ناول ‘‘آف دی منتھ’’ کا ایوارڈ آپ کے ناول کو جاتا ہے۔ ‘‘اے مسیحا دل کے’’ بہت عام سی کہانی تھی۔ ‘‘اسی کلے نیں خراب’’ میں بے چارے غافل کی روداد پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ ارے ارے، آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ ماہ دولت دوسروں کے غم پر خوش ہوتے ہیں، بس وہ تو غافل نے اپنا درد ہی کچھ ایسے سیاق وسباق کے ساتھ بیان کیا کہ...... لیکن ہم نے بھی کہانی ختم کرتے ہی جھٹ سے اس کا نصیب کھلنے کی دعا کر ڈالی (ہی ہی ہی)۔

افسانوں میں ‘‘بھرم’’ سب پر بازی لے گیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

‘‘کرن کتاب’’ میں ‘‘کچن اور آپ، کچھ موتی چنے ہیں’’ لاجواب سلسلے ہیں۔ اس کے علاوہ ‘‘تاریخ کے جھروکوں سے’’ اور ‘‘مسکراتی کرنیں’’ بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ آخر میں سب سے ضروری بات، آپ سے گزشتہ دو سال سے آر جے آصف ملک ریاض کی انٹرویو کی گزارش کر رہے ہیں، جانے آپ کب پوری کریں گی۔

☆ ماہ نور جی! خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ امید ہے کہ آپ ہر ماہ ‘‘ماہنامہ کرن’’ کی کہانیوں کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے آگاہ ضرور کریں گی۔ آر جے آصف کے انٹرویو کی فرمائش پوری کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ مقابل ہے آئینہ کے جوابات آپ ہمیں لکھ کر بھیج دیجیے۔

ساجدہ جاوید سندیلو......ٹنڈو محمد خان

تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے
تو میری سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

ایک سے بڑھ کر ایک ٹائٹل آ رہے ہیں، کیا بات ہے۔ بھئی ہمارا کرن ہی ایسا ہے کیا کہیں۔ خوش گوار موسم، برستی بارش، انجوائے، مزا اور ایسے میں کرن کی آمد۔

''حمد و نعت'' سے دل کو منور کیا۔ ''میری بھی سنیئے'' میں آئمہ نور العین بیگ کی باتیں اچھی لگیں۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں ارم کمال نے واقعی میں کمال کا دھمال کیا۔ کیا خوب صورت جوابات کے ساتھ۔ ''نامے میرے نام'' میں کافی نئی دوستیں آئیں مگر یہ کیا پرانی دوستیں کہاں ہو بھئی۔ جلد آجاؤ۔ آپ کے بنا کرن ادھورا ادھورا لگتا ہے۔

''مسکراتی کرنیں'' میں ''سبق'' مشی خان۔ (بڑا کون) گڑیا راجپوت کے لطیفے پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''کچھ موتی چنے ہیں'' میں ''دیوانہ پن'' ماریہ نذیر اور سب کے انتخاب پسند آئے۔ ہر بار کی طرح ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' میں سب کی شاعری دل لے گئی۔ اس ماہ کا پھل ''کیری'' کے فوائد جان کر خوشی ہوئی، جو مجھے بے حد پسند ہے۔ ''کرن کرن خوشبو'' سب سے خوب صورت سلسلہ ہے۔

اب آتے ہیں ناولز کی طرف۔ میرے فیورٹ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' میں ارسلہ کا ڈھیٹ پن پڑھ کر مسکراتے گئے...... مسکراتے گئے۔ آبص بھائی بھی سوچ میں پڑھ گئے، کیا شے ہے ارسلہ بھی۔ اسے آبص کی ٹانگ کا سن کر بھی ذرا حیرانی نہیں ہوئی۔

''شناسائی'' سدرۃ المنتہیٰ رائٹر کا نام ہی اتنا پیارا لگا مگر کہانی پہلے بور لگی، آگے چل کر کچھ ٹوئسٹ آیا۔ خاص کر ''وہ لائنز''

''کبھی وہ وقت تھا جب ماں باپ بچوں پر بے وجہ بھی گرجتے تھے اور بچے دبک کر کونا پکڑ لیتے تھے اور آج جدید وقت ہے کہ بچوں کے ساتھ تلخ کلامی پر ماں باپ شرمندہ ہو جاتے ہیں۔''

واہ آپی! دل چھو گئی اینڈ اچھا لگا۔

''کنار خواب جو'' فرح بخاری کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت آپی! اب اچھا سا اینڈ نکال ہی لو، ایسا نہ ہو انڈین ڈراموں کی طرح لمبا ہو کر اینڈ برا (انڈین ڈراموں کے تو اینڈ آتے ہی نہیں) ہو جائے۔ فرح بھٹو کا ناول ''اے مسیحا دل کے'' ابھی شروع کیا ہے، پورا نہیں پڑھا تو تبصرہ بھی نہیں کروں گی۔ افسانے سب بیسٹ تھے۔ خاص کر ''آیو'' حمیرا عروش نے واقعی کمال لکھا تھا۔ ایسی بھی نندیں ہوتی ہیں جو بھائی کا آنگن سونا کر کے پودا اپنے ساتھ لے جا کر زہر کا پانی پلاتی ہیں۔ ویسے ان لوگوں کو اپنا بیٹا نہیں دینا چاہیے تھا اور وہ بھی تب جب اس کی شادی ہو چکی تھی۔

''آواز کی دنیا'' کا سلسلہ کیوں بند کر دیا، ابھی تو میرے فیورٹ آر جے نے انٹری بھی نہیں ماری۔

خیر وہ بور بھی کر رہا تھا۔ ''ندامت'' سمیرا غزل صدیقی نے بھی کافی اچھا لکھا۔ کسی کے بارے میں بھی برا مت سوچو، وہ جو اوپر بیٹھا ہے نا وہ سب کا حساب کتاب رکھتا ہے۔

میرا ''کچن اور آپ'' کب شائع ہو گا، انتظار ہے۔

☆ ساجدہ جی! آپ کو ''ماہنامہ کرن'' کی کہانیاں پسند آئیں، بہت شکریہ۔ ''کچن اور آپ'' میں آپ کے جوابات ان شاء اللہ جلد شائع کریں گے۔

زرتاشیہ نعمان......ملتان

سب سے پہلے آتی ہوں ''منعم ملک'' کے ناولٹ ''اسی کلے نئیں خراب'' پہ۔ جناب منعم ملک صاحبہ اپنے اسٹائل میں تعریف وصول کریں ''تسی گریٹ ہو، بڑا ہی چنگا ناولٹ لکھیا تسی، پڑھ کے بڑا ہی سواد آگیا'' آپ کی تحریر اس شمارے کی نمبر ون تحریر رہی۔ جی تو اب آتے ہوں فرح بھٹو کے مکمل ناول ''اے مسیحا دل کے'' کی طرف۔ یہ تحریر بھی اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر تھی۔ یہ اس شمارے میں دوسرے نمبر پر رہی۔ تیسرے نمبر پر آتی ہے فرح انیس کی ''موازنہ'' سچ میں پڑھ کے بہت لطف آیا۔ فرح جی نے مزاح کے پہلو میں ایک باریک سی بات اجاگر کی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں، شوہر کو بیوی کی اور بیوی کو شوہر کی خامیوں پہ نہ صرف پردہ رکھنا چاہیے بلکہ پیار محبت سے مل کر ان کو حل کرنا چاہیے نہ کہ دوسروں کے سامنے تشہیر کی جائے اور موازنہ تو قطعی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ موازنہ کرنے سے آپس میں نہ صرف دوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ فضا بھی مکدر رہتی ہے۔ ہر کسی کے گھر کا اپنا رہن سہن، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے تو جو آپ کے گھر کا ماحول ہے بجائے اس کے، اسے دوسروں کی طرح بنائیں بلکہ اپنے ماحول کو مزید بہتر کریں۔ چوتھے نمبر پہ آتی ہے عندلیب زہرا کی ''بھرم'' یہ بھی ایک جان دار تحریر تھی۔ جس میں عورت کے کردار پہ

بہت خوب صورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ عورت کیا کچھ برداشت کر کے اپنا گھر بچانے کی سعی کرتی رہتی ہے۔ سمیرا غزل صدیقی کی ”ندامت“ رہی پانچویں نمبر پر۔ یہ ایک اچھی کوشش تھی۔ چھٹے نمبر پہ حمیرا عروش کی ”آپو“ نے قبضہ کیا۔ یہ بھی اچھی پرسوچ تحریر تھی۔ آپو جیسے لوگ ہمارے اردگرد ہیں جو دوسروں کے بچوں کو اپنی طرف مائل کر کے، انہیں بگاڑ کے ماں سے دور کر کے نجانے اپنی کون سی بے رحم وسفاک حس کی تسکین کرتے ہیں اور ظلم کی حد تو یہ ہے کہ بچے کی ناقص تربیت کا ذمہ دار پھر بے چاری ماں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ساتویں نمبر پہ رہی قرۃ العین سکندر کی ”صف دوستاں“ اس پہ تبصرہ اتنا ہی کروں گی کہ اچھی کوشش تھی۔ اب درجہ بندی سے ہٹ کر بات ہو جائے قسط وار ناولز کی۔ آسیہ مرزا کا ”میرے ہم نفس میرے ہم نوا“ بہت سست روی کا شکار ہو رہا ہے۔ خدارا کوئی ٹوئسٹ لائیں تاکہ کہانی کی یکسانیت ختم ہو۔ کہانی بہت بور ہو چلی ہے۔ اب بات ہو جائے میرے فیورٹ ناول ”کنار خواب جو“ کی۔ یہ کہانی اپنے اندر بہت سے راز چھپائے ہوئے ہے، بہت دلکش انداز میں فرح بخاری اسے آگے بڑھا رہی ہیں جس کے لیے مبارک باد۔ ایک چھوٹا سا اندازہ لگانا چاہوں گی اس تحریر کے حوالے سے کہ وقاص نے ضرور وہاں شادی کر رکھی ہے، جس کی بنا پر اس نے شازمہ کو تنہا رکھا ہوا ہے۔ خیر یہ تو میری قیاس آرائی تھی جو ہم پڑھنے والے لگاتے ہی رہتے ہیں۔ اصل معاملہ تو فرح جی جانیں اور خط کے اختتام پہ ایک مزے دار بات شیئر کرنا چاہوں گی کہ جون کے شمارے میں نگہت سیما نے اپنے ناول ”جفت ساز“ میں جس ریاست بہاولپور کا ذکر کیا تھا، میں اور میرے شوہر اسی ریاست کے آخری نواب ”سر صادق محمد خان عباسی“ کی بیٹیوں کے چشم و چراغ ہیں (ہم دونوں ایک دوسرے کے خالہ زاد ہیں)۔ آخر میں کرن کی پوری ٹیم اور سب قاری بہنوں کے لیے نیک خواہشات اور دعائیں۔

☆ زرتاشیہ جی! ہم بہت معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی شوہر کو زحمت ہوئی لیکن یہ ہمیں بھی علم نہیں کہ آپ نے کس نمبر پر فون کیا اور کس نے جواب دیا۔ ہو سکتا ہے وہ اس شعبہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ کرن میں اپنی کہانیوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ایک ہی نمبر ہے 32726617۔ اس نمبر پر آپ کہانی بھیجنے کے ایک ماہ بعد معلوم کر سکتی ہیں، ٹائمنگ ہیں دوپہر ایک بجے سے شام پانچ بجے تک۔

سحر وقاص راجپوت......شیرانوالہ گیٹ لاہور

اس بار کا ٹائٹل ٹھیک تھا۔ ماڈل کا بس ہیئر کلر اور جیولری ہی اچھی لگی۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور سیدھی دوڑ لگائی منعم ملک کے ناولٹ پر ”اسی کلے نیں خراب“ واہ کمال کر دیا منعم جی آپ نے۔ نسیمہ بھابھی اور آپا جی کی نوک جھوک اچھی لگی۔ اور غافل نام پڑھ کر ہنسی تو آئی مگر اس کا کردار اچھا لگا۔ ساری کہانی مزے کی تھی پر غافل کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اس بے چارے کا کیا قصور تھا کہ گلشن جو ابھی گھر میں دلہن بن کے آئی تھی، وہ آنے سے پہلے ہی نکل گئی۔ دونوں کی پہلی بار کی ملاقات کا سین بہت ہنسانے والا تھا۔ غافل کے شعر پر ایسی بدذوقی اللہ کی پناہ۔ پھر پہنچے ”ہوائیں رک بدل گئیں“ پر۔ اتنے تھوڑے صفحات اور اگلے ماہ آخری قسط۔ ڈھائی سال نگہت جی نے اس تحریر کے ساتھ باندھ کے رکھا، پتا ہی نہیں چلا کتنی جلدی وقت گزر گیا۔ خزینہ غزنی کو معاف کرنے پر راضی ہو گئی۔ ربکا سر پھری کرنا کیا چاہتی ہے آخر اور جہانداد کی ماں کا قصہ بھی اگلی قسط میں کھلے گا۔ باقی تبصرہ آخری قسط کے بعد۔ آسیہ جی کا ”میرے ہم نفس میرے ہم نوا“ کافی تیز اسپیڈ سے چل رہا ہے۔ آبص کو نادیہ شاہ سے بچھڑے ایک سال ہی ہوا ہے اور ماں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ارسلہ سے شادی کر لی۔ ارے بھئی، محبت میں تو انسان تاعمر انتظار کرتا ہے، اب بے چاری نادیہ شاہ پہ کیا گزرے گی جو تمہاری کھوج لگانے کا کہہ بیٹھی ہے۔ نیلوفر کو احمر کے ساتھ خوش دیکھ کر یہی دعا کی، اللہ پاک ان دونوں کو ہمیشہ ایسے ہی خوش رکھے۔ ارسلہ کتنی خود غرض ہو تم، تمہیں اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے سکندر موزوں نہیں لگا۔ وہاں تک تو ٹھیک مگر تم نے اس کے سامنے جو اپنے جوتوں، کپڑوں، بیگ کی قیمتوں کی شوخیاں ماری ہیں، وہ بڑی بری لگیں۔ کتنی چالاکی سے تم نے آبص اور اس کی ماں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ آنے والے وقت میں بس پچھتاوے ہی ہوں گے تمہارے لیے۔ ”اے مسیحا دل

کے'' فرح بھٹو کا مکمل ناول کمال کر دیا۔ یادگار، بے مثال ابھی تک ''میں تمہارا'' کا ہیرو شیر دل اور رشنا نہیں بھولے تو اب اپسرا اور ازلان شاہ بھی یاد رہیں گے۔ ازلان اگر اپسرا سے سچی محبت کرنے لگ گیا تھا تو بھلا دوستوں کو ریکارڈنگ سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اپسرا کا غصہ کرنا جائز تھا، وہ تو لڑکی تھی حساس اور حساس طبیعت کی مالک۔ اس کے کردار کی مضبوطی پسند آئی اور بعد میں ازلان کی ثابت قدمی نے دوبارہ اس کا دل جیت لیا۔ باقی ناول ابھی زیر مطالعہ ہیں' اس بار رسالہ 16 تاریخ کو ملا اس لیے پورا ابھی پڑھا نہیں۔ جتنا پڑھا اس پر تبصرہ۔ انٹرویو میں صائمہ اکرم چوہدری اور امت العزیز شہزاد کے فرصت کے کام پسند آئے۔ آئمہ نور العین کی پہلے بھی سنی ہوئی ہے عثمان مختار کی سنایے یا انٹرویو کریں۔ ارم کمال ''مقابل ہے آئینہ'' بہت پسند آئے اور ان کی آخری بات بہت پسند آئی۔ ''مسکراتی کرنیں'' میں زرینہ خانم لغاری کا انتخاب اچھا لگا۔ اب گزارش ہے ان رائٹرز کو ڈھونڈیں مصباح علی سید، نازیہ کنول نازی، نبیلہ ابر راجہ سعدیہ عزیز آفریدی، بنت سحر، کہاں ہیں آپ سب پلیز کرن کے لیے کچھ لکھیں۔ تنزیلہ ریاض بھی ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' لکھ کر واپس نہیں آئیں۔ بھئی ہمیں التمش، سونیا، زرمین نہ سہی کسی اور کی ہی کہانی سنائیں انتظار ہے ہمیں۔ افسانے سب اچھے تھے ''بند کتاب'' کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ''بھرم'' بالکل صحیح کہا آپ نے عندلیب زہرا ہر عورت نے اپنا کسی نہ کسی طرح بھرم رکھا ہوا ہے۔ ''موازنہ'' بلاشبہ خوب صورت عنوان شکر ہے، تعبیر کو اچھی ساس ملی ورنہ یزدان کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ہو جاتا۔ ''نامے میرے نام کی'' کتنی بہنیں غیر حاضر ہیں چلو واپس آ کر حاضری لگواؤ۔ فوزیہ ثمر بٹ، سیدہ نسبت زہرا۔ فائزہ بھٹی، ماہا بشیر اور ارم شہزاد بھئی آ کر محفل میں رونق لگاؤ۔ یہ ماریہ نذیر کا جادوئی قلم کیا اپنی سیاہی ختم کر بیٹھا ہے سب واپس آؤ۔ اور یہ خوشی سرانوالی بھی کافی دیر سے غیر حاضر ہے سب کو بلائیں۔

☆ سحر جی! ہمیں بھی سب بہنوں کی رائے کا انتظار رہتا ہے۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہیں'' کا سلسلہ فی الحال ختم کر دیا گیا ہے۔ آپ کی فرمائش ہم جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقرا سرور......ڈی جی خان

مارچ کا شمارہ پڑھا۔ سوچا بھی نہیں تھا کہ اپریل کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں نہیں آ سکے گا۔

کیا سے کیا ہو گیا ہے کس کس نقصان کا ازالہ ہو گا۔ تمام پڑھنے والوں کو میرا اسلام۔ مارچ کے شمارے پر اقراء سرور کا تبصرہ حاضر ہے۔ دعائیں ان کے لیے جنہوں نے مجھے یاد کیا، باقیوں کے لیے بھی دعائیں۔ سب سے پہلے ''کچھ باتیں دل کی'' پڑھا۔ پیاری ماہا بشیر مجھے بھی تمام سے ملنے کا بہت شوق ہے کیا تم دونوں بہنوں کا فون نمبر مل سکتا ہے روبینہ آپی کو دے دینا۔ میں ان سے لے لوں گی۔ افسوس کہ میں سروے میں شرکت نہ کر سکی۔ لیکن اس خط میں مختصر سے جواب دے دوں میں نے بہت یاد کیا لیکن مجھے کرن کی کہانیوں کا کوئی بھی ایسا کردار یاد نہ آیا جس نے اقرا سرور کی ذرا سی بھی جھلک دی ہو۔ شاید آگے کی شائع ہونے والی کہانیوں میں کوئی رائٹر اقراء سرور کے کردار کو بھی تخلیق کر لے۔ جب ایسا ہوا میں آپ کو بتا دوں گی۔

2017 میں شعاع میں کرن کا اشتہار دیکھا۔ مصباح علی سید کا کوئی ناول چل رہا تھا۔ مصباح علی سید کا نام مجھے بہت اٹریکٹ کرتا ہے تو مصباح آپی مجھے کرن تک لے آئیں۔ اس کے بعد کرن کو نہیں چھوڑ پائی۔ کرن میرا پہلا اور آخری پڑاؤ ہے۔ مجھے کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی۔

آخری سوال بہت دل چسپ اور زبردست لگا۔ سمجھو دل کی بات یہی تو تھی۔

سب سے زیادہ مجھے فائزہ بھٹی، تبسم اور ماہا سے ملنے کا شوق ہے۔ ان کے نام یہی پیغام ہے کہ مجھے بھی بھلانا مت۔ شہلا گل محبتوں اور دعاؤں کا شکریہ۔

فائزہ کا سروے بیسٹ آف آل لگا مجھے لگتا ہے ہم دونوں کی ایک جیسی کہانی ہے یا پھر 80 فیصد مماثلت ضرور ہے۔ ہاہا...... فائزہ تمہیں ایسا لگتا ہے؟ حمیرا گل دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ آپ میری دعاؤں میں رہیں گی۔ فوزیہ ثمر دعا دینے کا شکریہ۔ میری دعائیں بھی قبول کرو۔

اور آخر میں تبسم! جس کا نام لبوں پر آئے تو چہرے پر بھی تبسم آ جائے۔ تبسم! تمہارا نام بہت پیارا ہے تبسم میرا

خیال ہے جن کے پاس دعاؤں کا خزانہ ہوں وہ بھی غریب نہیں ہوا کرتے۔ عمران خان کہتے ہیں! اصل امیری تو دل کی امیری ہے۔ تم غربت سے لڑنا سیکھو۔ غربت کے خوف کو ماردو۔ تم دیکھنا ایک دن کرن کے صفحات پر اقرار سرور کے ساتھ تبسم بشیر بھی ایک بہترین مصنفہ کے طور پر جگمگائے گی۔

افسانوں میں ''عندلیب زہرا'' کا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس کے بعد ''اپنے لوگ'' کاش کے جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ بات سمجھ جائیں۔

بہت شکریہ ایمل رضا مجھے آپ بہت بہت زیادہ پسند ہیں، جیسے آپ کو بانو قدسیہ پسند ہیں ویسے ہی مجھے آپ پسند ہیں۔

''زندگی یہ سفر میں ہے'' دل کے تار کو چھو لینے والی کہانی میرے دل کی بات لگی۔ بہت ہی زبردست۔ میری روح کے زخم دکھنے لگے پڑھ کر۔ فرح بخاری کا ''کنار خواب جو'' آگے کا شدت سے انتظار ہے۔ بہت خوب ناول ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھیں۔

ج: اقرا جی۔ اگر آپ کو خط لکھنا مشکل ہے تو آپ کرن کے ای میل ایڈریس پر یا واٹس ایپ پر نمبر پر بھیج سکتی ہیں۔

شکیلہ سہیل حسن......ملکوال

کہتے ہیں نشہ جس بھی چیز کا ہو یا انتظار جس بھی چیز کا ہو برا ہوتا ہے مگر کرن کا نشہ ہمارے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور انتظار بہت جان لیوا ہوتا ہے مگر میٹھا بھی ہوتا ہے۔ انتظار تو پہلے بھی کرتے تھے مگر اس بار تو انتہا ہو گئی۔ انتظار کی۔ آئی نا کچھ خبر ہمارے کرن کی اپریل اور مئی میں بھائی، کزن اور ابو کو اتنے چکر لگوائے کہ ان کو بھی چکر آ گئے۔ ان گیارہ سالوں میں اتنا ویٹ نہیں کرنا پڑا۔ جتنا کہ اس بار کیا مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ان گیارہ سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کرن اس بار 8 تاریخ کو ہی مل گیا ورنہ 15 سے 17 تک ملتا تھا۔ چلیں خیر جو حکم الٰہی تھا۔ اللہ کی طرف سے آنے والی اس آزمائش نے ہمارے کرن ادارہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جون کا شمارہ آتے ہی جون ہی بدل گئی اور بہار کو شفا مل گئی ہو جیسے (محاورہ نہیں ہے حقیقت میں) طبیعت انتہائی خراب تھی۔ ڈائجسٹ دیکھ کر طبیعت باغ وبہار ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اینڈ سے کھولا اپنا نام دیکھتے ہی دل کو قرار آ گیا اور لگا کہ دو ماہ کا انتظار رائگاں نہیں گیا۔ بہت شکریہ مدیرہ آنی جیسی جو میرا خط لگا دیا۔ فرسٹ ٹائم کسی سروے میں حصہ لیا تھا جو شائع نہیں ہو سکا خیر ہم بھی خط پر ہی قانع ہو گئے۔ ہر ماہ کرن میں اپنا نام دیکھنا خواب ہے (شیخ چلی والا نہیں جی) اصلی والا جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہوا۔ اب بات کرتے ہیں جون کے شمارے کی تو ٹائٹل گرل بہت پیاری تھی اس بار میرے فیورٹ کلر کے ڈریس میں۔ حمد ونعت سے دل کو دھڑکن ملی تازگی ملی۔ سمیرا حمید کا آئینہ صفت بہت نائس تھا۔ ایک ایک لفظ سچا واقعی میں جو پودا محمود ریاض صاحب نے لگایا تھا وہ تناور درخت کی صورت میں مجھ جیسی لاکھوں بہنوں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دے رہا ہے۔ جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم اپنے حال کو بہترین اپنے مستقبل کو روشن کر رہے ہیں۔ اللہ پاک محمود ریاض صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے اگر میری زندگی میں کرن نہ ہوتا تو میری زندگی میں اتنی روشنی نہ ہوتی میری شخصیت کو گردم کرنے میں سارا ہاتھ کرن کا ہے علم کی پیاس ہر دن کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ میرے پاس ان گیارہ سالوں میں کرن کے علاوہ دیگر بھی اتنے ڈائجسٹ اکٹھا ہو چکے ہیں کہ میری امی اکثر کہتی ہیں اتنے رسالوں کا کیا کرو گی بیچ دو ان کو تو جیسے دل پر ہاتھ پڑتا ہے میں کہتی ہوں آپ ٹینشن نہ لیں۔ یہ میرا جہیز ہے میں انہیں اپنے ساتھ چکوال لے جاؤں گی۔ بھلا علم بھی کوئی بیچتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کیسے اپنا علم اندھیروں کی نظر کر دو۔ یہ رنگ یہ خوشیاں میں سب نے اچھے جوابات دیے۔ ''میری بھی سنیے'' میں نعمان سمیع کی سنی خوشی ہوئی مل کر۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں اس بار صفیہ مہر کو آئینے کے مقابل دیکھا جان کر اچھا لگا ان کے بارے میں۔ نائس تو میٹ یوصفیہ زہرا۔

آسیہ مرزا جی کا ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' بہترین جا رہا ہے۔ دولت کی چکا چوند آنکھوں چندھیا دیتی ہے۔ ارسلہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جب سب نظر آنے لگا تب دیر ہو چکی ہو گی۔ نفیسہ سعید جی کا ''دیوی'' بہت نائس تھا۔ دکھاوے کی چکر میں لوگ اکثر اندھیرے کا

انتخاب کر بیٹھے ہیں۔ نگہت سیما جی کا ''جفت ساز'' بہت ہی لاجواب تھا۔ ملک پاکستان کی خاطر ہمارے بزرگوں، عورتوں بچوں نے جو جان عزت، اپنا بچپن دے کر ہمارے لیے آزادی حاصل کی وہ قابل آفرین ہے (سلیوٹ ہے ان سب کو) صدر ریحان کا، اے دل بے خبر بہت زبردست لگا۔ احتشم نام بہت یونیک تھا اور کردار اس سے بھی زیادہ۔ عورتوں کی عزت کرنے والے مرد قابل ستائش ہوتے ہیں۔ ویل ڈن صدف جی۔ نوشین فیاض کا ''پھول کھلنے لگے راہوں میں'' زبرست تھا۔ مصباح کی معصومیت دل کو بھائی۔ فرح بخاری جی کا۔ ''کنار خواب جو'' بہت اعلا ہے فرح بخاری ہوں اور کمال نہ ہو ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ کنعان نام بہت پسند آیا کنعان اور سوار کا ملن ہونا چاہیے۔ کوئی ظالم سماج نہ ہو ان میں۔ باقی تمام ناول افسانے زبردست تھے کوئی نہ کوئی سبق سیکھا ہے سب سے۔ ''نامے میرے نام'' میں سب قاری بہنوں نے خوب تبصرے کیے زرینہ خانم جی۔ ماریہ، ساجدہ، سعدیہ، ثنا، مسکان ویل ڈن۔ اس بار فوزیہ ثمر، فائزہ بھٹی اقرا، شمع غائب تھیں، کہاں ہیں بھئی گرلز؟ کرن کی رونق ان تمام قاری بہنوں سے ہے ''کرن کرن خوشبو'' میں سعدیہ وحید کے نمک پارے لاجواب تھے۔ ثریا راجپوت کا ''حقیقت'' نائس تھا۔ ''یادوں کے دریچے'' میں اقرا کی غزل نائس تھی کرن کتاب اس بار بھی مزے کی تھی۔ ہر بار کی طرح باقی سب سلسلے بھی نائس تھے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں جوابات بھیجے ہیں پلیز نوک پلک سے سنوار کے شائع کریں بہت خوشی ہوگی۔

ج: شکیلہ جی: خط یا سروے کے جوابات ہمیں دیر سے موصول ہوئے اس لیے ہم شائع نہیں کر سکے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں آپ کے جوابات جلد ہی شائع کیے جائیں گے۔

شازیہ عمر......راولپنڈی

اس بار کرن نے بہت انتظار کروایا۔ ''اداریہ'' پڑھا ''حمد و نعت'' سے دل و دماغ کو منور کیا۔ لاک ڈاؤن پر سروے کے جوابات پڑھ کر ایسا لگا کہ ان سب پر بھی ایسی ہی بیت رہی ہے جیسی ہم پر گزری ہے اب تو بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم پر رحم فرمائے اور اس آزمائش سے نکال دے۔ زندگی قید ہو کر رہ گئی ہے۔ ''میرے ہم نفس میرے نوا'' میں آسیہ مرزا سے گزارش ہے کہ کہانی میں ارسلہ کا کردار بہت زیادہ ہے تھوڑا بہت نادیہ شاہ کے کردار میں اضافہ کریں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' آئندہ ماہ آخری قسط ہوگی۔ شدت سے انتظار ہے آخری قسط کا۔ نگہت آپی سے ایک گزارش ہے کہ شہرینہ کی شادی جہاں داد سے کروادیں پلیز۔ ''کنارے خواب جو'' فرح بخاری بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شازمہ کا شوہر وقاص لگتا ہے کہ اس کو دھوکا دے رہا ہے۔ ''شناسائی'' سدرۃ المنتہیٰ کا ناول اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی تھی۔ سدرہ آپی جب بھی لکھتی ہے اچھا ہی لکھتی ہیں۔ ثاقب الحسن بہت سنگدل اور خود غرض انسان تھا۔ منصورہ کا بیٹا ذورین بھی اپنے باپ پر گیا تھا۔ جہاں پر وہ اپنی ماں کو سائیکرسٹ کے پاس لے کر گیا وہاں تو آنسو نکل پڑے۔ فرح بھٹو کے ناول ''اے مسیحا دل کے کہانی پرانی تھی۔ لیکن فرح آپی نے اس کو لکھا بہت اچھا ہے اس لیے پڑھنے میں دل لگا رہا۔ کہانی میں نصیحت بھی تھی کہ جوانی کے جوش میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اور سامنے والے کے دل اور احساسات کی پروا نہیں کرتا۔ جب عمر گزرتی ہے تو احساس ہوتا ہے۔ منعم ملک کا ناولٹ بہت مزے کا تھا۔ پڑھتے پڑھتے ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔ پلیز آپی ہر ماہ ایک دو مزاحیہ کہانیاں ضرور شائع کیا کریں۔

افسانے سب ایک سے بڑھ ایک تھے۔ یادوں کے دریچے میں سب کی غزلیں پسند آئیں۔ ''کرن کرن خوشبو'' میں ادیبہ، ساجدہ جاوید اور زرینہ خانم کی نگارشات پسند آئیں۔

اب آتے ہیں کرن بہنوں کی طرف فوزیہ ثمر بٹ آپ کہاں غائب ہوگئیں۔ آپ کا خط تو ہم بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ سحر وقاص، زرتاشیہ، ساجدہ جاوید، تبسم بشیر، ارم کمال مجھے آپ سب سے ملنے کا بہت دل چاہتا ہے آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

ج: شازیہ جی۔ آپ نے شاید پہلی دفعہ ''نامے میرے نام'' کی محفل میں شرکت کی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کریں گی خط لکھنے کا بہت شکریہ۔

☆☆

رنگ برنگی پوٹلی

ویسے اب تک آپ نے پوٹلی بیگ استعمال کیا ہو یا نہیں، فی الحال فیشن اور ٹرینڈ کا تقاضا ہے کہ آپ اپنی بیگ کلیکشن میں تبدیلی لائیں اور ساڑھی سے انارکلی اور شلوار سوٹ سے لہنگے تک خاص مشرقی ملبوسات کے ساتھ ایک منفرد پوٹلی بیگ لینا شروع کردیں۔ کیونکہ پوٹلی پرس ان دنوں فیشن میں ان ہے اور خواتین انہیں بہ آسانی کسی بھی لباس کے ساتھ میچنگ کر کے استعمال کرسکتی ہیں۔

بازار میں پوٹلی کے لاتعداد ڈیزائن دستیاب ہیں، ان کا ٹرینڈ اس قدر مقبول اور پسندیدہ ہے کہ آپ بلا جھجک کوئی بھی پوٹلی بیگ لے سکتی ہیں۔

آرام اور سہولت کو مدنظر رکھنے والی خواتین کے لیے پوٹلی بیگ کا سائز اہمیت کا حامل ہوگا۔ ان کے لیے بہتر ہے کہ آپ ایسی پوٹلی منتخب کریں جس کی چوڑائی کم از کم 17 اعشاریہ 5 انچ جبکہ لمبائی 7 انچ ہو۔ پوٹلی فیبرک کے لیے مخمل، راسلک، بنارسی، ساٹن، کاٹن، نیٹ، ریشمی کپڑا مناسب ہوگا جس پر زردوزی، موتی کٹادانہ اور ستارے کا کام جچے گا۔ ویسے ضروری نہیں کہ آپ ریڈی میڈ پوٹلی خریدیں، عام طور پر بہت سے درزی روایتی عروسی ملبوسات شادی بیاہ کی تقریبات میں پہنے جانے والے جوڑوں کی میچنگ کا پوٹلی بیگ تیار کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس طرح اب اپنی پسند کے عین مطابق پوٹلی تیار کرواسکتی ہیں، پوٹلی کا دستہ بہتر ہے کہ 16 اعشاریہ 5 انچ لمبا ہو۔

اگر کسی لڑکی کو انارکلی یا کسی مہندی کے فنکشن کے ساتھ پوٹلی پرس خریدنا ہے تو وہ رنگ برنگے سلک کپڑے سے تیار کردہ ایسے پوٹلی پرس خریدیں جس پر گوٹے کا کام کیا گیا ہو۔

اگر شادی کی کسی تقریب میں ساڑھی پہننی ہے یا کوئی بھی بھاری کام والا لباس زیب تن کرنا ہے تو اس کے ساتھ بنارسی کپڑے سے تیار کردہ پوٹلی پرس خریدیں جن پر موتی، ستارے یا کرسٹلز لٹکے ہوئے ہوں۔

لڑکیاں شلوار قمیص کے ساتھ بھی اس کے ہم رنگ پوٹلی پرس استعمال کرسکتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ پوٹلی کو ہاتھوں میں ہی تھاما جائے۔ آج کل کچھ پوٹلی پرس ایسے بھی دستیاب ہیں جن کی ڈوری لمبائی میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس انداز کے پوٹلی پرس کو کندھے پر بھی لٹکایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دلہن وغیرہ اس بیگ کو کلائیوں میں ڈال سکتی ہیں۔ چونکہ کچھ ڈیزائنرز نے ایسے پوٹلی پرس تیار کیے ہیں جن کے اوپر چوڑی کے انداز کا گول رنگ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس رنگ کو کلائی میں آسانی سے پہن کر پوٹلی پرس استعمال کیا جاسکتا ہے تاکہ اسے سنبھالنے کی جھنجٹ بھی نہ ہو اور یہ سب کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کروالے۔

فراکس، شرارے، غرارے، ساڑھی، چوڑی دار پاجامہ اور قمیص کے علاوہ یہ مغربی طرز کے ملبوسات کے ساتھ بھی آسانی سے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ نے مغربی طرز کی شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا ہے تو اس کے ساتھ آپ کروشیے سے تیار کردہ پوٹلی پرس استعمال کرسکتی ہیں چونکہ کروشیے میں ورائٹی بہت زیادہ مل جاتی ہے، اس لیے پوٹلی پرس کے لیے رنگوں کے انتخاب میں زیادہ مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ یہ پوٹلی بیگز ہر طرح کے ملبوسات کے ساتھ بڑے اچھے لگتے ہیں۔

گھر کی خوبصورتی...... چمچماتا فرش

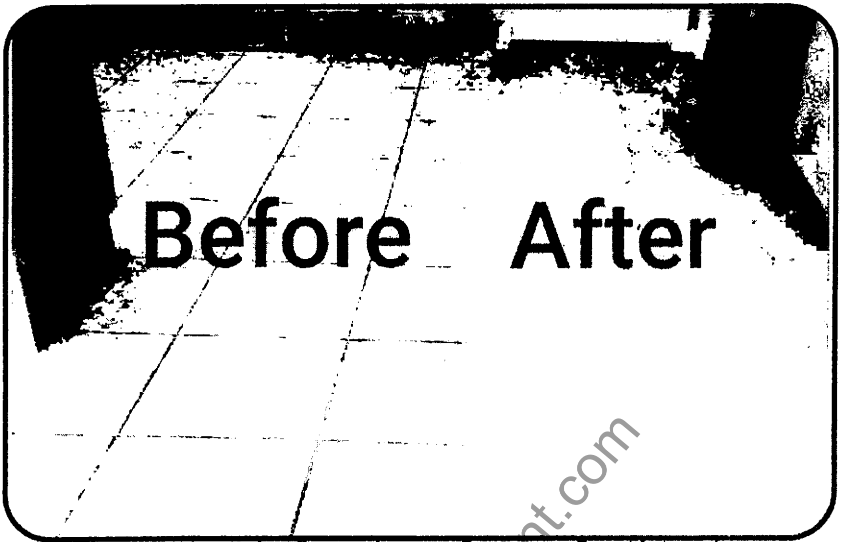

ہر خاتون کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا گھر چمچمائے، اس کے گھر کا فرش اتنا صاف ستھرا ہو کہ اس میں انسان کا چہرہ تک دکھائی دینے لگے۔ اس فرش کی صفائی کرنا خواتین کے لیے ایک امتحان بن جاتا ہے۔ ایسی خواتین کی آسانی کے لیے یہاں فرش کی صفائی کرنے سے متعلق کچھ اہم باتیں بتائی جارہی ہیں جن پر عمل کر کے یہ خواتین اپنے فرش کو صاف کرسکتی ہیں۔ کبھی بھی پانی کی بالٹی اور پونچھا لگانا شروع نہ کردیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پانی کی بالٹی اور عام پونچھے سے بہتر ہے کہ مائیکروفائبر سے بنے ہوئے پونچھے کا استعمال کریں۔ اس کے ساتھ فلور کی صفائی کے لیے اسپرے خرید لیں۔ پہلے اسپرے کی مدد سے پانی چھڑکیں اور پھر مائیکروفائبر کی مدد سے آپ فرش کو صاف کرلیں۔ اس طرح صفائی کرنے سے آپ کے وقت کی بہت بچت ہوگی۔

کچھ سرامک سے بنے ہوئے ٹائلز ایسے ہوتے ہیں، جنہیں عام پونچھے سے صاف کیا جائے تو وہ صاف نہیں ہوتے۔ اس کے لیے بازار میں ملنے والا مائیکروفائبر سے تیار کردہ پونچھا خریدنا پڑے گا، اس سے بہت اچھی طرح ٹائلز والا فرش صاف ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی کچھ خاص قسم کے کلینزز مارکیٹ میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے ان مہنگے ترین سرامک ٹائلز کو صاف کیا جاسکتا ہے اور انہیں چمکایا جاسکتا ہے۔

ٹائلز والے فرش کی صفائی کرنے سے قبل پہلے اچھی طرح جھاڑو یا ویکیوم کلینز کی مدد سے فرش صاف کرلیں تاکہ پہلے سارا کچرا صاف ہوجائے۔ اس کے بعد فرش پر لگے ہوئے ایسے ضدی داغ جو صاف نہیں ہوسکے ہیں، پہلے ان داغوں کو صاف کرنے کی کوشش کریں۔ اگر لپ اسٹک، مومی پینسلز، پینٹ یا انک کے داغ ہیں تو ان داغوں کو صاف کرنے کے لیے پہلے کسی اسپنج کی مدد سے الکوحل ان پر لگائیں، اس الکوحل کو داغ پر پانچ منٹ لگا رہنے دیں، اس کے بعد کسی کپڑے یا اسفنج سے اسے صاف کرلیں۔ داغ مٹ جائیں گے۔

جب بھی کلینزر سے ٹائلز کو صاف کریں، اس کے بعد صاف پانی کی مدد سے پونچھا بھی ضرور لگائیں تاکہ کلینزر اچھی طرح صاف ہوجائے اور اس کے کیمیکلز فلور پر موجود نہ رہیں۔ اس کے بعد فرش کو سوکھنے دیں۔ اس بات کا بھی دھیان رکھیں کہ آئل والے کلینزز نہ خریدیں، اس سے سرامک ٹائلز چمک تو جاتے ہیں تاہم ان پر دھول مٹی

جلدی چپک جاتی ہے۔

جدید دور میں ملنے والے ویکیوم کلینزز میں مٹی کی ذرات صاف کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس لیے ٹائلز پر سے مٹی وغیرہ کی صفائی کے لیے ویکیوم کلینز کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

ٹائلز کو صاف کرنے کے لیے پانی میں آدھا کپ سرکہ ڈالیں اور اس پانی سے پونچھا لگائیں۔ پھر نیم گرم پانی سے پونچھا لگائیں، جب وہ خشک ہو جائے تو اسے سوکھنے دیں۔ سرکے کی مدد سے فرش سے چکنائی صاف ہو گی، ساتھ ہی فرش سے بو بھی نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ پانی میں لیکوئیڈ ڈٹرجنٹ ڈال کر اس سے پونچھا لگائیں۔

ٹائلز کو صاف رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جوتوں کے ساتھ کمروں میں نہ گھومیں، جوتے ہمیشہ گھر کے دروازے پر اتاریں۔ گھر کے لیے الگ چپل رکھیں تاکہ ٹائلز میلی نہ ہو سکیں۔

باتھ رومز اور کچن میں چھوٹے سائز کے ٹائلز ہوتے ہیں جو کہ دیکھنے میں تو خوب صورت لگتے ہیں، لیکن ان ٹائلز کے کناروں کی صفائی اتنی ہی مشکل ہوتی ہے کیونکہ وہ کچھ ہی دنوں میں سفید رنگ سے کالے یا کتھئی رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسے واپس اپنی اصل رنگت میں لانے کے لیے گھر میں تیار کیا جانے والا یہ کلینز آزمائیں، تین کپ پانی میں، آدھا کپ بیکنگ سوڈا، ایک تہائی کپ لیموں کا رس اور ایک چوتھائی کپ سفید سرکہ ڈال کر کلینز بنائیں۔ ان تمام چیزوں کو مکس کر کے اسپرے بوتل میں بھر لیں، اس کا ٹائلز کے اردگرد سیمنٹ والی جگہ پر اسپرے کریں۔ چند منٹ لگا رہنے دیں اور پھر اسے برش کی مدد سے رگڑیں اور صاف کر لیں۔

ایک گیلن پانی میں، ایک چوتھائی کپ واشنگ سوڈا، ایک چوتھائی کپ سفید سرکہ اور ایک کھانے کا چمچہ ڈش سوپ ملائیں، ان تمام چیزوں کو مکس کر کے کسی اسپرے بوتل میں بھر لیں۔ ٹائلز والے فرش پر اسپرے کریں، کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں اور پھر صاف کر لیں۔

ایک کپ بیکنگ سوڈا کو پہلے ٹائلز کے اردگرد کی جگہ پر چھڑکیں، پر اس پر ایک کپ ہائیڈروجن کریں۔ دس منٹ ان دونوں کو لگائے رکھیں، اس کے بعد برش کی مدد سے رگڑیں اور پھر صاف کر لیں۔

ایک کپ نمک، آدھا کپ بیکنگ سوڈا اور ایک چوتھائی کپ لیکوئیڈ ہینڈ واش ڈالیں۔ مکس کریں اور مکسچر کو ٹائلز کے اردگرد لگائیں، تھوڑی دیر کے بعد اسے رگڑ کر صاف کر لیں۔

آدھا کپ بیکنگ سوڈا کر لیں، اس میں ایک چوتھائی کپ ہائیڈروجن پر آکسائیڈ اور ایک چائے کا چمچ ڈش سوپ ملائیں، ان سب کو ٹائلز کے سیمنٹ پر لگائیں۔ دس منٹ لگائے رکھیں پھر اسے ٹوتھ برش کی مدد سے رگڑیں اور پھر پانی سے صاف کر لیں۔ ان تمام طریقوں کو آزماتے ہوئے ٹائلز کے اردگرد موجود جگہ/ سیمنٹ کو پھر سے سفید کیا جا سکتا ہے، ساتھ ہی ٹائلز والے فرش کو چمکایا جا سکتا ہے۔

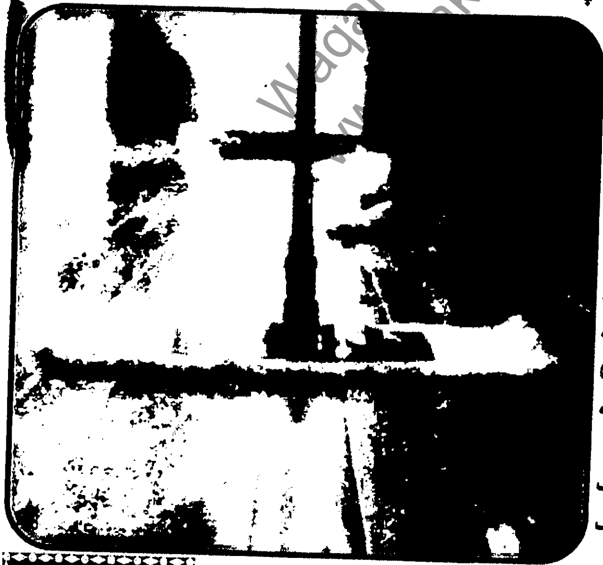

خوبانی...... قوت مدافعتِ بڑھائیے

خوبانی سرد پہاڑی علاقوں میں پیدا ہونے والا پھل ہے جو پوٹاشیم، فولاد، فائبر اور بیٹا کروٹین سے مالا مال ہوتا ہے۔ خوبانی کے انگنت فوائد ہوتے ہی جن میں سے کچھ یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔

☆ نہار منہ سات سے پانچ دانے خوبانی کھا کے ایک گلاس لسی پی لیں۔ نظام ہاضمہ کو بہتر بنا کے قبض کو دور کرتی ہے۔ سینے میں ہونے والی جلن کو بھی کم کرتی ہے۔

☆ خوبانی کے روزانہ استعمال سے خون کی روانی اور جوشِ خون کو فائدہ پہنچتا ہے۔

☆ نزلہ، زکام، گلے کی خراش اور منہ کی بدبو دور کرنے کے لیے روزانہ پانچ دانے خوبانی ہمراہ گرم پانی استعمال کرنا مفید ہوتا ہے۔

☆ پچاس گرام خشک خوبانی سبز چائے کے ساتھ نہار منہ استعمال کریں، پیٹ کے کیڑے صاف ہو جائیں گے۔

☆ خوبانی میں شامل لائکوپین دل کے لیے نہایت مضر کولیسٹرول ایل ڈی ایل کی سطح کو کم کر کے شریانوں کو صاف رکھتا ہے۔

☆ بھوک کی کمی یا معدے میں بوجھ کی صورت میں ایک پاؤ خوبانی دس گرام سونف کے ساتھ روزانہ استعمال کرنا فائدہ مند ہے۔

☆ خون میں گرمائش اور پھوڑے پھنسیوں کی صورت میں سو گرام خوبانی، تیس گرام عناب، تین سو ملی لیٹر پانی میں بھگو کر رات کو رکھ دیں۔ صبح اچھی طرح مل کر چھان لیں۔ تھوڑی سی مصری ملا کے نہار منہ استعمال کریں۔

☆ پانچ عدد خوبانی اور پانچ عدد انجیر رات کو پانی میں بھگو دیں۔ صبح پانی کے ساتھ ہی استعمال کریں۔ بواسیر میں فائدہ پہنچاتی ہے۔

☆ خوبانی انتہائی اہم غذائیت بخش پھل ہے جو حیاتین کی طاقت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس میں تمام وٹامن اور معدنی نمکیاں پائے جاتے ہیں۔ خوبانی کا کم مقدار میں استعمال بھی متوازن صحت کے حصول کے لیے کافی ہے۔ خوبانی کی حد سے زیادہ مقدار نہیں کھانی چاہیے۔ اسے کھا کر اس کے مغز کا کھانا بے حد ضروری ہوتا ہے۔

نفسیاتی اور معاشرتی مسائل

احساس کمتری...... ایک کرب مسلسل

احساسات انسان کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں اور انسان ان سے چھٹکاراں ہیں پاسکتا۔ زندگی میں بے شمار ایسی خواہشات ہوتی ہیں جو سب کی سب ہمیشہ پوری نہیں ہوتیں مگر انسان کی زندگی کا دوسرا نام ہی خواہش ہے اور وہ بار بار تہی داماں رہنے کے بعد بھی اپنی خواہشات کی عادت سے دست بردار نہیں ہوتا۔ کسی احساس یا جذبے سے چھٹکارا نہ پانے کی وجہ سے انسان کے اندر اس کا ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ ایک منفی حس بیدار ہوتی ہے جسے ”احساس کمتری“ کہتے ہیں۔

احساس کمتری کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں جن میں دولت کی غیر مساوی تقسیم احساس کمتری پیدا کرنے کا سب سے بڑا موجب ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے حسن سے جیلس ہوکر احساس کمتری پیدا ہونا مردوں کی نسبت خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ کچھ افراد کا ناخوش گوار یا محرومیوں بھرا بچپن انہیں احساس کمتری میں مبتلا کردینا ہے۔

احساس کمتری انسان کو مختلف نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کردیتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ دوسروں کے لیے تعصب اور حسد میں مبتلا رہتا ہے۔ تعصب اور حسد کی وجہ سے ایسا انسان دوسروں کا کچھ تو نہیں بگاڑ پاتا البتہ خود کی شخصیت کو برباد کردیتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کے متعلق شکایت کرتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور تنہائی کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ خود کو بھی ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتا ہے اور دوسروں کے ذہن کو بھی مسلسل ٹارچر کرتا ہے۔ اسے احساس کمتری کی شدید ترین شکل کہتے ہیں جو عرف عام میں ”نفسیاتی پن“ ہوجاتا ہے۔

آج ہم آپ کو احساس کمتری سے نمٹنے کے لیے کچھ تجاویز بتا رہے ہے جنہیں اپنا کر وقتی طور پر حاوی ہونے والے محرومی کے احساس سے نمٹا جاسکتا ہے۔

☆ اپنی پیٹھ تھپکیں۔ اپنی تعریف کرنا سب سے زیادہ ضروری عمل ہے کیوں کہ ایسے افراد کی زندگی میں اسی چیز کی کمی ہوتی ہے۔ دن کے اختتام پر اپنے معمولات پر نظر ڈالیں اور ان کاموں کی تعریف کریں جن کی وجہ سے دوسرے آپ سے خوش ہوئے۔

☆ کوئی مشغلہ تلاش کریں۔ مختلف کھیل، تخلیقی کام، کھانا پکانا، گھر سجانا، رضا کارانہ خدمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔

☆ اپنی غلطیوں سے سیکھیں۔ دنیا کا ہر شخص غلطی کرتا ہے لیکن اس غلطی سے سبق سیکھ کر دوبارہ نہ دہرانے کی صلاحیت چند لوگوں میں ہوتی ہے۔ غلطی تسلیم نہ کرنا شخصیت کی حامی ہے لیکن غلطی کو تسلیم کر کے طویل وقت تک اپنے آپ کو اس کے لیے موردالزام ٹھہراتے رہنا آپ کی شخصیت کو تباہ کرسکتا ہے۔

☆ مثبت رخ پر سوچنا زندگی کے بہت سے مسائل کو کم کرسکتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا ہوگا کہ زندگی میں ہر خواہش کا پورا ہوجانا یا ہر چیز کا مل جانا ناممکن ہے۔ بعض دفعہ ہم جس چیز کی تمنا شدت سے کرتے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتی اور کسی دوسرے شخص کو مل جاتی ہے، اس بات کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی قابلیت کو کمتر محسوس کریں۔

خود کو خوش رکھیں اور دوسروں کی خوشی میں خوش رہنا سیکھیں تو بہت حد تک ممکن ہے کہ آپ ”احساس کمتری“ کے مرض سے چھٹکارا پالیں۔

ساجدہ جاوید سندیلو

س: ”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟“

ج: ”ہوتے ہیں کچھ لوگ جو صرف کھانے کے لیے جیتے ہیں، ہم کو بھوک لگتی ہے تو کھاتے ہیں ورنہ اگر زیادہ گرمی ہو تو ہم کھانا ہی بھول جاتے ہیں۔“

س: ”گھر کا کام کاج میں خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟“

ج: ”جب شادی نہیں ہوئی تھی، کچن کا کوئی بھی کام نہیں کیا۔ امی اور بھابھی کرنے نہیں دیتی تھیں، پڑھنے کا تو ہمیں بھوت سوار تھا ویسے ہمارے خاندان میں سب (کتابی کیڑا) ہیں۔“

س: ”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہی پکے۔ کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والے کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟“

ج: ”بچے ابھی تو چھوٹے ہیں جو بھی بنالوں کھا لیتے ہیں مگر شوہر صاحب کچھ نخریلے ہیں۔ ان کو زیادہ مرچوں والا کھانا پسند نہیں، ان کے لیے پھیکا سالن بناتی ہوں تو کہتے ہیں کہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے۔“

س: ”کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھواں ہوا؟“

ج: ”کھانا دھواں تو نہیں ہوا مگر ایک مزے کا سین بتاتی ہوں (ابھی حال ہی میں) میری چھوٹی بیٹی ام رباب کو نہانے کے لیے باتھ روم میں بٹھا کر الماری سے کپڑے نکال رہی تھی، جب میری نظر ”ماہنامہ کرن“ پر پڑی تو (ام طیفور) کی ”ساگر کنارے“ کا وہ سین جب عقیل اپنے ماں باپ کی قبر پر آ کر روتا ہے، اس میں ایسی کھو سی گئی کہ جب ام رباب نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا، تب ہوش آیا جب میں اس کی پاس گئی تو اس نے اپنی توتلی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔“ ہاہاہاہا۔

س: ”عام طور پر کہا جاتا ہے ”ان“ کے دل میں میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کرتی ہیں؟“

ج: ”یہ تو پتا نہیں مگر یقین مانیے ہم ان کے دل میں تب سے بسے ہیں جب ہمیں کچھ بنانا نہیں آتا تھا مگر ان کی محبت نے ہمیں سب کچھ سکھا دیا۔“

س: ”لوگ آپ سے زیادہ تر کس چیز کی فرمائش کرتے ہیں، آپ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں؟“

ج: ”میرے شوہر اور بچوں کو مچھلی بہت زیادہ پسند ہے مگر وہ بھی صرف فرائی۔ تو اس کی کیا ریسپی بتاؤں۔“

س: ”آپ کے ہاتھ کی پہلی ڈش کھا کر گھر والوں نے کیا تبصرہ کیا؟“

ج: ”میں اپنی خالہ کے گاؤں گئی تھی۔ میری کزن فرینڈ ارشاد کی امی کہیں گئی ہوئی تھیں تو ان کے ابو ٹنڈے کی سبزی لے کر آئے اور کہا بنالو۔ تب ہم دونوں شاید چودہ سال کی تھیں ٹنڈے بنائے مگر روٹی بنانی نہیں آئی تو سوچا چاول بنالیں مگر یہ کیا چاول تو نظر نہیں آئے، کھچڑی بن گئی (ہاہاہا)۔ پھر بھی چاچا مسکرائے اور بولے۔ پہلی بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“

س: ”گھر والوں کی پسندیدہ ڈش جسے پکانا ناگوار گزرتا ہے؟“

ج: ”ہم سب کو گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے، مگر گاجر کو کاٹنا ناگوار لگتا ہے۔“

س: ”ایسے مہمان جن کی آمد ناگوار گزرتی ہے پھر ان کی تواضع کیسے کرتی ہیں؟“

ج: ”مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے جلدی جلدی کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔“

س: ”سسرال میں پہلی ڈش کیا بنائی؟“

ج: ”یار پھر وہی پرانی بے عزتی یاد کرادی۔ سسرال میں پہلی بار سوجی کا حلوہ بنایا تھا جو بری طرح جل گیا تھا۔ سب نے مذاق اڑایا مگر میرے شوہر نے تعریف کی۔ بھئی اچھا تو بنا ہے۔ اب تک ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ بھی مذاق اڑا رہے تھے یا مجھ سے ڈر رہے تھے۔“ ہاہاہاہا۔

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

انڈے کی کوٹنگ والا فرائی گوشت

اجزاء:۔

ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن کا جوا	ایک عدد
گوشت	آدھا کلو
ثابت سرخ مرچ	تین عدد
آلو	آدھا پاؤ
گاجر	آدھا پاؤ
تیل	سو گرام
سرکہ	تین ملی لیٹر
پیاز (کاٹ لیں)	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	آدھا پاؤ
انڈے (پھینٹ لیں)	دو عدد
ڈبل روٹی کا چورا	تیس گرام

ترکیب:۔

ادرک، لہسن اور مرچوں کو گرائنڈ کر کے باریک پیسٹ بنالیں۔ گوشت کو صاف کر کے دھولیں اور بوٹیاں بنالیں۔ آلوؤں اور گاجروں کا بھی بوٹیوں کے سائز میں کاٹ لیں۔

گوشت کو سرکہ، تیل کی نصف مقدار اور نمک میں ابال لیں۔ جب آدھا گل جائے تو اس میں کٹے ہوئے مسالے شامل کر کے مکمل گلنے تک پکائیں۔

1 3 سینٹی میٹر سلاخوں پر پیاز، آلو، گوشت، گاجر اور کچے ٹماٹرں کو پرودیں۔ سلاخوں میں پروئے ہوئے گوشت اور سبزیوں کو پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر ان پر ڈبل روٹی کا چورا چھڑک دیں اور گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔

لاہوری پائے چنا قورمہ

اجزاء:۔

بکرے کے پائے (ابال کر گلا لیں)	چھ عدد
سفید چنے (ابلے ہوئے)	آدھا پاؤ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	چار عدد
پسی دیگی مرچ	دو کھانے کے چمچے
لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	چوتھائی کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پسی جائفل، جاوتری	چوتھائی چائے کا چمچہ
پھول بادیان (پیس لیں)	ایک عدد
پھیکا کھویا	دو کھانے کے چمچے
گھی	ایک کپ

ترکیب:۔

ایک پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر لائٹ براؤن کر کے نکال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کرش کر لیں۔ پیاز نکالے ہوئے گھی میں ثابت گرم مسالا ڈال کر ادرک، لہسن ڈال دیں اور بھونیں۔ اس میں گلے ہوئے پائے اور ابلے ہوئے سفید چنے بھی شامل کر دیں اور مزید بھونیں۔ اس میں دہی، نمک، ہلدی، دیگی لال مرچ، دھنیا اور کرش کی ہوئی پیاز ڈال کر مزید بھونیں۔ جب تمام چیزیں یکجان ہو جائیں تو اس میں پسا گرم مسالا، پھول بادیان، جائفل جاوتری، کھویا ڈال کر مزید بیس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزے دار پائے چنا قورمہ تیار ہے۔ نان یا پراٹھوں کے ساتھ سرو کریں۔

بالائی کے سیخ کباب

اجزاء:۔

قیمہ (بغیر چکنائی اور پانی کے)	ایک کلو
گھی یا مکھن	چار سے پانچ کھانے کے چمچے
بالائی	آدھا کپ
کچا پپیتا یا بیکنگ پاؤڈر	تھوڑا سا
پسا گرم مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد (درمیانی)
ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
نمک	حسب ضرورت
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

مکھن اور کریم کو چھوڑ کر سارے اجزاء قیمے میں مکس کرلیں اور قیمہ گرائنڈ کرلیں کہ باریک ہوجائے۔ آخر میں مکھن اور کریم بھی شامل کرلیں۔ اچھی طرح قیمے کو مکس کرکے کچھ دیر کے لیے رکھ دیں۔ کباب بنانے سے پہلے ایک بار پھر قیمے کو مکس کریں اور سیخوں پر کباب بنا کر کوئلوں پر گرل کرلیں۔

اگر آپ گرل نہیں کرسکتیں تو کوئلے کا دم دے کر فرائی کرلیں۔

اسٹیم چنیوٹی ران

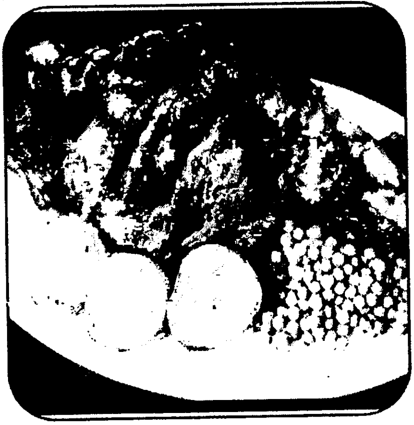

اجزاء:۔

ران	ڈیڑھ کلو
فروٹ ونگر	آدھا کپ
پپیتا	چار کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک	دو کھانے کے چمچے
چلی پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
لیموں	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
آلو بخارے	دو عدد
ہری مرچ پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
بڑی الائچی (پسی ہوئی)	چار عدد
دار چینی	دو اسٹک
تیل	آدھا کپ

ترکیب:۔

ران کو گود لیں پھر لہسن، ادرک، سرکہ، نمک، پپیتا لگا کر چار سے پانچ گھنٹے چھوڑ دیں اب گرم تیل میں ران کو فرائی کرلیں۔ اب ران ٹھنڈی کرکے دہی میں تمام مسالا آلو بخارے کا گودا مکس کرکے ران پر لگا کر دو گھنٹے چھوڑ دیں۔ اب دیگچی میں پانی ڈالیں، گرم کریں اس پر چھنی رکھ کر ران رکھیں اور ایک گھنٹے اسٹیم دیں۔ سلاد، نان یا رائس کے ساتھ سرو کریں۔ ہری پیاز سے سجادیں۔

صحت

مینوپاز...... ایک قدرتی عمل

مینوپاز ایک ایسا قدرتی عمل ہے جس میں خواتین کے مینسز مکمل طور پر بند ہوجاتے ہیں۔ اس کی نارمل عمر یا آئیڈیل ایج پچاس سال کے بعد ہوتی ہے۔ تاہم یہ کسی کو پہلے بھی ہوسکتا ہے۔

مینوپاز کا عمل لگ بھگ پینتیس برس سے شروع ہوجاتا جب رحم اسٹروجن کی پیداوار میں کمی کرنا شروع کردیتا ہے۔ جب تک اس کی عمر پینتالیس برس یا اس سے زیادہ ہوتی ہے تو سن یاس یا مینوپاز کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

کچھ خواتین میں مینوپاز کا عمل شروع ہونے سے پہلے جو مینسز ہوتے ہیں ان میں بلیڈنگ کا بہاؤ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور مینسز کے ٹائم پیریڈ میں بے قاعدگی آجاتی ہے۔ مہینے میں دو سے تین مرتبہ ہوسکتے ہیں۔ اس طرح سات دن کے بجائے دس دن تک رہتے ہیں۔

اس عمل میں چونکہ ہارمونل تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اکثر خواتین کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ انسولین کا سسٹم متاثر ہوسکتا اور ہڈیوں کی کمزوری کا عمل جسے آسٹیوپوروسس کہتے ہیں کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے جسم میں کیلشیم کی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے لڑکیوں کو بچپن سے ہی دودھ اور دودھ سے بنی غذائیں لینی چاہئیں تاکہ اس دور میں ہڈیوں کی کمزوری سے بچا جاسکے۔

اس عمل میں خواتین کا ذہنی دباؤ محسوس کرنا، ہاٹ فلشنز آنا یعنی اچانک گرمی لگنا خاص طور پر جسم میں خشکی کا محسوس ہونا۔ سر درد، چکر آنا، جوڑوں میں درد، کمر میں درد، یوریزی ٹریکٹ چینج کی وجہ سے کبھی بہت زیادہ پیشاب آتا ہے اور کبھی کم۔ یہ تمام علامات ہارمونز کے دسٹرب ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کا سب سے پر اثر علاج ہارمون ریپلیسمنٹ تھراپی (ایچ۔ آر۔ ٹی) یا ر ہارمونز تبدیل کرنا ہے۔ اس تھراپی کے زیر اثر رہنے سے عمر رسیدگی کا مرحلہ روکا جاسکتا ہے اور عورت جوان دکھائی بھی دے سکتی ہے اور خود کو جوان بھی محسوس کرسکتی ہے۔

مندرجہ ذیل نکات اس مرحلے میں رونما ہونے والی جسمانی اور نفسیاتی تبدیلیوں سے نپٹنے میں مدد کرسکتے ہیں۔

☆ جوڑوں کے درد، دل کے امراض اور صحت کے دیگر مسائل کا خطرہ کم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پھل اور سبزیاں اور کیلشیم سے بھرپور غذائیں کھائیں۔ جیسا کہ پھلیوں والی سبزیاں، سویابین کی مصنوعات۔ گہرے سبز رنگ والی سبزیاں، مچھلی اور ڈیری کی مصنوعات۔

☆ مناسب نیند لیں۔

☆ مینو پاز کی شدید علامات والی خواتین کو ایلوپیتھک ڈاکٹرز ہارمونز کی تبدیلی کا علاج تجویز کرتے ہیں جو کہ مزید پیچیدگی کو جنم دے سکتا ہے تاہم اس کا انحصار انفرادی کیسوں پر ہوتا ہے۔

مینوپاز ایک عورت کی زندگی میں ہونے والی عام اور قدرتی تبدیلی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک عارضی مرحلہ ہے جسے بیماری نہ سمجھا جائے۔ جیسے ہی ہارمونز کا "نیا" توازن قائم ہوجائے گا یہ مرحلہ ختم ہوجائے گا۔